زندگی کے ساتھ ساتھ

ماہنامہ

چہارسو

راولپنڈی

ABC CERTIFIED

زندگی کے ساتھ ساتھ

ماہنامہ

چہارسو

راولپنڈی

جلد۱۳، شمارہ ستمبر، اکتوبر ۲۰۰۴ء

مجلسِ ادارت

بانی مدیر اعلیٰ ———— سید ضمیر جعفری

مدیر مسئول ———— گلزار جاوید

مدیر معاون ———— بینا جاوید

مجلس مشاورت

محسن بھوپالی ☆☆☆ بیگم ثاقبہ رحیم الدین ☆☆☆ ڈاکٹر انور نسیم

قیمت

فی پرچہ	35روپے
چھ شمارے	150روپے
زرِ سالانہ	300روپے

بیرونِ ملک ہوائی ڈاک سے

امریکہ کینیڈا	40 ڈالر
برطانیہ	20 پونڈ
سعودی عرب	80 ریال
متحدہ عرب امارات	80 درہم
قطر	ایضاً
شارجہ	ایضاً

رابطہ: 537/D-1 ویسٹریج III راولپنڈی۔

فون 5462495 فیکس 4433619 موبائل: 0300-5176062

E-Mail:waqar's_oma@yahoo.com

پرنٹر: فیض الاسلام پرنٹنگ پریس ٹرنک بازار راولپنڈی

متاعِ چہارسُو

قرطاسِ اعزاز ....

سیلف پورٹریٹ.... مصطفیٰ ملک

مجھے دنیاں ڈھا دیا... ستیہ پال آنند

قبولیت......قاری نما

ایک مکتوب......احمد ہمیش

براہِ راست...... گلزار جاوید

اردو کا تہذیبی خواب... پروفیسر گوپی چند نارنگ

باطنی یک دگر......ڈاکٹر گیان چند جین

مرگِ چشمِ آگاہی......ڈاکٹر عبداللہ

لہو بولتا ہے......سید اختر سوز

جدیدیت اور اساطیر......ڈاکٹر فہیم اعظمی

آنند کا شعری تجربہ...... حقیق اللہ

افسانہ

باپ دادا کے گناہوں کی سزا.... ستیہ پال آنند

تقدیر کے تحرر...... شعیب حیدر زیدی

قلبِ سلیم

منظر ایوبی، غالب عرفان

سخنِ تازہ

احمد فراز، شوکت واسطی، عدیم ہاشمی، مشکور حسین یاد، ظفر اقبال، ناصر انصاری، شبنم شکیل، سرور انبالوی، شاہد واسطی، بھگوان داس اعجاز، قیصر نجفی، سیفی سرونجی، پہناں، خیال آفاقی، سلطان صبرواتی، غالب عرفان، سہیل غازی پوری، ذکیہ غزل، صدیقی شاہد، نصیر کوہاٹی، مختار ایاز، کشور زیدی، رب نواز مائل، علی آذر، اسلم راہی، شگفتہ نازلی، ملک زادہ جاوید، ضمیر نوری، تجمیت سنگھ حسرت، سجاد مرزا، فیصل عظیم، امتیاز دانش، محمد اسماعیل، شہاب صفدر، آصف مرزا۔

افسانے

پھول کھلے ہیں ابھی...... سلطان جمیل نسیم

آگے کیا ہوگا!؟......ذکی شفق

سانپ......شمشاد احمد

ادھوری کہانی......دیپک بدکی

کوہِ مقصود...... گلزار جاوید

نظمِ عصر

عبدالعزیز خالد، بلراج کومل، محمود سعیدی، رفعت سروش، یوگیندر بہل تشنہ، علیم صبا نویدی، قیصر نجفی، مناظر عاشق ہرگانوی، علی آذر، دل نواز دل، فیصل عظیم، یولس ماہر، عائشہ ثروت۔

آئینۂ فن

کتابِ عشق...... علیم صبا نویدی

تخلیقِ عصر

تازہ تخلیقات کا تعارف... عطیہ سکندر علی

رس رابطے

جستجو، ترتیب، تدوین...... اعجاز کھوکھر

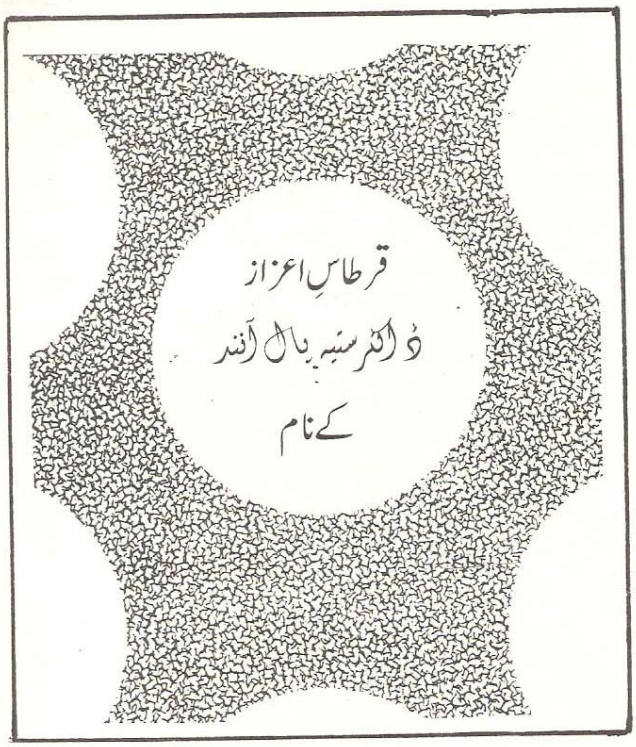

قرطاسِ اعزاز

ڈاکٹر ستیہ پال آنند

کے نام

سیلف پورٹریٹ

ستیہ پال آنند

۱۹۳۱ء پیدائش ۲۴ اپریل ۱۹۳۱ء موضع کوٹ سارنگ، تحصیل تلہ گنگ ضلع چکوال (پاکستان)

ولدیت رام رکھا آنند

ماں کا نام ودیاوتی، پنجابی شاعرہ، سکھ اسکالر ننھیال کی طرف سے سکھ۔ ددھیال کی طرف سے ہندو

قبیل آنند... وسیع تر "کھوکھر" قبیلے کی شاخ "ککھڑ ایں" کی ایک "ذات" ہیں۔

۱۹۳۱ تا ۱۹۳۴ء

☆ کوٹ سارنگ کے سرکاری اسکول میں پانچویں درجے تک تعلیم حاصل کی۔

۱۹۳۴ تا ۱۹۴۵ء

☆ نوشہرہ، ضلع پشاور کے ہائی اسکول میں تعلیم۔ مڈل کا امتحان صوبہ سرحد کے تعلیمی بورڈ کی سند کے ساتھ پاس کیا۔

☆ شعر گوئی کا آغاز۔ تیرہ برس کی عمر میں حب الوطنی پر پہلی نظم "سرحدی سماچار" دینک پشاور میں شائع ہوئی۔

۱۹۴۵ تا ۱۹۴۷ء

☆ امریکن مشن ہائی اسکول راولپنڈی میں میٹرک تک تعلیم۔

☆ منشی تلوک چند محروم (گورڈن کالج، راولپنڈی) کی شفقت پائی۔ ان کی مشفقانہ رائے تھی کہ "تمہاری طبیعت نظم کے لیے زیادہ موزوں ہے نظمیں لکھا کرو۔ غزل کہنا تو پیشہ ور گلا باز شاعروں کا کام ہے"

☆ افسانہ نگاری کا آغاز... نظمیں اور افسانے لاہور سے شائع ہونے والے اوسط درجے کے رسائل "لطف شباب" "سرت فکر" "مستانہ جوگی" وغیرہ میں شامل اشاعت ہوئے۔

☆ ۱۹۴۷ء مارچ۔ میٹرک کا امتحان مشن ہائی اسکول، راولپنڈی پنجاب یونیورسٹی لاہور سے پاس کیا۔

۱۹۴۷ تا ۱۹۵۴ء

☆ ۱۹۴۷ء اگست میں راولپنڈی سے لدھیانہ (مشرقی پنجاب) کو ہجرت۔

☆ ۱۹۴۷ء والد کا انتقال۔

☆ چھوٹی موٹی نوکریاں۔ افسانہ نگاری کا ایک کل وقتی پیشہ۔ ان برسوں میں ایک سو کے لگ بھگ افسانے لکھے۔ "بیسویں صدی" "شمع" سے خاطر خواہ معاوضے پر انحصار Ghost writing میں جاسوسی ناول لکھے۔

☆ تعلیم رک رک کر جاری۔ ۱۹۵۱ء ادیب فاضل (آنرز ان اردو)

☆ ۱۹۵۲ء انٹرمیڈیٹ ۱۹۵۴ء اور بی اے آنرز ان فلاسفی پنجاب یونیورسٹی سولن۔

☆ ۱۹۵۴ء پہلا شعری مجموعہ "جاڑے" شائع ہوا۔

☆ ۱۹۵۴ء پہلا افسانوی مجموعہ "جینے کے لیے" شائع ہوا۔

☆ ۱۹۵۴ء پہلا ناول "عشق، موت اور زندگی" شائع ہوا۔

☆ اس دوران میں ہندی کی طرف مراجعت۔ کئی افسانے ہندی رسائل میں پہلے شائع ہوئے۔ ہندی میں معاوضے کی شرح اردو سے کئی گنا زیادہ ہوا کرتی تھی۔

۱۹۵۴ تا ۱۹۶۰ء

☆ ۱۹۵۴ء میں ہندی پنجابی اشاعتی ادارہ "ساہتیہ سنگم" سے وابستگی۔

☆ دلی سے چھپنے والے ماہنامہ "راہی" (مدیر بلدیو مرزنگی) کے ساتھ معاون مدیر کے طور پر ادبی اور تجارتی انسلاک۔ اس حیثیت سے وسیع تر پیمانے پر ہندو پاک کے اہل قلم کے ساتھ رابطہ۔

☆ ۱۹۵۶ء افسانوی مجموعہ "اپنے مرکز کی طرف" شائع ہوا۔

☆ ۱۹۵۶ء ناول "آہٹ" شمع دہلی کے اشاعتی ادارے سے شائع ہوا۔

☆ ۱۹۵۷ء ہندی ناول "چوک گھنٹہ گھر" شائع ہوا جسے پنجاب کی حکومت نے قابل اعتراض تحریر کے طور پر ضبط کر لیا۔ مصنف کے خلاف عدالتی چارہ جوئی...... بعد میں ضبطی کا حکم واپس لیا گیا۔

☆ ۱۹۸۶ء فلسفے میں دوسری ڈاکٹریٹ، ٹرائی یونیورسٹی (امریکا)

☆ پراجیکٹ کے کام کے دوران اردو کی طرف شدومد سے واپس آئے اور افسانہ نگاری کے علاوہ ایک بار پھر اردو نظم کی طرف متوجہ ہوئے۔

☆ ۱۹۸۸ء امریکہ منتقل ہوئے۔

۱۹۸۸ تا حال

☆ ۱۹۸۸ تا ۱۹۹۲ء ساؤتھ ایسٹرن یونیورسٹی واشنگٹن ڈی سی میں درس و تدریس۔

☆ ۱۹۹۰ء افسانوی مجموعہ "اپنی اپنی زنجیر" شائع ہوا۔

☆ ۱۹۹۱ء پراجیکٹ کے سلسلے میں تحریر کردہ یکصد نظموں کا مجموعہ "دست برگ" شائع ہوا۔

☆ ۱۹۹۱ء ہندی میں ضبط شدہ ناول "چوک گھنٹہ گھر" (۱۹۵۷ء) کا ترجمہ شدہ اردو روپ "شہر کا ایک دن" شائع ہوا۔

☆ ۱۹۹۲ء افسانوی مجموعہ "پتھر کی صلیب" شائع ہوا۔

☆ ۱۹۹۲ء دو برس کی تقرری پر سعودی عرب کے محکمہ مواصلات کے ٹریننگ کالج الریاض میں بطور انگلش پروفیسر۔

☆ ۱۹۹۳ء شعری مجموعہ "وقت لاوقت" شائع ہوا۔

☆ ۱۹۹۵ء۔ واپس امریکہ آنے پر یونیورسٹی آف ڈسٹرکٹ آف کولمبیا میں تقرری۔ تا حال وہیں درس و تدریس جاری ہے۔
☆ ۱۹۹۵ء۔ "آنے والی سحر بند کھڑکی ہے" شعری مجموعہ لاہور سے شائع ہوا۔
☆ ۱۹۹۷ء۔ شعری مجموعہ "کیوں لا ہے" شائع ہوا۔
☆ ۱۹۹۹ء۔ شعری مجموعہ "مستقبل آنکھے ل" شائع ہوا۔
☆ ۲۰۰۰ء۔ "مستقبل آنکھے ل" پر احمد ولا عالمی ایوارڈ اور پانچ ہزار ڈالر اور شیلڈ۔
☆ ۲۰۰۱ء۔ شعری مجموعہ "آخری چٹان تک" شائع ہوا۔
☆ ۲۰۰۱ء۔ انگریزی میں امریکی عظیم پوئٹری سلیکشن The Best American Poems of Twentieth Century میں نظم بعنوان Lamentations on Mother Earth شامل ہوئی۔ ہندوستانی نژاد کسی بھی انگریزی شاعر کے لئے یہ ایک بڑا اعزاز۔
☆ اردو نظموں کے انگریزی تراجم کتابی شکل میں شائع ہوئے۔
☆ Figures of Fantasy. New York 1982
☆ Good bye India and other poems New York.1988
☆ A promise kept. Calcutta:1997
☆ دیگر شعراء کی اردو نظموں کے انگریزی تراجم کتابی شکل میں شائع ہوئے۔
☆ Dreams lost in water. Lahore. 1993
(Naseer Ahmed Nasir's poems)
☆ Poems mild and mellow. Lahore. 1997.
(Wazir Agha's Poems)
☆ ۱۹۵۷ء۔ نومبر ۲۳۔ شادی۔ اہلیہ پرملا آنند۔
☆ ۱۹۵۸ء۔ پہلے بیٹے پرمود کی پیدائش۔ بزرگ شاعر پنڈت میلا رام وفا نے ریاض تخلص تجویز کیا۔
☆ ۱۹۶۰ء۔ پنجاب یونیورسٹی سے منسلک گورنمنٹ کالج لدھیانہ سے ایم اے انگریزی پاس کیا۔
☆ ۱۹۶۰ء۔ بیٹی ڈیزی کی پیدائش۔
☆ ۱۹۶۰ء۔ چندی گڑھ منتقل ہوئے۔
☆ ۱۹۵۴ء سے ۱۹۶۰ء تک ہندی میں چھ کتابیں شائع ہوئیں۔

۱۹۶۰ تا ۱۹۷۲ء

☆ ۱۹۶۰ء۔ ڈی اے وی کالج، چندی گڑھ میں بطور لیکچرار ان انگلش تقرری۔
☆ ۱۹۶۱ء۔ پنجاب یونیورسٹی چندی گڑھ کے پوسٹ گریجویٹ ڈیپارٹمنٹ آف انگلش میں تقرری۔

☆ ۱۹۶۴ء میں تو ملہ کے لیے سینٹرل انسٹی ٹیوٹ آف انگلش اینڈ فارن لینگویجز حیدرآباد دکن میں ایک تربیتی کورس پاس کیا۔ حیدرآباد کے ادبی حلقوں سے ذاتی شناسائی۔
☆ ۱۹۶۴ء۔ افسانوی مجموعہ "دل کی کشتی" کی اشاعت۔
☆ ۱۹۶۴ء۔ دوسرے بیٹے سچن کی پیدائش۔
☆ ۱۹۶۷ء۔ لیکچرر سے ریڈر کے طور پر ترقی۔
☆ ۱۹۶۷ء۔ ڈاکٹریٹ کی سند حاصل کی۔ تھیسس کا موضوع تھا۔
"Changing concept of the nature of reality and literary techniques of expression.
☆ ۱۹۶۷ء۔ ہندی میں اکیاون افسانوں کا انتخاب "پچاس اور ایک" شائع ہوا۔
☆ تعلیم، تدریس اور تحقیق کے زمرے میں تیس سے اوپر ریسرچ پیپر انگریزی ادب کے عالمی جرائد میں شامل اشاعت ہوئے۔
☆ دلی، بمبئی، بنگلور، مدراس، کلکتہ وغیرہ یونیورسٹیوں میں سیمناروں میں شرکت۔

۱۹۷۲ تا ۱۹۸۸ء

☆ ویلز یونیورسٹی آف کیمبرج (انگلینڈ) میں بطور وزیٹنگ اسکالر۔ دو برس قیام۔
☆ اردو سے ہندی اور انگریزی میں پوری طرح مراجعت۔
☆ چندی گڑھ ساہتیہ اکادمی کے نائب صدر (۱۹۷۱ تا ۱۹۷۴ء)
☆ آل انڈیا انگلش ٹیچرز کانفرنس کے صدر ۱۹۷۷ء
☆ نہرو فیلوشپ ایوارڈ۔ "Promises to keep" کتاب جواہر لال نہرو کی زندگی اور کام پر تھی۔ ۱۹۷۳ء میں پنجاب یونیورسٹی پبلیکیشنز چندی گڑھ سے شائع ہوئی۔
☆ وزیٹنگ پروفیسر ۱۹۷۸ء۔ برٹش کولمبیا یونیورسٹی وینکوور کینیڈا۔ ۱۹۸۰۔ ویلز یونیورسٹی آف کیمبرج انگلینڈ۔
☆ ڈائریکٹر کارسپانڈنس کورسز۔ پنجاب یونیورسٹی کے طور پر تقرری۔ ۱۹۸۲ء
☆ ریڈر سے پروفیسر کے طور پر ترقی۔ ۱۹۸۲ تا ۱۹۸۴ء
☆ ۱۹۸۵ تا ۱۹۸۷ء۔ عالمی سطح پر World poetry project کے تحت جنوبی ایشیا کی شاعری (ہندی، اردو، بنگالی) پر ساؤتھ ایسٹرن یونیورسٹی واشنگٹن ڈی سی میں ریسرچ۔ پراجیکٹ کا کام ۱۹۸۷ء میں مکمل ہوا اور رپورٹ اسی برس چھپی۔
☆ ۱۹۹۲ تا ۱۹۹۴ء تک سعودی عرب میں بطور پروفیسر ان انگلش تقرری۔
☆ ۱۹۹۴ء سے تا حال یونیورسٹی آف دی ڈسٹرکٹ آف کولمبیا (UDC) واشنگٹن ڈی سی میں بطور پروفیسر تقرری۔

کتھے ونجاں ڈاڈھیا ربا

ڈاکٹر ستیہ پال آنند

مصنف کی یہ تقریر جو اردو ہندی اور پنجابی کے کل عالم احباب و طلبا کی طرف سے مصنف کے ساتھ یوم منایا گیا ہے "شخصی کی پہلی حدود" (سائنس کی ... تقریب) کے موقع پر پنجاب یونیورسٹی چندی گڑھ میں ۱۹۹۱ء میں کی گئی۔

دوستو اور عزیز طلبا!

ایک شاعر نظم کیوں لکھتا ہے، کب لکھتا ہے اور کیسے لکھتا ہے؟ اس کا گمان تو مجھ جیسے ہزاروں لوگ پیدا کر چکے ہیں۔ میں بھی اپنے تدریسی پیشے کے حوالے سے ان سوالوں کے جواب کمرہ جماعت میں یا بحث مباحثے کی محفلوں میں دینے کی کوشش کرتا رہا ہوں۔ آج کی اس تقریر میں مجھے اس سے کوئی سروکار نہیں ہوگا کہ ارسطو نے شعر گوئی کے فن کے بارے میں کیا کہا اور دور حاضر میں ٹی ایس ایلیٹ نے کیا کہا ہے۔ میں تو صرف اپنے بارے میں جانتا ہوں اور اپنی بات سلیس زبان میں کہنے کی کوشش کروں گا۔ اس لئے بھی کہ حاضرین میں کچھ اساتذہ کے علاوہ طلبا اور دیگر کرم فرما ایسے بھی ہیں جو اردو نہیں جانتے۔

تو آیئے، چھ برس کی عمر کے ایک شاعر سے ملنے کا شرف حاصل کیجئے۔ اس بچے کو خود علم نہیں ہے کہ وہ شاعر ہے۔ اپنے گاؤں کے اسکول میں وہ ابھی ابھی اردو لپی سے آشنا ہوا ہے۔ اس کی مادری زبان پنجابی کا وہ مکھر روپ ہے جسے پنجاب کے شمال مغربی اضلاع میں دھنی پوٹھوہاری زبان کہا جاتا ہے۔ ظاہر ہے کہ اسے گھر میں، گاؤں کی گلیوں میں یا اسکول میں اردو بولنے کا موقع نہیں فراہم کیا گیا، اس لئے اگر وہ اپنا پہلا شعر موزوں کرے گا تو اسی بولی میں کرے گا جو وہ روز بولتا ہے۔ یعنی وہی زبان جو ماں کے دودھ کی شیرینی کے ساتھ اس کے حلق سے اتری ہے اور اب اس کے حلق سے ادا ہوگی۔

میں کوشش کر رہا ہوں کہ ایک چھوٹے سے واقعے کے توسط سے آپ کو ان تین سوالوں "یعنی" کب، کیوں اور کیسے" میں سے پہلے دو کا جواب فراہم کروں۔ اب تک آپ سمجھ ہی گئے ہوں گے کہ یہ چھ برس کا بچہ میں خود ہوں۔ گاؤں میں ہمارے گھر کے آس پڑوس میں دو گھر اور تھے۔ جن میں مجھ سے کچھ بڑے دو لڑکے تھے۔ ان کی عادت مجھ سے ہر وہ چیز چھیننے کی تھی جو میں ہاتھ میں لئے ہوئے گھر سے نکلتا۔ دس برس کا ایک سیاہ بھجنگ سا لمبا تڑنگا لڑکا تھا، جسے اس کے رنگ کی مناسبت سے "کالو" کہتے تھے۔ دوسرے کے چہرے پر برص کے داغ تھے۔ جس کی وجہ سے اس کا نام "ڈبا" پڑ گیا تھا۔

دن مہینے اور مہورت تو مجھے یاد نہیں لیکن یہ یاد ہے کہ میری ماں نے مجھے بڑی مشکل سے ایک بہت خوبصورت گلی ڈنڈا منوا کر دیا تھا۔ جسے یہ دونوں لڑکے چھیننے کے درپے تھے۔ میں باہر نکلا تو میں نے دیکھا کہ ان میں سے کالو اپنے دروازے کی اوٹ میں اور ڈبا باہر گلی میں بظاہر میری آمد سے بیگانہ کھڑا تھا۔ میں نے دو تین بار ان سے بچ کر نکلنے کی کوشش کی۔ ہر بار ناکام ہونے کے بعد میں نے گھر کے اندر جا کر خود سے دس برس بڑی اپنی بہن کے سامنے گلی ڈنڈا پھینک دیئے اور رو رو کر کہا۔

کتھے ونجاں ڈاڈھیا ربا
اندر کالو باہر ڈبا

میری بہن ہنس پڑی، بولی "توں تاں ست پایا! اک بیت بنا لیا ای!"

اس بات سے قطع نظر کہ یہ ہمارے گاؤں کی زبان میں از خود ایک بیت تھا۔ میں گلی ڈنڈے سے کھیل بھول کر چھت پر چڑھ گیا اور کنکوے اڑانے لگا۔

بیت کیا ہوتا ہے مجھے یہ خبر نہیں تھی۔ اور یہ بات بھی قابل تذکرہ واقعی ہے کہ اس کے بعد میں نے باقاعدگی سے اسکول یا گھر کے ہر واقعے اور ہر شخص کے بارے میں بیت موزوں کرنے شروع کر دیئے۔ لیکن یہ بات بہ تکلف تذکرہ ہے کہ میں نے اپنا پہلا بیت کب اور کیوں موزوں کیا۔

ان دو استفہامیہ الفاظ کی ماہیت پر غور کریں تو دونوں کا ایک ہی جواب ممکن ہے۔ ظاہر ہے کہ کالو اور ڈبا نے مجھے بے حد ذہنی کوفت پہنچائی۔ یعنی گلی میں اپنے ہم عمر لڑکوں کے ساتھ میرا کھیلنا حرام کر دیا۔ اب سوچتا ہوں کہ اگر مجھ میں بیت موزوں کرنے کی خدا داد قابلیت نہ ہوتی، تو شاید میں انہیں گالیاں بکتا۔ پتھر اٹھا کر مارتا اور پھر کھول کے اس عمل میں خود بھی لہولہان ہو جاتا۔ یا پھر چپ اور ڈرپوک ہونے کی وجہ سے خود سے دس برس بڑی اپنی بہن کے سامنے جا کر فریاد کرتا، اپنی شکست کا اعتراف کرتا اور شکایت کرتا۔ اور وہ ان دو لڑکوں کی ماؤں سے لڑنے جھگڑنے کے لئے گھر سے نکل پڑتی۔ لیکن میں نے صرف یہ کیا کہ چار ہم وزن الفاظ پر مشتمل پہلا مصرع اور پھر اسی طرح چار ہم وزن الفاظ پر مشتمل دوسرا مصرع یعنی دو مصرعے اس چابکدستی اور مہارت سے ادا کئے کہ آخری دو الفاظ مقفی بھی ہو گئے اور میری بے چارگی اور بے بسی کا نقشہ بھی کھنچ گیا۔

آج جب اس بیت پر غور کرتا ہوں تو مجھے اس میں وہ چاروں گُن نظر آتے ہیں، جنہیں سنسکرت شعریات میں ادبیہ بھاشا (ناٹک کی زبان) کی شعری ضروریات کی ایک شرط مانا گیا ہے۔ یعنی جگہ کا تعین، وقت کا تعین، جذبے کا تعین اور مقصد (منشا) کا تعین۔ "اندر" "باہر" "کتھے" (کہاں) "ونجاں" (جاؤں) سے جگہ اور وقت دونوں متعین ہوتے ہیں۔ "ربا" (یا رب!) اور خدا کی صفات میں سے "ڈاڈھیا" (اقوی یا قہار یا جابر) جیسا ایجاب احتجاج کے

مقصد یا منشا کا تعین کرتے ہیں۔ پورا بیت آسان ترین ڈکشن (چار الفاظ چاروں "مفعلن فعلن" کے ہم وزن) میں ذہنی کوفت، بےبسی اور بےچارگی کی کیفیت کا آئینہ دار ہے جس سے جذبے کی تصویر کشی ہوتی ہے۔

تو آیئے اب اس شعر کے نزول کی ماہیت پر غور کریں۔ ظاہر ہے کہ زندگی کی گوناگوں رنگینیوں میں چھ برس کے ایک کھلنڈرے لڑکے کے لئے یہ ایک Traumatic Moment ہے؛ ایک ایسا لمحہ جو اس کے دل و دماغ پر کاری ضرب لگاتا ہے۔ اس ڈرامے میں وہ یونانی ٹریجڈی کے اس Protagonist کی طرح شامل ہے؛ جس کے پاس نہ جائے رفتن ہے نہ پائے ماندن۔ لگاتار کئی دنوں تک وہ ولن اس کی زندگی دوبھر کرتے رہے ہیں پھر وہ لمحہ معرض وجود میں آتا ہے؛ جب وہ بے دست و پا اور مکمل ہونے کی آخری حد تک پہنچ جاتا ہے۔ اس کے بعد یا تو اس کے سامنے شکستِ ذات یا دوسرے لفظوں میں شکستِ انا ہے؛ یعنی ہتھیار ڈالنے کا وقت ہے یا سر کی بازی لگا کر یعنی ٹکر کھا کر گرنے کا امکان ہے۔ اور ان دونوں سے سوا اگر کوئی چارہ ہے تو وہ تخلیقی قوت کی کارگزاری کا وہ Catalytic Agent ہے؛ جسے میں اکثر "شعری واگذاری" کا نام دیتا ہوں۔ اس بیت سے جہاں ہتھیار ڈالنے یا ٹکر کھا کر شہید ہو جانے کے بیچ کی حالت میں دونوں کیفیتوں کے امتزاج کا تاثر اور اس تاثر سے پیدا شدہ جمالیاتی لطف ہے؛ وہاں کتھارسس Catharsis کی وہ کیفیت بھی ہے جسے ایک انگریز شاعر نے کچھ اس طرح کے الفاظ All passion spent all fret and fever gone یعنی یہ شعر موزوں ہوتے ہی جذبے، جوش، شوریدہ سری اور حصول مقصد میں ناکامی سے پیدا شدہ غیظ و غضب کا بخار کسی حد تک کم ہو گیا اور بچہ باز اپنی معمول کی ذہنی کیفیت کے دوبارہ حصول میں کامیاب ہو گیا۔

لیکن یہ تو ایک بے حد بچکانہ سی آسان بات ہوئی کہ اگر شاعر کسی شخص سے ناراض ہوا تو چھوٹتے ہی کہا "اے خچے! لائیو تو میر اقلمدان میں اس کم بخت کی خبر لوں!" اور پھر ایک ہجو لکھ کر اپنا غصہ ٹھنڈا کر لیا۔ یعنی ذہنی احتجاج یا احتجاج یا ہیجان سے چھٹکارا پانے کے لئے شعر موزوں کرنا ایک طبی نسخہ بن کر رہ گیا ہے۔

اپنے وقتوں میں ارسطو نے کتھارسس کے نظریے کا اطلاق یونانی ڈراموں کے دیکھنے والوں پر کیا تھا۔ اور یہ درست بھی تھا لیکن شیکسپیئر تک پہنچتے پہنچتے اس بات کو سمجھا جانے لگا تھا کہ اس تھیوری کا اطلاق نہ صرف ڈرامہ دیکھنے والے حاضرین پر تو یقیناً کیا ہی جا سکتا ہے۔ ڈرامہ لکھنے والے یا شعر موزوں کرنے والے صاحب قلم پر بھی کیا جا سکتا ہے۔ قول مذکر حالت میں بقول ارسطو (جو افلاطون کے اعتراضات کا جواب دے رہا تھا) یہ ایک سماجی فرض کی ادائیگی کرتا ہے لیکن دوسری حالت میں اسے ایک نفسیاتی جھمیلے سے بچنے کے لئے بھی استعمال میں لایا جا سکتا ہے۔ (ملاحظہ ہو۔ شیکسپیئر کے Hamlet کا کردار اور اس کی نفسیاتی تفسیر) تو یہ طے ہوا کہ خود اداری طور پر ایک طے شدہ

پلان کے تحت؛ تو شاید شاعر کا جو لکھا ایک میکانکی عمل ہو؛ لیکن 'کالونورڈ' کے خلاف خدائے قہار و جبار کے حضور میں فریاد "آورد" کی نہیں؛ بلکہ "آمد" کی بہترین مثال ہے۔

تو یہ تو طے ہوا کہ کب اور کیوں کے استفہامیہ الفاظ کے جواب میں یہ تفصیل بالکل کافی نہیں ہے؛ یعنی کی سرحد کلنے کے قریب پہنچتی ہے۔ بہر حال اس سوال کے کچھ اور پہلو بھی ہیں؛ جو کچھ آگے چل کر زیر بحث آئیں گے۔

اب آئیں اپنے بنیادی سوال کے تیسرے پہلو کی طرف یعنی ہر شخص شعر کیوں نہیں کہہ سکتا؛ اور جو شخص کہتا ہے؛ وہ کیسے کہتا ہے؛ بہت برس ہوئے انگریزی شاعر Rwgilder کی کچھ سطریں پڑھی تھیں؛ جو سادہ اور سلیس سکالے کی زبان میں تھیں؛ اس لئے حافظے میں سلامت رہ گئی تھیں۔ اب ساٹھ برس کی عمر میں بازیچے کے عمل میں کچھ مٹی ہی لگتی ہیں اور لگتا ہے؛ جیسے شاعر نے Over simplification سے کام لیا ہے۔ بہر حال آپ کے گوش گزار کرتا ہوں۔

"Give me a theme,"
The little poet cried,
"And I will do my part".
'T is not a theme you need,
The world replied,
"You need a heart!"

یعنی دنیا کا جواب یہ تھا کہ اے ننھے شاعر! تمہیں شعر لکھنے کے لئے ایک موضوع یا مضمون کی ضرورت نہیں ہے "دل" کی ضرورت ہے۔ یاد آیا کہ ننھے شاعر کے لئے شاعری کے نزول کے طلسمی نسخے یعنی "دل" کے تناظر میں اٹھارویں صدی کے انگریزی شاعر الیگزنڈر پوپ کا یہ شعر بھی پڑھا تھا۔

"As yet a child, Nor yet a foal to fame I
lisp'd in numbers, for the numbers came."

ننھے شاعر تک تو یہ بات درست ہے۔ سب سے شعر کہنے کے لئے واقعی "دل" کی یعنی قلبی، محسوساتی، جبلی، وجدانی سطحوں پر طرب و نشاط یا یاس و کرب کے اس Catalytic agent کی ضرورت ہے؛ جو اسے شعر کہنے کے لئے ایک حاملہ لمحے میں بالکل ہی مجبور کر دے اور اگر اس کو شعر موزوں کرنے؛ یعنی باوزن الفاظ میں ڈھالنے کی ودیعت قدرت نے مہیا کی ہے تو سونے پر سہاگہ ہو جاتا ہے۔ میں نے عرض کیا کہ ننھے شاعر تک یہ بات درست ہے؛ لیکن اگر آپ یہ کہیں کہ کچھ شاعر بالغ ہو جانے پر بھی دل کے بچے ہوتے ہیں؛ اور ان پر یہ بات کا اثر ذہنی استبداد کی اس سطح پر رونما ہوتا ہے؛ جس کا ذکر میں پہلے کر چکا ہوں تو وہ کس قسم کے شاعر ہوتے ہیں؟ آپ فوراً جواب دیں گے۔ بچکانہ ہی نہیں؛ بچکانہ نہیں۔ رومانی یعنی شبلی، اختر شیرانی، مجاز، ساحر لدھیانوی اور حبیب جالب کی

تخیل کے شاعر جن کے پاس دنیا کے ہر سکے حتیٰ کہ اشتراکی انقلاب کے تصور تک کو دیکھنے کے لئے ایک رومانوی عینک موجود ہے۔ یہ شاعر بھی یقیناً اچھے شاعر ہیں۔ ان میں سے کچھ 'بڑے' شاعر بھی ہو سکتے ہیں جن کی شاعری تا دیر زندہ رہتی ہے لیکن ان میں سے کچھ اس قدر Myopic ہوتے ہیں کہ انہیں رومانی عینک کو ہمیشہ لگائے رکھنا پڑتا ہے۔ وہ یا تو ولیم موریس کے قول کے مطابق "The idle singer of an empty day" ہوتے ہیں یا طرب و یاس کی فراوانی انہیں شیلی کے قول کے مطابق ایک بلبل تصور کرا دیتی ہے۔

"A poet is a nightingale who sits in darkness and sings to cheer its own solitude with sweet sounds."

تو ہم اب اس نتیجے پر پہنچے ہیں کہ دل کی شاعری بنیادی طور پر بلبل کے نغمے کی سی میٹھی اور خوبصورت ہے۔ اس میں من موہ لینے کی قدرت ہوتی ہے۔ آنکھوں میں آنسو لا سکتی ہے۔ روتوں کو ہنسا سکتی ہے اور ہنسوں کو رلا سکتی ہے۔ اس میں بچے کی معصوم آنکھوں کی ہنسی، محبوبہ کے رخساروں کی سرخی اور ہونٹوں کی حلاوت، ماں کی ممتا کے نغموں سے لبریز لوری، حب الوطنی کے جذبے سے سرشار، کفن باندھ کر سرفروشوں کا سا جان نثار کر دینے کا عزم، بلند حوصلوں کی فولادی سینے کی جرات، انقلاب کے خوش آئند تصور پر بنی امید و حوصلے کی کیفیت بدرجۂ اتم موجود ہے۔

لیکن دوستو اور عزیزو! کیا یہ شاعری بچپن کی یا شروع جوانی کی شاعری نہیں ہے؟ کیا یہ عمر کے اس حصے سے تعلق نہیں رکھتی، جسے انگریزی میں Adolascence کہتے ہیں؟ یعنی عالم شباب یا نو عمری کی ولولہ انگیز بلوغت؟ جب شروع جوانی میں شعور و ادراک اور وضع احتیاط کی جگہ جوش و ولولہ، اولوالعزمی، محبوبہ کے لئے (یا انقلاب کے لئے) تارے توڑ لانا، نوچنے کا عزم، حکومت یا سماج کے خلاف بغاوت، شورش، خشونت کے جذبات، تہور اور شجاعت، تیغ زنی اور بے فکری ذہن کا محاصرہ کر لیتے ہیں۔

کسی زبان کے شعری ادب میں اس قماش کی شاعری بھی ایک اہم مقام رکھتی ہے اور دل خروش چاہتے ہوئے بھی اس پر خط تنسیخ نہیں کھینچ سکتے۔ میں اس بات کا اقرار کرتا ہوں کہ مجھ پر بھی وہ وقت آیا، جب تقسیم وطن سے پہلے حب الوطنی کا جذبہ اور آزادی وطن کے بعد دنیا کے گیسو سنوارنے کا عزم ایک سیلاب بن کر ابھرا اور "بے خطر کود پڑا آتش نمرود میں عشق" کے مصداق میں نے بھی اس عزم کے کس بل اپنی شاعری، ناول نویسی اور افسانہ نگاری میں نکالے۔ حکومت وقت کے غیظ کا شکار بھی ہوا۔ ہندی میں ایک ناول کو قابل اعتراض گردان کر اس پر پابندی عائد کر دی گئی۔ ہائی اسکول کے دنوں میں جوش کی "کمپنی کے سوداگروں سے" گانے کا شوق تھا تو سترہ اٹھارہ برس کی عمر تک پہنچتے پہنچتے مجاز کی آواز کے ساتھ آواز ملاتے ہوئے "جی میں آتا ہے یہ مردہ چاند تارے نوچ لوں" گانے کا مزہ آنے لگا۔ سٹالن کے ایما پر جب عالمی امن تحریک کو اردو شاعروں نے نعرہ بازی کی سطح پر رواج دیا تو ساحر لدھیانوی کی "پرچھائیاں" بہت اچھی لگی۔ لیکن اس وقت تک یعنی ۱۹۵۶ء کے لگ بھگ عالمی ادب کے وسیع مطالعے نے روشن طبع کا چراغ روشن کر دیا تھا۔ میں ایم اے انگریزی کے کورس کے لئے بی اے کے بعد پانچ چھ برس کے وقفہ کے باوجود یونیورسٹی میں داخل ہو گیا تھا۔ بارک جی اور وکنز نے سنجیدگی سے "آخر بھی" تک پہنچنے کی اصابت فراہم کی تو ایک دن مجھ پر ایک عجب انکشاف ہوا۔

جب ایک دن اپنے نئے مجموعے (چھبیس پچیس برس کی عمر تک اردو اور ہندی میں میری چھ کتابیں چھپ چکی تھیں) کا مسودہ ترتیب دیتے ہوئے میں نے اپنے گذشتہ دو برسوں کی تخلیقات کا جائزہ لیا تو یہ محسوس ہوا کہ یا تو ان دو برسوں کے دوران میں بالکل نافہم اور بے بصیرت ہو گیا تھا، یا صاحب الرائے ہونے کی حد تک میرے ہوش و حواس میں توازن کی کیفیت پیدا ہو گئی تھی۔ یعنی اپنی آمد کا اعلان کئے بغیر میری نثری اور منظوم تخلیقات میں وہ چیز در آئی تھی، جسے ایک مختلف تناظر میں ڈاکٹر جانسن نے "سنجیدگی اور عقلیت" کہا ہے۔ یعنی پانچ برس پہلے کی تحریر کردہ جو یہ سطریں تھیں (نظم کا عنوان "سرخ انقلاب" تھا) وہ اب ایک کھلا تضاد اور ناپختہ عقل کی ذہنی پراگندگی کا نمونہ لگ رہی تھیں۔

گرو یہ سر پھٹے پانیوں کی تند رو دیں
صفوں کو چیر دیں، منہ موڑ دیں
گرداب کے منہ زور گھوڑوں کا
یہ طوفانی ہوائیں اور تھوڑی دیر میں
دم توڑتے سانپوں سی تڑپیں گی
کہی ہے حوصلوں کا، کبھی دم خم ہے بچھایا تو!
بہت دن سہہ لیا، اب اور سہا جو تو دھوکا ہے!

(۱۹۵۲ء)

اس بات کے باوجود کہ انجمری کی سطح پر مجھے "پانیوں کی تند ہوائیں" "گرداب کے منہ زور گھوڑے" "دم توڑتے سانپوں سی طوفانی ہوائیں" بے حد پسند تھے، میں نے محسوس کیا کہ یہ ساری بات صرف Rhetoric کی ہے اور یونانی فلسفی Dimitrius کے قول کے مطابق "شاعرانہ تقریر" تو ہے "شاعری" نہیں ہے۔ یعنی مجھے آگاہ کئے بغیر ۱۹۵۵ء سے ۱۹۵۷ء تک نہ معلوم کن صعوبتوں سے گزر کر میری عقل سلیم نے مجھے اصابت، سنجیدگی اور وسیع النظری کی سطحوں پر وہ مناسب ذوق مہیا کر دی تھی۔ جس سے اگر "بہت دن سہہ لیا، اور اب سہا جو تو دھوکا ہے" کا جذبہ ایک شعری نگارش میں پیش کرنے کی ضرورت بھی محسوس ہوتی، تو میں اسے ایک مختلف "بوطیقی بصیرت" اور "ژرف نگاہی" سے پیش کرتا۔

اس لئے جب ایک دن مجھ پر یہ راز آشکار ہوا کہ میں وہ نہیں ہوں کہ جو تھا تو ایک نظم لکھی گئی جس کی آخری سطریں تھیں۔

اپنی سرگرمِ صفت حرکتِ وحدت سے مجھے
اس کا احساس ہے کہ میں آج نہیں جو کل تھا
اک نیا شخص نئی شخصیت کردار نیا
آج کا سچ اپنا لیا تنزوی نام مگر
مختلف ماضی و مطلق سے نیا اس کل سے جسے
ایک مستقبل امکاں میں لے ملتا ہے

(۱۹۵۸ء)

یعنی سید صاحب کی بات یہ تھی کہ ایک نادرست اور ستائش آفریں قیاس کو بہ صرف میں نے مسکر صداقت سمجھ کر لبیک کہا تھا۔ مجھ جیسے سینکڑوں دیگر شاعروں نے بھی اس ہاتھ پر بیعت کی تھی جو معنوی تھا۔

...............(۲).............

لیجیے ایک بات تو ختم ہوئی کہ بلبل کے قصے کی سی منطقی شاعری یا شورش اور خشونت کی بلند آہنگ مزاحمتی شاعری کی بھی ایک عمر ہوتی ہے لیکن یہ عمر ختم ہونے کے بعد بھی شاعری بصیرت رکھنے والے شاعر کو تو صبح ہوتے ہی نکلتی ہے۔

لیکن ایک بات جس نے مجھے برسوں تک پریشان کیے رکھا اور جس کی طرف یہاں اشارہ کرنا ضروری ہے یہ صنفِ غزل سے ناگواری کی حد تک میری طبیعت کی بے رغبتی ہے۔ یہ کیفیت کیسے پیدا ہوئی؟ اس کی کہانی بھی سن لیجیے۔ میں چودہ پندرہ برس کی عمر میں مشن ہائی اسکول راولپنڈی میں میٹرک کا طالب علم تھا اور دیگر مبتدی شاعروں کی طرح باقاعدگی سے قوافی کی فہرست بنا کر نجم کلاسیکی رنگ کے تتبع میں پیچ اور پوچ قسم کی غزلیہ شاعری کیا کرتا تھا۔ یہ طبیعت کے موزوں ہونے کا جادو تھا کہ عروض کے اعتبار سے ان شعروں میں ناموزونیت کا عنصر کم دکھائی پڑتا تھا۔ خوش قسمتی کہ مرحوم اپنی ہیڈ ماسٹری کے عہدے سے فراغت پا کر گورڈن کالج راولپنڈی میں اردو فارسی پڑھانے کے لیے آ گئے تھے۔ کالج میرے اسکول سے صرف ایک ڈیڑھ فرلانگ کے فاصلے پر تھا۔ ڈی اے وی کالج کے ایک مشاعرے میں انہوں نے دو نظمیں سنائیں۔ کچھ دن کے بعد میں ان سے ملنے کے لیے کالج جا پہنچا۔ لائبریری میں تشریف فرما تھے۔ میں نے "تسلیمات" کہا (آداب کہنے کا آداب بھی نہیں سیکھا تھا) اور آنے کا مقصد بیان کیا۔ چند غزلوں کا جو میں ساتھ لایا تھا ان کے سامنے رکھ دیا۔ میری طرف دیکھ کر بولے "خوب تو شعر کہتے ہو!" میں نے اثبات میں سر ہلایا۔ بولے "کوئی نظم بھی یاد ہے؟" "جی ہاں" میں نے کہا "آپ کی نظم 'نورجہاں کے مزار پر' پوری کی پوری یاد ہے"۔ نظم مجھے حفظ تھی۔ میں نے سنا دی۔ بولے "بہت خوب" میرے سات سے زیادہ طالب علم آج تک یہ مصرع پڑھتے ہوئے کہتے ہیں 'یہ آرام گہہ نور جہاں ہے' زیر کی اضافت کے ساتھ نور جہاں نہیں پڑھتے لیکن تم نے یہ قسم نہیں آنے دیا۔ اچھا یہ بتاؤ کہ پہلے مصرعے "دن کو بھی یہاں شب کی سیاہی کا سماں ہے" میں اور دوسرے مصرعے میں کیا تعلق ہے؟" میں نے فی الفور عرض کیا "پہلے مصرعے میں شب کی سیاہی کا ذکر ہے یعنی دن کے وقت بھی مقبرے کے حجرے میں اندھیرا ہے اور دوسرے مصرعے میں نورجہاں یعنی دنیا بھر کی روشنی کا ذکر ہے....." "مجھے ٹوک کر بولے "شاباش! تم شاعری کے حسن سے واقف ہو۔ میری بات مانو غزل وزل ٹھیک ہے لیکن تمہارے مطلب کی چیز نہیں۔ کبھی بات کی کھلی ہے؟ غزل میں بہت پریکٹس کر لی۔ اب نظم لکھو اور کول پر کول کرو اور ریچھ جیت جاؤ!" اور اٹھ کر مجھے تھپکی دیتے ہوئے باہر کے گیٹ تک چھوڑنے آئے۔ مجھ جیسے ہاکی کے رسیا کے لیے یہ استعارہ بہت معنی خیز تھا۔ آج یہ بات سوچتا ہوں تو آنکھوں میں آنسو آ جاتے ہیں۔

"غزل وزل تو ٹھیک ہے" میں جو بے قواری کا ذائقہ میں نے مرحوم صاحب کے الفاظ میں محسوس کیا وہ باتی کاوی سوا مصرعے حتی میں پہلے بھی موجود تھا۔ یعنی کہ صاحب قوافی کی فہرست تیار کیجیے اور حسبِ قول جوش ملیح آبادی غسل لے کر بیٹھ جائیے۔ غلط غسل میں رکھیے۔ "آغاز" کا شکار کیجیے اور فوراً مار لگائیے وہ مارا! پھر "آشنا" کا شکار کیجیے اور غل مچائیے یہ بھی مار لیا۔ پھر "بیمار" پر نشانہ باندھیے اسے زخمی کر کے گرا دیجیے اور اس طرح شکار کیے ہوئے دس بارہ قوافی پر بھی دس بارہ اشعار کی غزل اپنے غزلوں کے تھیلے میں بھر کر مشاعرے میں لے جائیے۔ اور قادر الکلام ملک الشعراء کا خطاب پائیے۔ برسوں بعد پروفیسر کلیم الدین احمد سے ایک ملاقات میں بھی انہوں نے جوش ملیح آبادی کے تیار کردہ اس منظرنامے کا ذکر کیا اور کہا "آنند صاحب غزل کے بارے میں یہ بات سو فیصد درست ہے۔ غزل ایک غیر فطری صنف ہے۔ مان لیجیے کہ ایک شعر تو وحی کی طرح نازل ہو گیا، آپ اسے غزل کا شعر کہیں یا ایک مختصر نظم، لیکن ایک مکمل نظم مجھے کوئی اعتراض نہیں ہے لیکن ایک ہی وقت میں دس سے بیس تک مختلف النوع پیغامات کی رسالت کے لیے "وحیاں" نازل ہوں بعید از امکانات ہے۔ یعنی آپ چیتھڑے بدل بدل کر مختلف بلکہ متضاد ذہنی کیفیتوں کو زبردستی خود پر طاری کریں؟ لاحول ولا قوۃ!!

مرحوم جوش یا کلیم الدین احمد کی بات میں جو منطق رچی بسی ہوئی ہے اس سے قطع نظر بھی اپنی انفرادی شخصیت اور سبھاؤ کے حوالے سے مجھے شاعری کی اس تعبیر کو قبول کرنے سے ہمیشہ انکار رہا جو الیگزینڈر پوپ نے اٹھارویں صدی میں دی تھی۔

"What oft was said, but never so well expressed,"

یعنی "جو بہت بار پہلے کہا جاتا رہا ہے......" "ارے خدا کے بندو! کوئی ان سے پوچھے' کیوں؟ یعنی کیوں ہم لوگ انہی مضامین کی جگالی کریں جو ہم سے پہلے کئی ہزار لوگ چبا چبا کر تھوک چکے ہیں؟

اب سوچتا ہوں کہ غزل اور بے غزلی کی بحث میں پڑنا ہی ادب اور بے ادبی کی بحث میں پڑنے کے مترادف سمجھ لیا گیا ہے۔ اس لیے اس موضوع

سے فی الحال اجتناب ہی بہتر ہے۔

تو لیجئے صاحب! دبی زبان میں ہی سہی لیکن صنفِ غزل کے بارے میں بھی کچھ بات چیت ہو ہی گئی اور اس ضمن میں مرحوم جوش اور کلیم الدین احمد کے نام Intellectual sanctions کے طور پر بھی آ گئے۔ اب بات رہ گئی ہے تو صرف اپنی شاعری کی اور اس سلسلے میں مجھے اپنا ہی نام لینے کی اجازت دیجئے۔ میرے شعری مجموعے "دست برگ"، "وقت لا وقت"، "آنے والی سحر بند کھڑکی ہے" اور "کہو بیتا ہے" کے بارے میں تبصروں، مضامین اور متفرق آراء میں یہ بات مختلف نقاد حضرات اور تبصرہ نگاروں نے بار بار دہرائی ہے کہ میری نظموں میں اساطیر کی بہتات ہے۔ عالمی ادب سے اور ہندوی، یونانی اور اسلامی کلاسیکی ادب سے کرداروں کی بازیافت ہے، لوک ادب یعنی قصص اور کتھاؤں سے واقعات اخذ کر کے انہیں عصری سیاق و سباق میں نئے معانی دینے کا عمل ہے۔ پری کہانیوں اور طوطا چلا "پنج تنتر" کی "جانور کہانیوں" کے کرداروں کو انسانی عقل و بصیرت سے ملوکر کے ان سے انسانی دنیا کے بارے میں باتیں کہلوانے کی اس تکنیک کا استعمال ہے جسے جارج آرویل نے The animal farm میں رواج دیا ہے۔ غرضیکہ وہ سب کچھ ہے جو اردو شاعری کی اس روایت سے میل نہیں کھاتا، جو عرب اور عجم کی دین ہے، اور جو ایک ایسی راسخ روایت ہے جس سے فرار ممکن نہیں ہے۔ میری شاعری کے بارے میں یہ فرمودات حتی لہجے میں بھی ہیں اور بعض اوقات نرم الفاظ سے بھی پیش کیے گئے ہیں۔ میں چاہتا ہوں کہ اس تقریب میں آج آپ سے اس ضمن میں بھی بات ہو، کہ کیا اردو کی غزلیہ شاعری نے بالخصوص اور دیگر اصناف نے بالعموم صرف ایک ہی Master source پر اپنا انحصار رکھ کر خود کو ایک تنگ نظر حصار میں قید نہیں کر لیا، اور میری نظموں میں وہ کون سے عناصر ہیں، جو ایک جانب تو غزل کی اس روایت کی تردید ہیں، جس کی وجہ سے بار ہا استعمال شدہ استعارات اور تلمیحات کے علاوہ ایک مخصوص قسم کی لفظیات کا استعمال بھی اصنافِ شعر میں جمولیت علم معرفانہ گزیر سمجھا گیا ہے، اور دوسری جانب اس چلن سے صریحاً انحراف ہے، جس کے تحت تاریخ، رسم و رواج اور معاشرے کے دیگر پہلوؤں اور قدروں کو جن کا تعلق عربی یا عجمی روایات کا مرہون منت نہیں ہے، ایوانِ شعر سے باہر رکھنے کی شعوری کوشش کی جاتی رہی ہے۔

یعنی کہ اس بات کا مجھے شدت سے احساس ہوا کہ اردو نے امیر خسرو اور دیگر قدماء کی تحت ہندو روایت سے انحراف کرتے ہوئے انیسویں صدی کے وسط تک یہ شعار اپنا لیا تھا کہ اس بات کو باعثِ فخر سمجھ لیا جائے کہ اردو کے شعری ادب کا تعلق ہندوستان سے کم اور عرب و عجم سے زیادہ ہو۔ یعنی اپنا دامن اپنے آس پاس کی لسانی اکائیوں سے بچاتے ہوئے اس نے اپنی محبت، اور دوستی کے لئے ہمیشہ ان خطوں کی طرف دیکھا ہے، جو بیرونِ ہند کے تھے۔ یعنی دو سو برسوں تک اردو کے اہلِ قلم (بلکہ ہندوستان کے اردو فارسی کے شعراء بھی) خود کو دوسرے درجے کا شہری سمجھ کر شعری کاسہ کے نمونہ جات ان ملکوں سے لیتے رہے ہیں، جن سے کٹے ہوئے انہیں ایک مدت ہو گئی تھی۔ یعنی اپنے ملک کی پوشاک، خوراک، رہن سہن، قدرتی مناظر، موسم (تحصیل سے اور مثالوں سے پرہیز ہی کروں تو اچھا ہے!) وغیرہ سے کتراکر نکلنے کو ہی وہ شعری برکات سمجھتے رہے ہیں۔ ایک ایماندار قاری اور ذہین طالبِ علم کی طرح میرا یہ سوچنا ضروری تھا کہ کیا بات ہے کہ مصر کے بازار میں یوسف کی فروخت کے ضمن میں مضمر اشاراتی پہلو کا استعارہ تو شاید ایک لاکھ بار اردو شاعر نے استعمال کیا ہو، "ہیر ہیرا" کی اصطلاح شاید ایک کروڑ بار زیرِ قلم آئی ہو۔ مجنوں کے جنونِ عشق کا بکھان دس کروڑ بار کیا گیا ہو، لیکن اپنی ہی زمین پر اپنے ہی ملک میں اپنی ہی تاریخ، دیومالا کا ایک (ادبی نہیں بلکہ عوامی) نہ ہاتوری کے قصص، کو غیر ماننے کی درخور اعتنا نہیں سمجھے گئے کہ ان پر ایک غلط انداز بھی ڈالی جا سکے۔ جب کسی شاعر نے یہ گناہ سرزد ہوا اسے قابلِ گردن زدنی سمجھا گیا۔ یعنی اسے شاعر ماننے سے ہی انکار کر دیا گیا۔ نظیر اکبر آبادی کی مثال اظہر من الشمس ہے۔ میری ایک نظم بعنوان "پرکھی دو سو جڑیاں" پنجاب کے لوک قصے "پورن بھگت" کو لے کر لکھی گئی ہے اس میں سیالکوٹ کے بوڑھے راجہ سلوان اور پندرہ سالہ لونا رانی کی شادی کے بعد محل میں راجہ کے ہم عمر سوتیلے بیٹے پورن سے اس کے عشق کی داستان کو لونا کے نقطۂ نظر سے دکھایا گیا ہے۔ جب یہ نظم چھپی تو اردو کے ایک معتمد شاعر نے پاکستان سے مجھے ایک خط لکھا "آفرین! صد آفرین! ہم لوگ پاکستان میں رہتے ہوئے بھی اور اس قدیم قصے سے واقف ہوتے ہوئے بھی اپنی شعری کاوشوں میں کبھی بوڑھے مرد اور نوجوان لڑکی کی بالجبر شادی کے استعارے کے طور پر شاید اس لئے اس کا استعمال نہ کر سکے کہ ہماری نظریں ہمیشہ فارسی قصص پر مرکوز رہی ہیں، لیکن آپ نے بھائی جان، سرحد پار رہتے ہوئے بھی پہلی بار اردو میں اسے متعارف کیا ہے، اس کے لئے آفرین، صد آفرین!!"

یعنی کہ یہ ضروری تھا کہ اردو ہندوستان کے مین اسٹریم لٹریچر (ہندی اور بنگالی) کے ساتھ ساتھ علاقائی زبانوں کے ادب کے ساتھ بھی برابری کے لین دین کا رشتہ رکھتی۔ لیکن تاریخ گواہ ہے کہ ایسا نہیں ہوا۔

علاقائی زبانوں کے ادب کے ساتھ بے اعتنائی کے رویے کی سب سے بڑی مثال پنجاب کا لوک ادب ہے، جس سے صوفیائے کرام کا کلام جڑا ہوا ہے، پنجابی زبان کا ہزاروں برس پرانا پنگل (عروض) "چھند" (تقطیع کے پیمانے) میں ایک دو جن سے ورلوک گا کی کی طرز پہ ہیں، جن میں ہیر، مرزا، جگنی، ماہیا، ٹپا، ڈھولا، جن، چھلا، بولیاں آج بھی گائی جاتی ہیں۔ کچھ اصنافِ سخن صوفیائے کرام کی ایجاد کردہ ہیں۔ جن میں گنج شکر بابا فرید کے دوہے (یعنی کہ دواس سے تین سو برس پہلے کی دوہے کی شکل) بابا بلھے شاہ کی کافیاں، متعدد دیگر شعراء کی سی حرفیاں شامل ہیں۔ اردو کو اس کے جنم استھان کے بعد اگر کسی خطے سے بڑھ چڑھ کر پشت پناہی ملی تو وہ پنجاب کا خطہ ہے لیکن اردو نے پنجاب کے امیر ترین تہذیبی ورثے کو اس قابل نہیں سمجھا کہ اس سے کچھ استفادہ کر سکے۔

۱۹۸۱ء میں پنجاب چندی گڑھ کے شعبۂ جدید ادب جس کے

سر رہ لو اور بھائی ویر سنگھ چیئر کے چیئرمین ڈاکٹر وی این تیواڑی تھے۔ ایک سمینار منعقد کیا جس میں مجھے یہ کام سونپا گیا کہ میں شعبۂ اردو کے چیئرمین ڈاکٹر ہارون ایوب (جو آج اس جلسے میں موجود ہیں) کی مدد سے ۱۹۵۰ تک کے اردو کے شعری ادب پر پنجابی ادب اور پنجاب کے لوک ادب کے اثرات پر مبنی ایک سیر حاصل مقالہ پیش کروں۔ ہم دونوں نے تحقیق کے معروضی طریق کار اور جدید اسلوب اور پیرایوں کو بروئے کار لاتے ہوئے دو ریسرچ اسکالروں کو اس کام پر لگایا کہ ۱۹۵۰ سے پہلے کے سارے شعری مجموعوں میں سے پنجاب کے بارے میں کسی بھی حوالے (تاریخ، لوک قصص، لیجنڈ، زبان، تاریخی شخصیات، شعرا اور دیگر اہل قلم وغیرہ) کی درجہ بندی Frequency count کی فہرست بنا کر کریں۔ دو ماہ کی مشقت کے بعد جو فہرست تیار ہوئی۔ وہ اس قدر مختصر تھی کہ مجھے شرمسار ہو کر ڈاکٹر وی این تیواڑی سے یہ مضمون نہ پیش کرنے کی اجازت طلب کرنی پڑی۔ یعنی کہ میر سے لے کر فیض احمد فیض تک ساڑھے چار سو کے قریب جید و جدید شعری مجموعوں میں ہیر یا رانجھا کے بارے میں کل بارہ حوالے دستیاب ہوئے۔ یہ بھی پنجابی نژاد اردو شاعروں کے تھے۔ ایک حوالہ جو مجھے آج تک یاد ہے کسی برگزیدہ شخص کے قتل کے بارے میں تھا، اور خوب تھا۔

یہ قول شب کس رانجھے کی قسمت کا ستارہ ڈوب گیا
پنجاب کی اٹھارہ ہیروں نے ماتھے کے جھومر توڑ دیے
(شاعر نامعلوم)

سوہنی کے کچے گھڑے پر تیر کر چناب عبور کرنے اور ڈوب مرنے کے عشق کی شوریدہ سری اور ایثار و قربانی سے متعلق کل نو (۹) حوالے دستیاب ہوئے۔ سسی پنوں کے بارے میں صرف تین حوالے تھے۔ باقی اللہ اللہ خیر صلا!

یہ بھی حوالے ۱۹۵۰ء سے کچھ پہلے کی نظموں اور غزلوں یعنی آزادی اور قیام پاکستان کے آس پاس اردو شاعری میں در آئے تھے۔ اس سے پیشتر کا خصوصی طور پر انیسویں صدی اور بیسویں صدی کے اوائل کا منظر نامہ ایک ادبی ویسٹ لینڈ تھا جس میں پنجابی یا دیگر شمالی مغربی زبانوں کے ادبی ورثے کا کوئی حوالہ نہیں تھا۔

مجھے اس بارے میں زیادہ کہنے کی ضرورت نہیں ہے۔ آج کی تقریب میں میرے سامنے کئی ذاتی دوست اور غزل گو شعرا بیٹھے ایک درجن سے زائد تعداد میں مجھ پر کرم فرمائی کرتے ہوئے تشریف لائے ہیں۔ اگر وہ گھر جا کر اپنے ہی شعری مجموعوں کی ورق گردانی کریں تو انہیں دیکھ کر حیرت ہوگی کہ ان کی غزلیات میں فارسی کے تسلیم و رضا سے پائی ہوئی تشبیہات، استعارات اور تلمیحات تو بڑی تعداد میں ملیں گی، لیکن اپنے وطن یا صوبے کے دریاؤں، پہاڑوں یا تاریخ، متھ اور لیجنڈ یا رسم و رواج سے اخذ شدہ استعاروں کا استعمال یا ان کا ذکر خال خال ہی ملے گا۔ کچھ برس پہلے جب میں نے اس تاریخی صورت حال کے حوالے سے ایک مضمون بمبئی کے ایک ادبی رسالے میں لکھا تو ایک معتبر اور 'جدید' نقاد نے جو اپنے رسالے میں مجھ سے استفسار فرمایا کہ کیا اردو شاعری برصغیر کی شاعری بھی ہو سکتی ہے کہ اگر اس میں گلاب و ستارہ، صبا و قبا کے بجائے شلوار قمیص، دھوتی، لنگی، ٹوپی وغیرہ کا ذکر ہو؟ گلاب کے بجائے چنبیلی کا ہو؟ پھلوں میں کٹھل اور بیر کا ذکر آئے؟ اس متکبرانہ رویے سے قطع نظر کہ مجھے اس میں Holier than thou کی بو آئی۔ میرا جواب صرف یہ بھی ہو سکتا تھا کہ کیوں نہیں صاحب! آپ کو اور آپ کے بزرگوں کو اس ملک میں رہتے ہوئے کئی سو برس ہو گئے۔ اب بھی آپ کو یہاں کی چیزوں سے دیسی، اور گنوار یعنی گھٹیا ہونے کی باس آتی ہے؟ اور جو کچھ بھی وسط ایشیا سے آیا ہے وہی مہذب نظر آتا ہے؟ اگر ایسا ہے تو آپ اپنے تئیں ایماندار نہیں ہیں۔

تو صاحب! یہ روپ کہاں سے آیا؟ اور کب تک ہم اسے جان کی طرح عزیز رکھیں گے؟ مجھے کہنے کی اجازت دیجیے کہ "دلی اسکول" اور "لکھنؤ اسکول" اور "مروجہ محاورہ اور روزمرہ" اور اساتذہ کے کلام سے لفظیات کی سطح پر جتنوں اور تقلید کی سختی یا درستی کی اسناد اردو شاعری کے لیے تب بھی ہم قائل رہے ہیں اور آج بھی ہیں۔ یعنی کہ اردو اتنے بڑے علاقے کی زبان ہے کہ ہم اسے برصغیر کے بجائے برِ اعظم کہیں، تو بھی غلط نہ ہوگا اور جس کے بولنے اور لکھنے پڑھنے والے ہندوستان کے مغربی ساحل پر مراٹھی کی ایک ذیلی شاخ یعنی "کوکنی" بولنے والے بھی ہیں، اڑیسہ کے شرقی ساحل پر اڑیا بولنے والے بھی ہیں اور پاکستان کے شمال مغربی صوبہ جات کے پشتو اور بلوچی بولنے والے بھی ہیں، کب تک ان علاقائی اثرات سے منہ موڑا جا سکتا ہے؟ اور کب تک دلی اور اس کے جنوب مغرب اور جنوب مشرق کے اضلاع اور صوبہ جات یا ان کے نواح میں شہری اور قصباتی مدرسوں میں پڑھائی جانے والی زبان کا تتبع کر سکتی ہے؟ یعنی اگر اردو کے بہی خواہ اس بات پر مصر بھی ہوں کہ جو زبان وہ لکھتے ہیں یا بولتے ہیں وہی صحیح ہے تو پھر جو انگریزی BBC کی نشریات میں بولی جاتی ہے، اور جسے اصطلاحاً R.P یعنی Received Pronounciation کہا جاتا ہے اور سرکاری اعداد و شمار کے مطابق جسے انگلستان میں صرف ایک فیصد لوگ ہی بولتے ہیں، وہی صحیح ہے۔ امریکہ، کینیڈا، آسٹریلیا، نیوزی لینڈ، انڈیا، پاکستان، بنگلہ دیش اور افریقہ کی سابق برٹش نو آبادیوں میں انگریزی کے جس رنگ روپ کا ارتقا ہو رہا ہے، وہ غلط ہے...... یعنی کہ صاحب! اگر ہم اس مفروضے کو لے کر چلیں تو انگریزی کیا جسے R.P بولنے والے انگریز اگر "انگریزی" کہنے پر مصر ہوں، مگر سمٹ کر بوتل کے جن کی طرح پھر بوتل میں محبوس ہو جائے گی کیونکہ انگلستان سے باہر انڈیا میں تو Indian English جسے اب کچھ تدریسی حلقوں میں Indish کہا جاتا ہے، ارتقا پذیر ہے اور افریقہ میں سابق برٹش نو آبادیوں سے آنے والے طلبا کی انگریزی کے جو نمونے میں نے دیکھے ہیں، انہیں Afrish یعنی افریقین انگلش کہنے میں شاید کسی کو عار نہیں ہوگا۔

مجھے یہ سوچ کر افسوس ہوتا ہے کہ اردو کی برگزیدہ ہستیوں نے آخر کیوں ایسا کیا۔ یعنی کہ گیارہویں اور بارہویں صدی عیسوی سے لے کر (جب ابھی اردو پیدا بھی نہیں ہوئی تھی) انیسویں صدی تک صوفیائے کرام نے پنجاب

اور دلی اور راجستھان کے نواح میں جب علاقائی بولیوں کے توسط سے توحید کا پیغام ان لوگوں تک، جن میں اکثریت اہل ہنود کی تھی، پہنچایا اور اپنی شاعری میں اسی علاقے کے رہن سہن کی تصویر کشی کو ملحوظ خاطر رکھا تو کیا وہ عرب اور عجم کے عظیم تہذیبی ورثے کو جو کہ ان کا اپنا بھی ترکہ تھا، سب کر رہے تھے؟ شیخ شکر بابا فرید کے دوہوں کو آپ کیا جگہ دیں گے؟ سکھ مذہب کی متبرک کتاب گرو گرنتھ صاحب میں بھی دو ہے وہ قابل تعظیم مقام رکھتے ہیں، جس کے وہ اہل تھے۔ ہندی کے مسلمان شاعروں میں دو نام بے حد اہم ہیں، رس کان اور ملک محمد جائسی۔ موخر الذکر کی "پدماوت" کو ہندی کی اہم ترین کتابوں میں شمار کیا جاتا ہے۔

دوستو! مجھے تو یہ سب کچھ دیکھنے اور بچارنے کے بعد ایسے محسوس ہوا جیسے ہمارے بزرگ شعرا ایک لمبی سرنگ میں داخل ہو کر اس کے کوسوں تک چلتے گئے ہیں۔ جس کا دوسرا سرا تو کیا اس تک پہنچنے کا راستہ بھی ہمیں دکھائی نہیں دیتا۔ زراعت اور حشریات کے علوم کے ماہر ہمیں آگاہ کرتے ہیں کہ Cross Fertilization اور Cross Breeding نسل کی بہبودی اور ترقی کے لئے ضروری ہیں۔ ہمیں یہ سبق از بر نہیں ہوا اور ہم نسل در نسل خون کے ایک ہی سرچشمے پر انحصار کرتے رہے ہیں، جس کا نتیجہ سوکھنے پر مجبور ہمیں اس کی Recycling پر ہی بھروسہ کرنا پڑا۔ اس لئے مجھے بے حد افسوس ہوا جب میں نے اپنی یک مصرعی نظموں کے ایک مجموعے کا مسودہ اردو کے ایک معتبر نقاد کو بھیجا، جن کے بارے میں میرا خیال تھا کہ وہ جدیدیت کے بانیوں میں سے ہیں۔ جو پہلا اعتراض انہوں نے اپنے خط میں کیا، اسے میں من و عن آپ کو پڑھ کر سنا رہا ہوں۔ "دیگر محاسن کی موجودگی کے باوجود ان نظموں کی اردو ذرا Blood Less ہے۔ آپ نے شعوری طور پر اضافتوں اور تراکیب سے پرہیز کیا ہے۔ یہ نہ معلوم کہاں تک صحیح ہے۔ ان نظموں میں اردو شاعری کی Time Honoured sources کو پس پشت ڈال کر آپ کا ہندوی دیو مالا اور قصے کہانیوں سے استفادہ کرنا بھی ایک مرتبانہ ہے۔ ان میں رچاؤ اور غنائیت کی کمی بھی کھٹکتی ہے۔"

کہا میں نے، یعنی دل میں کہا میں نے، "ارے صاحب! آپ جیسے اردو کے مہربانوں نے ہی تو اردو کو یہ دن دکھلایا ہے کہ اس زمانے میں بھی، یعنی بیسویں صدی کے آخری پندرہ برسوں میں بھی، نظم کی صنف پر اظہار خیال کرتے ہوئے آپ غزل کے لوازمات، یعنی رچاؤ اور غنائیت" کو پانے پر مصر ہیں۔ پھر پایا میں نے یہ فرض کر کے، کہ آپ پڑھے لکھے ہیں اور بزعم خود "جدید" بھی ہیں!"

کہا میں نے اور اس بار با آواز کہا میں نے، "اردو شاعری کے بارے میں یہ نو آبادیاتی رویہ اب ختم ہو جانا چاہئے۔ سارے ان فکر بندیوں، غلام گردشوں، حجروں، مقبروں اور زنان خانوں سے باہر آ کر گلی محلے، کھیت، کھلیان، روزانہ کے کام اور کاروبار کی جگہیں، بسوں، لوکل ٹرینوں، راشن کے ڈپو کے باہر لمبی قطاروں، یعنی شہر، قصبے اور گاؤں میں ننگے سر اور ننگے پاؤں نکل آنا چاہئے۔

"وہ کیا فرمودات ہیں! "ان کی اردو ذرا Blood Less ہے" "اور" ان میں رچاؤ اور غنائیت کی کمی ہے"۔ یعنی موصوف مجھ سے نظموں میں غنائیت (یعنی نغمے کی کیفیت، موسیقیت) کی توقع رکھتے ہیں؟ اور یہ بات وہ بیسویں صدی کے آخری برسوں میں کہہ رہے ہیں؟ رہی اردو کے Blood less ہونے والی بات تو کیا وہی اردو صحت مند اردو ہے، جس میں عربی فارسی تراکیب کی بھرمار ہو، جو اضافتوں کے انسلاک سے مصنوعی طور پر تعمیر کی گئی ہو اور جس میں سابقوں اور لاحقوں کا بے دریغ استعمال کیا گیا ہو؟

کہا میں نے اور اس بار پرنٹ میڈیا میں، یعنی اردو اور انگریزی دونوں کے یکے بعد دیگرے ایک درجن کے لگ بھگ مضامین میں کہا میں نے کہ غزل تو صبح ملاقات کے لئے یا ایک شام مشاعرے میں اپنی کلچرل لنگی کو کھونٹی میں بدلنے کے سامان عیش کے طور پر تو بجا ہے، اور اس کا استعمال ہے، لیکن اس "استحصال لیے، میں، دوستو اور عزیزو! اگر آپ اصلی شاعری کو بھلا بیٹھے ہیں تو یہ بجا نہیں ہے۔ اٹھ بیٹھو۔ اپنے آس پاس دیکھو۔ "آلھا اودل" اور "رانی کیتکی" کی کہانی سے لے کر "ہیر رانجھا" اور "سوہنی مہینوال" تک، پیچھے شاعری کا نمونوں سے لے کر دوہے، ڈوہڑے، سر حرفی، سوئے، شلوک اور شبد، ابھنگ، ایک درجن یا اس سے بھی زیادہ اصناف سخن تمہارے بزرگوں نے لوک ادب کے ورثے کے طور پر تمہارے لئے چھوڑی ہیں۔ انہیں پہچانو، اگر دو سو برسوں تک سوئے رہے ہو اور چیزیں یا افتادہ اصناف سخن جو نہ جانے کس گھڑی میں تم نے فارسی اور عربی سے متبرک سمجھ کر لے لی تھیں اور اپنے کشکول میں ڈال لی تھیں۔ اب تمہیں اپنے پاؤں کی زنجیریں محسوس ہونے لگی ہیں تو انہیں کھول ڈالو۔ اب بھی وقت ہے دن بہت چڑھ آیا ہے۔ دیر سویر کی بات نہیں ہے، بیدار ہونا شرط ہے۔

کہا میں نے، لیکن صرف کہا ہی نہیں، میں نے ان برسوں میں ساڑھے تین سو سے کچھ اوپر نظمیں بھی لکھیں تا کہ میرے بزرگوں، دوستوں اور عزیزوں کو یہ احساس ہو کہ غزلیہ شاعری یا غزل کے لوازمات، بالخصوص رچاؤ اور غنائیت سے کوری ہوئی نظموں کے علاوہ بھی شاعری ہو سکتی ہے۔ یہ شاعری ماضی کی شاعری سے کس قدر مختلف ہے، یہ میں نے بتانے کی حتی المقدور کوشش کی ہے۔ مستقبل اس شاعری کو حال کے حوالے سے کیسے دیکھے گا، یہ ابھی وقت کی مٹھی میں ہے، لیکن آج جب میں اپنے ساٹھ برس مکمل کر چکنے کے بعد اکسٹھویں برس میں داخل ہو رہا ہوں، اپنی اس "شصتی پورتی" کے موقع پر یہ کہنے سے گریز نہیں کروں گا کہ یہ مستقبل کی شاعری ہے۔ میری زندگی کے کچھ برس ہی باقی ہیں، میں شاید نہیں دیکھ پاؤں گا، لیکن مجھے غالب کی آواز کے ساتھ اپنی آواز ملانے کی اجازت دیجئے۔

کوکبم را در عدم اوج قبولی بودہ است
شہرت شعرم بہ گیتی بعد من خواہد شدن

(غالب)

نعت

حاضری

حضورِ اکرمؐ
فقیر اک پائے لنگ لے کر
سعادت حاضری کی خاطر
ہزاروں کوسوں سے آپ کے در پہ آ گیا ہے
نبئِ برحقؐ
یہ حاضری گرچہ نامکمل ہے
پھر بھی اس کو قبول کیجئے
حضورؐ آقائے محترم
یہ فقیر اتنا تو جانتا ہے
کہ قبلۂ دیدِ صرف اک فاصلے سے اس کو
روا ہے..... اس کے نصیب میں
مصطفےٰؐ کے در کی تجلیاں دور سے لکھی ہیں
نبئِ اکرمؐ
وہ سایۂ رحمتِ پیمبرؐ
جو صف بہ صف سب نمازیوں کے سروں
پہ ہے اس کا ایک پرتو
ذرا سی بخشش
ذرا سا فیضانِ عفو و رحمت
اسے بھی مل جائے
جو شہِ مرسلیںؐ
دستِ دعا اٹھائے کھڑا ہے اک فاصلے پہ
لیکن
نمازیوں کی صفوں میں شامل نہیں ہے آقاؐ!

....(۱۹۹۳ء)

یہ نظم ستمبر ۱۹۹۳ء میں سعودی عرب کی ریاست جہاں میں زخمی پاؤں پر کھڑے ہو کر عصر کی اذان کے دوران لکھی گئی اور صرف پانچ منٹ میں مکمل ہوئی۔

سنو اینجل*

METAVISION NO:2

رات کو کمرے کا سناٹا جکڑ لیتا ہے اپنے
آہنی ہاتھوں میں ..... اور پھر
لا پٹختا ہے اسی بستر پہ جس کی
برف کی براق چادر
کی ہر اک سلوٹ میں تم لپٹی پڑی ہو

دائیں جانب کا ہلکا جھول جس سے
اک مکمل جسم کا خاکہ ابھرتا ہے
سنو اینجل کا شاید
اس بدن کا جو تم اپنے ساتھ لے کر جا چکی ہو
اور میں ڈرتا ہوں
بائیں ہاتھ سے تا ہوں
تمہارا نقش بستر سے سنو اینجل کا خاکہ
مٹ گیا تو شب کے سناٹے میں کس سے بات
ہو گی!

* مغربی ممالک میں برف پڑنے کے بعد بچے اس میں لیٹ کر
اپنے پورے جسم کا ہموار خاکہ بنا دینے کا عمل کھیلتے ہیں
اسے "سنو اینجل" یعنی "برف کا فرشتہ" کہا جاتا ہے۔

شاعر

فصیلوں کے اس پار
بابِ حجر تک
پہنچ کر بہت دیر ٹھہرا رہا وہ
پھر آہستگی سے
ڈھوئی عذابوں کی گٹھڑی کو کاندھوں سے اپنے
رہا

رکا چند لمحے
کہا..... "کوئی ہے جو پکارے مجھے
مجھ سے پوچھے کہ میں کون ہوں
اپنی گٹھڑی میں کیا کچھ اٹھائے ہوئے
دیر سے پھر رہا ہوں
فصیلوں کے اس پار کیوں منتظر
پتھروں کے در آخرت پہ کھڑا ہوں؟"
فقط شام کے سائے تھے
اور بابِ حجر
کو آنکھوں کی بے لور یگانگی سے اسے تک رہا
تھا

کہا پھر..... "کوئی ہے
جو کرتا رہا ہو قسم بھی کھاتے میں بے لحد
مرے خیر و شر نیک و بد کا ناسے؟
مرے کرم کاغذوں کا اعمال نامہ؟
کہ میں خود مختار حرف و سخن ہوں
کہ میں خود حساب اپنا لکھتا رہا ہوں
کہ گٹھڑی میں میری وہ سب کچھ بندھا ہے
جو میں نے کمایا ہے
اچھا بُرا تو اسے دیکھنا ہے
جو کاتب ہے تقدیر کا..... اور میرے
نوشتے کو اس پار بیٹھا ہوا
اپنی مرضی سے یک طرفہ لکھتا رہا ہے!"
جواباً فقط اس کی اپنی ہی آواز کی گونج تھی
سائے تھے
اور بابِ حجر تھا

اب بھی جب میں بھاگتا ہوں
دور خود سے اپنے ماضی سے
تو لگتا ہے کہ جیسے ساتھ میرے چل رہے ہوں
چرچراتے بوڑھے تانگوں میں جتے مردود گھوڑے
سست مریل چال سے چلتے ہوئے مدقوق رکشے
پھپھناتے کالا زہر آلود دھواں چھوڑتے
بد کار بدکردار تھری وہیلر
گلی میں سیوریج لائن کے ذرا رک رک کے بہتے
کھلے نل
ٹونٹیاں جن کی نہ جانے کب کی چوری ہو چکی ہیں
ٹوٹی پھوٹی نالیاں
قبائیں کوچوں اور گلیوں میں رچی
زیر آب سے بہتی ہوئی اک سال خوردہ فاحشہ بدبو
مدتوں سے پڑے کوڑے کے ڈھیروں سے پٹی گلیاں
بدشکل بھنگی عورتیں
فضلے کے وزنی ٹوکرے سر پر اٹھائے
پیٹ میں رکھے
پرانے شہر کے پل پر کئی صدیوں سے
مرتے پیدا ہوتے آرہے کوڑھی بھکاری
لوگ!
لاکھوں لوگ!
میرے جسم کے اعضا مرے ٹکڑے
مرے پرکھے مرے ہم عصر میری آنے والی
سینکڑوں نسلیں
جنھیں میں رد نہیں کرتا
قبولیت بھی جن کی آج ناممکن ہے
شاید اس لیے
(میں جانتا ہوں)
میرا ماضی
اس جنم میں بھی میرا پہلا جنم
اب مر چکا ہے!

کن فکاں ۱

مجھے ذرا اس میں شک نہیں ہے
کہ میرا ربِ الکریم
تخلیق کے عمل سے ابھی تلک ایسے منسلک ہے
کہ جیسے دنیا کی ابتدا کا یہ پہلا لمحہ ہو.....
اور پروردگارِ عالم کا پہلا ارشاد لب ہوا ہو
کہ ”روشنی کا ظہور ہو“ ۲
کہ موجودیت کا اجرا،
اور ”کن“ کی ہمیشگی کا ہمہ تسلسل بہ صوت حاضر
رواں دواں یہ تلاوتِ کن ہی اس کے ہونے کی
راستی کی دلیل خود ہے!

مجھے ذرا اس میں شک نہیں ہے
کہ ”کن“ کے اعراب یک صدا ابھی ہوں
تو بھی اصوات پے بہ پے ہیں
کہ سلسلۂ خبر بیدائے شروع ہستی
تو اجزِ خود جھلکی ہے!

مجھے ذرا اس میں شک نہیں ہے
کہ میں بھی ”کن“ کے تواتر پے بہ پے کا مظہر عشر ہوں
اک رواں دواں قلب نابپت ہوں
دھڑک رہا ہوں
میں آدمی ہوں!

۱ بہت سے مفکرین نے تخلیقِ عمل کی ہمیشگی اور ہمہ تسلسل کو قدرت کی کارکردگی کا پہلو تسلیم کیا ہے۔ جیسا کہ چھٹی صدی قبل مسیح کے توحید پرست فلسفی زینوفینز (وفات ۴۷۳ ق م) نے کہا تھا "The divine spirit is continually self-creating, not merely eternal and static."

۲ "Let there be light!" (Old Testament)

نابینا! بینا

ستیہ پال آنند اندھا ہو گیا ہے
۱ ذو نگاہی یوں بھی اس کی ذات کا شیوہ نہیں تھی
اپنی آنکھوں سے اسے شکوہ بہت تھا
اپنے ”اندر“ دیکھ سکنے کی صلاحیت سے عاری
صرف ”باہر“ دیکھتی تھیں!
دیکھتی تھیں
کم نظر لوگوں کی کم ظرفی.... تفاوت
ان کے ظاہر اور مخفی
دیدنی نادیدنی اعمال میں
کردار کی گفتار کی ثنویت میں
اس کی آنکھیں
نامکمل عضو تھا اس کے بدن کا!
کوئی مابعد النظر منظر بھی ان کو
اس قدر دلکش نہیں لگتا تھا جس کو دیکھ سکتیں
۲ ماورا ہو کر لا سے دور ہٹ کر
اس کی آنکھیں
(خود سے اس نے بارہا پوچھا تھا)
آخر رخ پلٹ کر
الٹے پاؤں گھوم کر
اندر کی جانب کیوں نہیں کھلتیں؟
انھیں کیا وسوسہ ہے خوف ہے کیا؟

ستیہ پال آنند اندھا ہو گیا ہے
کس قدر خوش ہے
کہ ما بعد النظر منظر بھی اس کی آنکھ کی
اب دسترس میں آ گیا ہے!

۱ Double Vision
۲ Metavision

آٹھ مختصر نظمیں

دُعا

شاہِ عالمؐ یہ شاعری کا سفر
اور اس کی تمام تر روداد
آپ کے سامنے ہے میں نے تو
نورِ احمدؐ سے مانگ کر کرنیں
اپنی راہوں میں روشنی کی ہے

مجھ پہ نظرِ کرم ہو شاہِ اُمم
اس لیے بھی کہ خیرِ مسلم ہیں
(دل سے لیکن ہوں آپ کا بندہ!)
اس لیے بھی کہ میرا شاعرِ فکر
آپ کے ذکر سے رسولؐ پاک
نعت گوئی کا فن بھی سیکھ گیا
اس لیے بھی کہ ہر دعا میں اثر
بے شک آپ کی شفاعت سے!

اے خیرِ مرسلینؐ آپ مجھے
استطاعت عطا کریں گے تو میں
کامیابی سے شاعری کا سفر
طے کروں گا اور اپنی منزل تک
کامران شادکام پہنچوں گا!

بن باس

جانے والے نے عید کا دن ہی
کیوں چُنا اس سے کوئی کیا پوچھے
چاند کی پہلی رات تھی اور آج
چاند کی چودھویں ہے.... چودہ دن
دن نہیں ہیں طویل تر عرصہ
چودہ برسوں کا ہے جسے میں نے
ذہن کے جنگلوں میں چلتے ہوئے
گھر کی دہلیز پر گزارا ہے!

نرگس

اک سمندر تھا جس نے اپنا عکس
جھیل میں دیکھا اور حل ہونے
کے لیے ڈوبنا غلط سمجھا
نرگسِ دیدہ ور تھا اپنی ذات

قربانی

بند ہو جا ستار پیچھے سے
تیری تانوں میں خود کو کھوئے ہوئے
"تان پورا" جو بج رہا ہے مجھے
اس کو سنتا ہے اس حقیقت کا
مجھ سے بڑھ کر کسے پتہ ہے کوئی
پیچھے رہ کر بھی اپنا سارا وجود
ساری محنت تمام فکر و عمل
خود سے کچھ آگے رہنے والے پر
کیسے قربان کرتا رہتا ہے!

بین کے سُر

سانپ سے خوف اب نہیں آتا
سانپ کا زہر تو میں جھیل چکا
اب مجھے بین کے سروں سے بہت
خوف آتا ہے ان کا کاٹا ہوا
شخص تریاق سے نہیں بچتا!

ادھورے کردار

کیسے تکمیل تک پہنچ پاتے
حسن اور عشق کے کبھی قصے
جبکہ کردار خود ادھورے تھے
حسن کی دیوی کے نہیں تھے ہاتھ
عشق کا دیوتا بھی اندھا تھا!

ریزہ

شرط تھی واپسی کی دونوں مڑے
آئے چوکھٹ پہ ایک بار رکے
ٹھٹکے گھر کے کواڑوں کو دیکھا
گھر وہی تھا کواڑ پہلے سے
کچھ زیادہ پرانے لگتے تھے
دونوں داخل ہوئے تو پاؤں میں
کانچ سا چبھ گیا جھکے دیکھا
پانچ برسوں کی جس رفاقت کو
بھول بیٹھے تھے اس کے ٹوٹے ہوئے
عکس کا اک پرانا ریزہ تھا!

تن تنہا

وہ جو ہر روز اپنی کھڑکی سے
جھانکتا ہے کہ دور سے کوئی
راہرو آئے اور وہ اس کو
گھر میں مدعو کرے محبت سے
بیٹھ کر گفتگو کرے اس کو
اس حقیقت کا کوئی علم نہیں
نسلِ آدم نے خودکشی کر لی
شہر کی موت ہو چکی..... اور وہ
(اپنی کھڑکی سے جھانکنے والا)
اک اکیلا ہے ساری دنیا میں
نسل کا آخری نمائندہ!!

قصہ ویپنگ وِلّو کا اور میرا

"قصے سناتے رہو تاکہ شاید لوگ سوچ بچار کریں" تفکر عملدرآمد کریں!!

الاعراف ۱۷۶ (القرآن)

قصہ نمبر ۱

بارش ہے اور میں ویپنگ وِلّو کے ساتھ جُڑا بیٹھا ہوں
ٹپ ٹپ نیر بہاتی وِلّو اور میں .... دونوں
بچپن سے اک سنگ رہے ہیں
جب وہ ننھا سا پودا تھی
اور میں ننھا سا بچہ تھا
اکثر میں اور وہ بچپن کی باتوں میں کھو جاتے تھے
بارش کب لاؤ گے اے میرے ہمجولی؟
ہوا کی سائیں سائیں کرتی بولی میں وہ روز پوچھتی
اور میں اکثر
بادل کے بھیگے آنچل کو
بالک ہٹ سے کھینچ کھینچ کر
اس کے سر پہ لے ہی آتا
ٹپ ٹپ رونے لگتی وِلّو
اس کا رونا اس کی ہنسی تھی
آج میں ستر سال کا بوڑھا
اور وہ ستر سال کی بوڑھی
پھر اک بار جو مل بیٹھے ہیں تو وہ خوش ہے
چھتری، چلمن، سائبان سی ویپنگ وِلّو
بارش کی بوچھاڑ کے نیچے
ٹپ ٹپ آنسو آنسو روتی
ہنستے ہنستے جھوم رہی ہے
میں لیکن وا ماندہ، بےدم
اٹھاسی کی آنکھوں کا مارا بوڑھا
اس کی جانب جھک کر دھیرے سے کہتا ہوں
وِلّو، تم تو ویسی ہی شاداب ہو جیسے
اپنے بچپن میں ہوتی تھیں
بالکل پہلے جیسی تازہ
اور میں اک ہارا ہوا کھلاڑی
دنیا کی ہر دوڑ میں اوّل آتے آتے
پاؤں زخمی کر بیٹھا ہوں
پھولا سانس، دھڑکتا دل، ہاتھوں میں رعشہ
میں تو وِلّو اپنی دوڑ میں ہار گیا ہوں
روتی ہنستی وِلّو جیسے میری جانب جھک آئی ہے
اس کے آنسو اپنی ٹپ ٹپ کے سرگم میں
مجھ سے گویا پوچھ رہے ہیں
دنیا کی ہر دوڑ میں اوّل آنا ہی کیا اہم تھا اتنا
جس کی خاطر تم نے خود کو مار دیا ہے؟
میں تو اپنی جڑیں زمیں میں گاڑے
ایک جگہ ہی پھلتے پھولتے بڑی ہوئی ہوں
بارش ہوتی ہے تو میں روتی ہنستی ہوں
مجھے کسی بھی دوڑ میں اوّل آنے کی تشویش نہیں ہے
اب بھی آخر کیا بگڑا ہے؟
آ ہی گئے ہو تو پھر مجھ سے ناطہ جوڑو
آؤ ہم دونوں پھر مل کر
بالک ہٹ سے بادل کے آنچل کو کھینچیں
بارش لائیں!
بارش ہے اور میں ویپنگ وِلّو کے ساتھ جُڑا بیٹھا ہوں!!

قصہ نمبر ۲

ہنسنا رونا ایک عمل کے دو پہلو ہیں
ٹپ ٹپ روتی ویپنگ وِلّو ہنستے ہنستے یہ کہتی ہے
اپنے چہرے سے ہنسنے کی پرت ہٹاؤ
نیچے گالوں پر آنسو بہتے دیکھو گے
غم اور خوشی کو ایک سا جانو
دل کا فولادی مادہ پگھلا کر موم بناؤ
آنکھوں میں آنسو چھلکاؤ!
تم سے تو وِلّو میں کہتا ہوں
ایسی منطق ایسی رمزیں
ایسا گوڑھا گیان بھلا کیسے سیکھا ہے؟
رونے کو بزدل لوگوں کی بات سمجھ کر
کائر کی اوقات سمجھ کر
مرد آدمی میں تو ساری عمر نہیں رو پایا وِلّو!
اسی لیے تو مرد آدمی .....
وِلّو مجھ سے روتے ہنستے پھر کہتی ہے
تم کھل کر ہنس سکے کہاں، رہے ہو!
روتے تو پھر ہنس بھی سکتے!!

قصہ نمبر ۳

اوپر اٹھنا، آسمان کو چھونے کی کوشش میں گرنا
کندھوں سے دو پنکھ باندھ کر
سورج تک اڑ سکنے کی بیکار سعی میں
گر کر اپنی جان گنوانا
گل مارٹین لوا کاش کی سرحد تک اونچا لے جانا
ستاروں کو
بادل کی اونچائی تک پہنچانے میں اک عمر گنوانا
..... وِلّو روتے ہنستے روتے یہ کہتی ہے
یہ ادنیٰ تم انسانوں کا شیوہ ہے
پیڑ گھنے چھتنار جڑیں پیوست کیے اوپر اٹھتے ہیں
لیکن اونچائی تک جا کر
اپنی شاخوں کو لٹکا کر
پھر دھرتی کو چھونے کی کوشش کرتے ہیں
میں بھی اپنی گھنی، گھنیری شاخیں بانہیں
دھرتی تک واپس پہنچا کر خوش ہوتی ہوں
میرے گر جانے کا کچھ امکان نہیں ہے!
سچ کہتی ہو!
رشک بھری نظروں سے اس کی جانب دیکھ کے
میں کہتا ہوں!!

ریشم کی قبر
(عائشہ امجد کے لیے)

یہ سارا ریشم بُنا تھا اس نے
مہین مخمل کے لمس جیسا
جسے چھوئیں تو کسی کے رخسار یاد آئیں
جو سات رنگوں کی سرسراتی دھنک سے ملتا تھا
سات سُر .... سرسوتی کی وینا کے تار سے جیسے پھوٹتے ہوں
یہ رنگ ہی تھے
کہ ریشمی تار و پود کا لمس تھا کہ جس نے
مجھے اسے چاہنے پہ مجبور کر دیا تھا
میں نرم ریشم چھوؤں
مگر وہ بدن نہ چھوؤں
جو سراپا گداز ریشم تھا
سات سُر تھا
دھنک کی لہراتی کیفیت تھا
یہ بات ممکن نہیں تھی مجھ سے!
یہ حادثہ میری چاہ کا تھا
کہ سانحہ اس کی ذات کا تھا
کہ رنگ قوسِ قزح کے قیدی تھے
سُر کبھی تار میں مقید تھے
لمس ریشم کے نرم تاگوں میں کھو گیا تھا
وہ اپنے مذہب کے، شخصیت کے، معاشرے کے
حصار اندر حصار، ابواب قفل در قفل بند کر کے
خود اپنی مرضی سے قید تھی
گانٹھ گانٹھ خود میں بندھی ہوئی تھی
وہ اپنے ریشم کے ڈھیر کو
اپنے گرد اک خول سا بنا کر
خود اپنے ریشم کی قبر میں دفن ہو گئی تھی
اسے وہاں سے نکالنا میرے بس سے باہر تھا
خود ہوئی تھی اسیر
خود ہی نکل بھی سکتی تھی
چاہتی تو!

قبولیت
"تتھاگت" نظموں (کل تعداد بتیس) میں سے ایک نظم

اور پھر ایسے ہوا آنند خالی ہاتھ لوٹا
اور کہا "بھگوان! اس نگری میں ایسا
ایک دولتمند بھی ہے، جس کو دولت سے کوئی رغبت نہیں ہے
اور سارا دھن جمیں بھکشا میں دینا چاہتا ہے
ہم تو خالی ہاتھ لوٹے ہیں، تتھاگت!

بدھ بولے "اس کا دینا فرض ہے لینا تمہارا
تم بھی کشکول آگے کو بڑھائے
اس کے دروازے پہ جاتے ہو تو اپنا فرض سمجھو
جو بھی مل جائے کھلے ماتھے سے لے لو
میری دریوزہ گری کی یہ حدیث آخری ہے"
گومگو کی کیفیت میں تھا ابھی آنند بولا
"یا مرشد
سونا چاندی تو فقط مایا ہے، اس سے بھکشوؤں کا کیا تعلق؟"
بدھ بولے
"دستِ دریوزہ گر و درویش خالی ہے اگر اپنی انا سے
تو اسے کیا خوف مایا سے، جو کل تک
دستِ حاتم میں تھی، لیکن آج اس کی
اپنی جھولی میں پڑی ہے
صاحبِ ثروت کی، حاتم کی سخاوت اس کی تشہیر انا ہے
اور تم اپنی انا تو ختم کر بیٹھے ہو، یہ تم جانتے ہو
اس لیے جو بھی ملے منظور کر لو"
..... جو ملے منظور کر لیں؟
..... ہاں، سبھی کچھ!
..... سونا چاندی اور دولت بھی، تتھاگت؟
..... ہاں سبھی کچھ!
..... اور بھکشا میں اگر عورت ملے تو؟
ہچکچائے
ایک لمحہ چپ رہے پھر ایک آہِ سرد بھر کر
زیرِ لب بولے "قبولیت کی کوئی حد نہیں ہے!"

آنند کے مکتوب سے اقتباسات

مکتوب الیہ

احمد ہمیش

گیان پرورودھن کی بات چھڑی گئی ہے تو یہ بھی سن لیجئے۔ ایک گھنٹہ پہلے تک میں یونیورسٹی میں تھا۔ آج کمپریٹو لٹریچر کے کورس میں جدید یورپی شاعری کا جزو پڑھاتے ہوئے ولندیزی Dutch شاعر ییک بریل Jacques Brel کی ایک نظم زیر بحث آئی۔ اس نظم کی ابتدائی سطریں (مصرعے نہیں!) ولندیزی زبان میں یہ ہیں۔ اپنی ٹائپ رائٹر پر لکھ رہا ہوں۔ (ییک بریل بھی میری طرح بدھ مت کی تعلیمات سے استفادہ کرتے ہیں)

Il y a deux sortes de temps
Y a le temps qui attend
Et le temps qui espere

(Jacques Brel)

ییک بریل کی ان سطروں کا انگریزی ترجمہ یہ ہے

There are two sorts of time
The time which waits
And time which hopes

میں نے اسٹوڈنٹس (طالبات اس کورس میں زیادہ ہیں) کو بتایا کہ مہاتما بدھ نے اپنے چیلے بھکشو آنند کے ایک سوال کے جواب میں کہا تھا۔ "وقت چلتے ہوئے تکان محسوس کرتا ہے اور تھک کر بیٹھ جاتا ہے۔ کچھ دیر ستانے کے بعد بھی وقت جب دوبارہ عازم سفر ہوتا ہے تو اس کے پاؤں تیزی سے چلتے ہیں۔ اس لئے گیان کی کھوج میں مصروف سفر کچھ صدیاں جیسے تھم رہتی ہیں، گھسٹتی ہوئی چلتی ہیں۔ تب ان کے بعد چوتھائی یا نصف صدی کا عرصہ ایسا آتا ہے جس میں کئی صدیوں کا سفر طے ہو جاتا ہے۔" جب میں نے انھیں بتایا کہ میری تتھا گت سلسلے کی پچیس ۲۵ نظموں میں سے ایک اس موضوع پر ہے تو انہوں نے اصرار کیا کہ میں اپنی نظم کو اردو سے انگریزی میں ترجمہ کر کے ییک بریل کی نظم کے مد مقابل رکھوں؟ تا کہ کلاس میں اس پر بحث ہو سکے۔

اب آئیں اس Cue سے بات شروع کریں اور اردو ادب کے حوالے سے ان برسوں میں وقت کی سست روی کو دیکھیں، جس میں اس نے 'انتظار' کیا ہے۔ آج سے چوتھائی صدی پیشتر علی گڑھ میں ہوئی آپ سے ملاقات کے دوران بھی اس بات کا ذکر آیا تھا اور 1964ء کے لگ بھگ بمبئی میں اختر الایمان سے ہوئی ایک گھنٹے کی بات چیت بھی اسی موضوع پر تھی۔ یہ ملاقات ناول نویس عادل رشید کے گھر میں ہوئی تھی۔ میں ساحر لدھیانوی کے اندھیری (بمبئی) والے گھر میں بطور مہمان کچھ دنوں کے لئے ٹھہرا ہوا تھا۔ عادل رشید اپنے کسی فلمی کام سے وہاں آئے اور مجھے اپنے ساتھ گھر لے گئے۔ اختر الایمان (خدا انہیں کروٹ کروٹ جنت نصیب کرے) ترقی پسندوں کے ساتھ چلتے ہوئے بھی ان سے کچھ ہٹ کر کھڑے تھے اور تخلیقی سطح پر بہت فعال تھے۔ نعرہ بازی سے انھیں نفرت تھی۔ جب میں نے کہا کہ 1935ء کے لگ بھگ اس بات کا اعادہ ہو چکا تھا کہ ن م راشد اور میرا جی نے جس قسم کی شاعری کو فروغ دیا تھا وہ اردو کے شعری ادب کو ایک ہی جست میں غزل کے اندھے کنوئیں سے نکال کر اس Mainstreem میں مدغم کر سکتی تھی، جس میں باقی دنیا کی ترقی یافتہ زبانوں کا شعری ادب بہہ رہا تھا تو ایسا کیوں نہیں ہوا؟ اختر الایمان نے دکھی سی مسکراہٹ کے ساتھ کہا تھا 'اگر ایسا ہو جاتا تو ترقی پسندوں کی دال روٹی کیسے چلتی!' "دال روٹی" سے ان کی مراد کچھ بھی ہو، یہ امر اس بات چیت میں واضح طور پر ابھر کر سامنے آیا تھا کہ اردو کے شعری ادب کے اس قافلے کو جو جدید راہوں پر چلنے کے لئے گامزن ہوا تھا، کچھ پڑاؤ طے کرنے کے بعد ہی ترقی پسند قزاقوں نے اغوا کر لیا اور لے جا کر پارٹی کے کمیون (Commune) میں بند کر دیا۔ کولہو کے بیل کی طرح "کمیون" کے اندر ہی چاروں طرف چکر لگاتے ہوئے چالیس برسوں تک اردو شاعر یہی سمجھتا رہا کہ وہ ترقی کی منزلیں طے کر رہا ہے۔ راشد اتنے بڑے شاعر تھے کہ انھیں Ezra Pound یا Stephen Spender کے مقابلے میں رکھا جا سکتا تھا لیکن وہ فیض احمد فیض کی طرح Poet's poet نہیں تھے۔ وہ ایک اسکول آف پوئٹری کی عمارت سازی نہیں کر سکے۔ اس لئے وہ شعری طور پر دیکھتے دیکھتے ہوئے (شاید دل برداشتہ ہو کر) اس منظرنامے سے کنارہ کش ہو گئے۔ یو این او میں اسائنمنٹ یا ایران کو ہجرت شاید ایک ذاتی مسئلہ بھی ہو، جس میں "روزی روٹی" کا مسئلہ بھی شامل ہو، لیکن اردو کے شعری ادب کے مورخ کے لئے یہ باور کرنا ناممکن نہیں ہے کہ اردو کا یہ Loner جو ادبی سیاست کے داؤ پیچ نہیں جانتا تھا، جس کے آگے پارٹی کے "کاڈر" اس کا اصول نبھانے کے لئے موجود نہیں تھے، جس کی نظموں کا روسی زبان یا دیگر مشرقی یورپ کی زبانوں میں ترجمہ نہیں ہو سکا تھا۔ جسے شاعر اعظم Poet's poet کے طور پر ایک رہنما تسلیم کرنے اور اس کے نقش قدم پر چلنے کے لئے شاعروں کی ایک پوری نسل اس لئے تیار نہیں تھی کہ اسے گمراہ کیا گیا تھا۔ یعنی جس کو اس کی زندگی ہی میں Ignore کرنے کی تحریک شروع ہو چکی تھی۔ بالآخر جیتے جی مر گیا۔ اور اس کے ساتھ ترقی یافتہ زبانوں کے دوش بدوش چلنے کا اردو شاعری کا وہ اعادہ بھی گہری نیند سو گیا، جو ان دو شاعروں کی شعری تخلیقات سے معرض وجود میں آیا تھا۔ میرا جی کو جنسی بے راہ روی کا شکار قرار دے کر پارٹی کے "کاڈر" کے پیچھے چلنے والوں نے ویسے ہی خارج از بحث بنا دیا تھا۔ راشد کے ساتھ ایک نہایت معقول طریقے سے 'نامعقولیت' کا سلوک کیا گیا۔ فیض کے ساتھ ایک ملاقات میں جو لندن میں ہوئی، انہوں نے میرے اس سوال پر سخت ناراضگی کا اظہار کیا اور کہا کہ راشد ایک نہایت اہم شاعر تھے اور انھیں کسی

سوچی سمجھی ہوئی اسکیم کے تحت اگنور نہیں کیا گیا۔ اگر وہ اگنور ہوئے بھی تو اس لئے کہ ان کی شاعری اردو کے شعری ادب کی کلاسیکی روایات کا نعم البدل نہیں بن سکی۔ اختر الایمان کا ذکر آیا ہے تو کچھ باتیں اور کی جائیں۔ ایک سچا کل وقتی فنکار، جو کبھی دنیا سے اپنی تخلیقی صلاحیت کے علاوہ، اپنے ذاتی تعلقات کی بناء پر اپنا خراج وصول کرتا رہا۔ اگر وہ بھی کسی وقت اس "کاؤ" کے پیش رو رہنماؤں سے ذاتی یا نظریاتی سطحوں پر تعلقات بگاڑ لیتا، تو اس کا بھی وہی حشر ہوتا، جو راشد کا ہوا۔ لیکن اختر الایمان راشد کی عظمت کے قائل تھے اور فیض کو دیگر شعراء کی طرح Deify کرنے کے لئے تیار نہیں تھے۔ بہر حال وہ اس بات کے لئے بھی راضی نہیں تھے کہ میں اپنی ملاقات میں فیض اور راشد کا موازنہ کروں۔ "یعنی موازنہ وہاں ہوتا ہے جہاں دونوں ایک ہی قبیل وقماش کے ہوں۔ راشد کی حیثیت فیض سے بالکل الگ ہے۔ اردو کے زیادہ قبول کرتی ہے اور آنے والا مورخ کے قبول دوام کی سند دیتا ہے یہ وقت ہی بتائے گا۔" ان کی یہ بات میرے ذہن میں آج بھی گونج رہی ہے۔ آج فیض کی موت کے کئی برسوں کے بعد تنقید کی گرفت فیض کی شاعری پر سخت ہونے کے امکان نظر آنے لگے ہیں، لیکن اب تک اردو ادب کی تاریخ کا بیان کرنے والے جو ہم عصر مورخ ہیں، اس بات سے کتراتے بھی ہیں اور گھبراتے بھی ہیں کہ فیض کو Re-evaluate کیا جائے۔ اور اگر کیا جائے تو راشد کے تقابلی تناظر میں یا اس تناظر میں پڑے بغیر ہی۔

مجھے اپنے بارے میں کچھ نہیں کہنا ہے۔ میں صرف عالمی Frame of reference میں اردو شاعری کی اس سچ اوقی کو دیکھتا ہوں کہ آج تک یعنی اکیسویں صدی کے دروازے پر دستک دیتے ہوئے بیسویں صدی کے آخری برسوں میں بھی، اردو کا نظم گو شاعر غزل کی روایت کے اس مکروہ اثر سے آزاد نہیں ہو سکا، کہ وہ اپنی نظموں میں Run on lines کے التزام کو قائم رکھ سکے۔ آخر ایسا کیوں ممکن نہیں ہے کہ اردو شاعر اپنی عادت ثانیہ Conditioned Reflex کو ترک کر سکے اور نظم کی "سطر" کو مصرع سمجھنے سے انحراف کرے۔ میں ان باتوں کو الگ الگ پیروں میں رکھ کر بھی تو دیکھ سکتا ہوں۔ (ایک) کیا مقفیٰ اور مسجع نظموں کی غنائیت اور نغمگی، حسن قافیہ کی سحرکاری اور بندش الفاظ میں نگینوں کی طرح جڑی ہوئی شوکت و رعنائی اس صنف کو "آزاد نظم" یا "نظم معریٰ" (نثری نظم نہیں) سے ممتاز نہیں بناتی ہے؟ (دو) کیا غزل کے روایتی Form-at سے مستعار اردو شاعروں کی یہ عادت ثانیہ کہ وہ نظم کی "سطر" کو بھی مصرع سمجھتے ہیں، اور ایسا کرنے سے وہ نظم کی آزادی یعنی اس کے مضمون اور اس کے شعری اظہار کی لسانی اور اسلوبیاتی تازہ کاری کی قربانی نہیں دیتے؟ اور (تین) کیا مقفیٰ اور یکساں طوالت کی سطروں پر مشتمل پابند نظموں میں یا ان آزاد اور معریٰ نظموں میں جن میں "سطر" "مصرع" کی صورت میں وارد ہوتی ہے اور Run on line کا التزام اس لئے ممکن نہیں ہے کہ "سطر" کے بیچ میں ایک جملے کے مکمل ہونے سے حسن شاعری کو ضرب پہنچتی ہے؟ ان امور کی قربانی نہیں دینی پڑتی، جو رمز و ایمائیت کی جمالیات سے عبارت ہوتے ہیں اور علامت و استعارہ کے حسین جھالروں والے پردے کے پیچھے نیم دروں نیم بروں حالت میں چھپے ہوتے ہیں؟

میں نے برسوں پہلے ان سوالوں کو اردو کے شعری ادب کے تاریخی سیاق و سباق میں رکھ کر دیکھنے کی کوشش کی تو سخت مایوسی ہوئی۔ راشد اور میرا جی یا ان کے ہم عصر شعراء سے پیشتر، یعنی انیسویں صدی کے آخر اور بیسویں صدی کی پہلی دو دہائیوں میں اردو کا شعری سرمایہ جن منطقوں میں متعلقہ لیبلوں کے ساتھ بند تھا، یعنی جن اصناف سخن پر مشتمل تھا۔ ان کے تناظر میں کوئی تقابلی مطالعہ ممکن ہی نہیں تھا اس لئے مجھے برصغیر سے باہر دیکھنا پڑا۔ یہ دیکھ کر حیرت ہوئی کہ سولہویں صدی میں ہی انگریزی اور دیگر یورپی زبانوں کے ڈراموں کے مکالمات میں (جو نظم میں مروج بحروں میں تقطیع کیے جا سکتے تھے) غیر مقفیٰ اور غیر مسجع، روز مرہ کی زبان سے مستعار شدہ لفظیات پر مشتمل اس صنف شعر کا رواج عام ہو گیا تھا۔ جسے "آزاد نظم" کہا جا سکتا ہے، اور جس میں فقرہ یا مضمون ایک سطر سے تجاوز کر کے دوسری سطر کے وسط تک یا اس سے بھی آگے دوسری سطر سے تیسری سطر تک بہتا چلا جاتا ہے۔ یہاں تک کہ کئی بار Iambic Pentameter میں ہر پورا ایک سطر دو کرداروں کے باہمی مکالمے کی دو سطروں میں تقسیم ہو کر اپنا بحر پورا کرتی ہے۔ انگریزی میں شیکسپیئر سے پہلے مارلو، بن جانسن اور للی (Marlowe) (Ben Jonson)(Lyly) کو یہ احساس یورپی شاعری کے خمیر سے ہی وراثت میں ملا تھا کہ ڈرامائی ضروریات کے پیش نظر سطروں کی طوالت کو توڑتے ہوئے، ایک کردار سے دوسرے کردار تک مکالمے کی ادائیگی میں ایک لسانی علت و معلول Linguistic Concatenation کا سلسلہ قائم کرنا ضروری ہے۔ پابند نظموں کی اصناف (مثلاً سانیٹ وغیرہ) سے کوئی بھی معانقہ نافروتنی کے بغیر بھی Imbaic Pentameter کے تقاضوں کو پورا کرتے ہوئے سطروں کو اس طرح توڑا جائے کہ ایک سطر کے آخری لفظ کے آخری حرف کی صوت دوسری سطر کے پہلے لفظ کے پہلے حرف کی صوت میں مدغم ہو کر آہنگ کو آگے بڑھا جائے۔

شیکسپیئر کی یہ سطریں شاید اس امر کو سمجھنے میں معاون ہیں۔

Helena What's his name?
Diana Monsieur Parollas
Helena O, I believe with him
In argument of praise, or to be worth
Of the great count himself, she's too mean
To have her name repeated-all her deserving
Is a reserved honesty, and that

براہِ راست

اردو ادب کی تنگ دامنی کا احساس اُس وقت شدید تر ہو جاتا ہے جب مسائل کا کوہِ گراں' بے دردی سے خواہشات کے آڑے در آتا ہے.....!ایک ایک لفظ' ایک ایک حرف سے نبرد آزمائی کے باوجود تدوین' طباعت اور ترسیل کے مراحل جابجا سنگِ راہ بن کر 'آپ کی کمتری جتلانے پر آمادہ رہتے ہیں.....!!

زیرِ نظر شمارے کی نسبت خواہشات کی انتہاؤں کو محدود تر وسائل کی جکڑ بندی نے اُس قدر سنورنے نکھرنے نہیں دیا جس قدر ڈاکٹر ستیہ پال آنند کی بلند قامتی اور بلند آہنگی متقاضی تھی اس کے باوجود آپ اور ڈاکٹر صاحب محترم اس ادنیٰ کاوش کو کسی لائق گردانیں تو یہ "اردو ادب" کی روحِ علیل کے لئے مسیحائی سے کم نہ ہوگا.....!!!

گلزار جاوید

☆ والدین کی عادات و خصلات' پیشہ اور آپ کی تربیت میں اُن کا رول' کچھ روشنی بھائی بہنوں' اساتذہ اور قریبی دوستوں پر بھی ڈالیے؟

☆☆ میری تربیت میں زیادہ رول میری ماں کا ہے۔ والد پرانے میٹرکولیٹ تھے (۱۹۱۸ء) اور ملازمت کے سلسلے میں نوشہرہ چھاؤنی میں مقیم تھے۔ میری زندگی کے پہلے دس برس (۱۹۳۱ء سے ۱۹۴۱ء تک) میرے آبائی گاؤں کوٹ سارنگ میں گزرے۔ میری ماں سکھ خاتون تھیں اور جلہ گنگ کے ایک متمول گھرانے سے تعلق رکھتی تھیں۔ مڈل اسکول تک پڑھی لکھی تھیں۔ گھر کے دالان میں' جسے ہم "ترنجن" کہتے تھے' گاؤں کی ہندو مسلمان عورتوں کو اکٹھا کر کے انہیں بتایا کرتی تھیں کہ زمین چپٹی نہیں' گول ہے' گھڑی وقت بتاتی ہے لیکن یہ وقت سب جگہ ایک جیسا نہیں ہوتا' دوسرے ملکوں میں' خصوصی طور پر ولایت میں الگ ہوتا ہے' سورج زمین کے گرد نہیں گھومتا' زمین سورج کے گرد گھومتی ہے' وغیرہ وغیرہ اور اَن پڑھ عورتیں منہ کھول کر' حیرت سے آنکھیں پھاڑے یہ باتیں سنتیں اور میری ماں کو سلائی کی مشین پر کام کرتے ہوئے دیکھتی رہتیں۔ میں اور میری چھوٹی بہن بھی عورتوں کے اس جھرمٹ کے کنارے پر بیٹھ کر یہ باتیں سنتے اور سمجھنے کی کوشش کرتے۔ میرا چھوٹا بھائی گلی میں کھیلتا رہتا..... اب جب لوٹ کر دیکھتا ہوں تو "ہونہار بروا کے چکنے چکنے پات" کے بمصداق' میری چھوٹی بہن انڈیا میں ایک بڑے گورنمنٹ کالج کی پرنسپل ریٹائر ہوئی ہیں اور میں ابھی تک پڑھا رہا ہوں لیکن میرے چھوٹے بھائی صاحب میٹرک کے بعد نہیں پڑھ سکے اور کاروبار میں ہی کروڑوں کے مالک ہو گئے..... میری تربیت میں میرے والد کا رول صفر کے برابر ہے۔ ہم لوگ کوٹ سارنگ چھوڑنے کے بعد صرف چار پانچ برس تک ان کے ساتھ نوشہرہ چھاؤنی اور راولپنڈی میں رہے۔ پھر تقسیمِ وطن کے وقت وہ قتل ہوئے اور ہم لوگ بے سہارا اور بے یار و مددگار انڈیا پہنچے..... میرے اساتذہ میں مجھے اپنے گاؤں کے استاد رستم علی خان صاحب یاد ہیں جن سے میں نے اردو سیکھی۔ نوشہرہ چھاؤنی میں کچھ استاد صاحبان یاد ہیں جو شاعری کرتے تھے۔ ان میں ایک کہو تے "کنا دگھام" تھا' اور تخلص کرتے تھے۔ ایک پرویز صاحب تھے۔ میرے ہم جماعتوں میں یونس صابر تھے۔ جو اب پشاور میں مقیم ہیں اور ان سے رابطہ ہے۔ اس بار پاکستان یاترا کے وقت میں پشاور میں انہی کا مہمان رہا۔ راولپنڈی میں پروفیسر تلوک چند محروم سے ملنے جایا کرتا تھا۔ مشن ہائی اسکول راولپنڈی میں کوئی خاص نام یاد نہیں ہے جسے یاد رکھا جا سکتا۔ میرے بعد قبول کے دوستوں میں پریم وار برٹنی' کرشن ادیب اور بیر اندر سوز تھے۔ تینوں اب نہیں ہیں۔

☆ آپ کی شادی کب' کہاں اور کس طریقے پر ہوئی؟ بھابی صاحبہ کا فہمِ ادب' بالخصوص آپ کی تخلیقات اور آپ کی مصروفیات کی نسبت اُن کا برتاؤ کیسا ہے؟

☆☆ میری شادی ۱۹۵۷ء میں ہوئی۔ میں ابھی ایم اے انگلش کا طالب علم تھا۔ ۱۹۴۷ء میں میٹرک کے بعد دیگر میں نے چھوٹی موٹی نوکریاں کرتے ہوئے ادب سے روپیہ کماتے ہوئے اور بیوہ ماں کے ساتھ گھر کا کنبہ چلاتے ہوئے بھی اپنی تعلیم جاری رکھی تھی۔ جس پبلشر کے ہاں میں ہندی اشاعت کا کام سنبھالتا تھا اس کے ہاں آنے جانے والوں میں ان کے ایک دوست تھے۔ جنہیں شاید میں ان کی چھوٹی بہن کے لیے موزوں لگا تھا۔ رشتہ طے تو میری ماتا جی اور میری ہونے والی بیوی کے بھائی صاحب کے بیچ بات چیت سے ہوا تھا لیکن مجھے لڑکی پسند تھی۔ اس لیے ہماری منگنی اور شادی پرانے طریقے سے ہوئی۔ جس میں بارات' باجہ' گھوڑی' پھلجڑی سب کچھ شامل تھا۔ ایک خاص بات یہ تھی کہ بیر اندر سوز نے سہروں کا ایک کتابچہ ترتیب دیا تھا۔ جس میں ساحر لدھیانوی کی ایک نظم بھی شامل تھی۔ دیگر سہرا نویسوں میں نریش کمار شاد' پریم وار برٹنی' بیر اندر سوز شامل تھے۔ کچھ ہندی کے شعرا بھی تھے۔ میرا اپنا تحریر کردہ ایک سہرا بھی تھا لیکن یہ بھی آزاد نظموں کے فارمیٹ میں تھے۔ اگر میں بھولتا نہیں تو

ساحر کے سہرے کی ابتدائی سطریں کچھ یوں تھیں۔

خوب ہے چہرے کی تزئین کو سہرا لیکن
کیا ضروری ہے کہ سہرا ہی بندھے دولہا کے؟
اور بھی لاکھ طریقے ہیں سنورنے کے لیے!

میں نے اپنا سہرا جو خود لکھا تھا وہ بھی "ترقی پسند" قدروں کی حمایت لیے ہوئے تھا۔ میری بیوی کا نام "پروملا" ہے۔ جب تک میں ہندی میں لکھتا رہا (اور اس سے خاطر خواہ آمدنی ہوتی رہی!) وہ میری تخلیقات اور مصروفیات کے تئیں زیادہ دل برداشتہ نہیں رہیں لیکن بہر کیف انھیں ادب سے دلچسپی بہت کم ہے۔ گھر میں آئے ہوئے میرے دوستوں کا استقبال کرتی ہیں۔ باتوں میں مصروف ہوتی ہیں۔ چائے پانی سے تواضع کرتی ہیں۔ میرے ساتھ مشاعروں میں جانا پسند کرتی ہیں لیکن اس سلسلے میں مجھے بزنش کا رشاد کے ایک قطعے کی آخری دو سطریں یاد آ گئیں۔

لیکن اے دوست تو یہ مت بھولو
بیویاں دوستوں کی دشمن ہیں!

☆ آنند صاحب! کچھ اطلاع اولاد کی بابت دیجیے۔ ادب تو نئی نسل کی ادب سے ان کی دلچسپی، تعلیم اور پیشہ ور مصروفیات کی بابت بھی بتائیے؟

☆☆ میرے تین بچے ہیں دو لڑکے اور ایک لڑکی۔ تینوں امریکن یونیورسٹیوں سے پوسٹ گریجویٹ ڈگری یافتہ ہیں اور نہایت اچھی پوزیشن پر ہیں۔ امریکا کی آبادی کا صرف ڈیڑھ فیصد حصہ ایک لاکھ ڈالر سالانہ سے اوپر آمدنی رکھتا ہے یہ اس زمرے میں آتے ہیں لیکن نئی نسل ادب سے دلچسپی؟ اس نسل میں تو "نہیں" کے برابر ہے۔ ہاں تیسری نسل میں ایک نواسی اور ایک پوتی کے ہاں اس کے حوصلہ افزا آثار دکھائی دے رہے ہیں۔

☆ ننھیال کی طرف سے آپ سکھ، ددھیال کی طرف سے ہندو ہیں۔ آپ کے گھر میں کس مذہب کی پیروی کی جاتی تھی نیز آپ کا رجحان کس طرف زیادہ تھا اور آپ کس قدر مذہبی انسان ہیں یا آپ کے خیال میں کسی روشن دماغ کے لئے مذہب کی اہمیت کس قدر ہونی چاہیے؟

☆☆ ہمارے گھر میں سکھ ریتی رواج غالب تھے۔ میں بچپن میں باقاعدگی کے ساتھ ماں کی انگلی پکڑ کر گوردوارے جایا کرتا تھا۔ کوٹ سارنگ میں اس کو "دھرم سال" کہتے تھے۔ ہندو کون ہیں؟ سکھ کون ہیں؟ یہ تمیز نہیں تھی۔ ہندو کو "سہا" کہا جاتا تھا۔ میں نے پہلی بار لفظ "ہندو" تیرہ برس کی عمر میں راولپنڈی آکر سنا۔ میرا اپنا رجحان؟ ظاہر ہے یہ سکھ ازم کی طرف زیادہ تھا۔ میں روزانہ صبح نہا دھو کر "جپ جی صاحب" کا پاٹھ کیا کرتا تھا۔ پھر آہستہ آہستہ ہندو ازم خصوصی طور پر گیتا کے فلسفے سے واقف ہوا۔ اسلام کو سمجھنے کی کوشش کی یہاں تک کہ دسویں جماعت تک "ترجمان القرآن" کا نسخہ خرید لیا اور اسکول کی کتابوں کے ساتھ رکھ دیا۔ مشن ہائی اسکول میں پڑھنے کے باوجود عیسائی مذہب کی طرف رغبت نہیں ہوئی..... میں بے حد مذہبی انسان ہوں، لیکن میرا مذہب ان Codified مذہبوں سے مختلف ہے، جنہیں ہم ایک Given Discipline تسلیم کرکے "قبول" کر لیتے ہیں..... جی نہیں "روشن دماغ ہونے" اور "مذہب کی اہمیت کو تسلیم کرنے" میں بھی قدر مشترک ہے۔ دونوں میں اختلاف اگر ہے تو مذہب کے خارجی "فعل" کا ہے، اندرونی "قول" کا نہیں!

☆ قرآن مجید سے آپ کا تعارف اور قرب کس جذبہ اور تحریک پر ہوا؟ آپ کی زندگی میں قرآن مجید کے اثرات کو کن الفاظ میں بیان کیا جا سکتا ہے؟

☆☆ میرے والد اپنے والد کے اکلوتے بیٹے تھے۔ کوئی اور بھائی بہن نہیں تھا لیکن ہم نے بچپن سے ہی اپنی ایک پھوپی کو دیکھا۔ اسکول سے لوٹتے ہوئے راستے میں اس کا گھر پڑتا تھا۔ اس کے آنگن میں بستہ پھینک کر چھاچھ کا بھرا ہوا گلاس پی کر میں کھیلنے لگ جاتا اور شام پڑنے پر اس کی ڈانٹ سن کر ہی مجھے ہوش آتا کہ مجھے اپنے گھر بھی جانا ہے۔ وہ کہتی۔ "اللہ کی مار اس گلی ڈنڈے پر! کھوتے! اب گھر بھی جا! تیری ماں پریشان ہوگی! قرآن مجید میں آیا ہے جو بچہ ماں کا دل دکھاتا ہے، اس کی جگہ نہ عرش پر ہے، نہ فرش پر!" ایک بار میری کتاب کھیل کھیل میں پھٹ گئی تو میں نے کہا "ماں سے کہہ دوں گا کہ گم ہوگئی اور راستے میں پھینک دوں گا" تو اس نے کہا "لاحول! قرآن مجید میں آیا ہے، جھوٹ بولنے والا کاذب اور کافر ہوتا ہے!" "قرآن مجید میں یہ آیا ہے، قرآن مجید میں یہ آیا ہے..... قرآن مجید کیا ہے اور اس میں کس نے یہ ساری باتیں لکھی ہیں؟ آٹھ نو برس کے بچے کے ذہن میں شاید یہ سوال اس کے جانے بوجھے بغیر اٹھتے رہے۔ ایک بار ماں سے پوچھا بھی تو اس نے کہا "تو نے اپنی پھوپی سے نہیں پوچھا؟" میں نے کہا "نہیں" تو ماں نے کہا "جیسے گورو گرنتھ صاحب میں اچھی باتیں لکھی گئی ہیں، قرآن مجید اس سے بھی پرانی کتاب ہے، جس میں خدا نے کیا کہا ہے وہ سب کچھ لکھا گیا ہے"..... دس گیارہ برس کی عمر میں پہلی بار پتا چلا کہ ہماری پھوپی تو مسلمان ہے اس لیے وہ گوردوارے نہیں جاتی اور ہماری ماں سکھ ہے اس لیے وہ قرآن گھر میں نہیں رکھتی۔ باپ کی منہ بولی بہن مسلمان ہے جسے ماں نے ہمیشہ اپنے خاوند کی بڑی بہن ہونے کی عزت دی ہے۔ یہ بات مجھے ۱۹۴۷ء میں راولپنڈی میں ہونے والے فسادات کے دوران زیادہ شدت سے محسوس ہوئی..... بہر حال جیسے میں نے عرض کیا ۱۹۴۷ء تک میں "ترجمان القرآن" خرید چکا تھا۔ پنڈی میں جس گھر میں یہ مقدس کتاب دیگر سامان کے ساتھ رہ گئی وہاں لوٹ مار کرنے والوں کو بھی سخت حیرانی ہوئی ہوگی..... قرآن مجید کے ساتھ اس تعارف اور قرب میں قرآن مجید کی تعلیمات کو "سمجھنے" کی تحریک کا دخل زیادہ ہے۔ میں نے کوشش کی ہے کہ ان کو سمجھ کر ان پر "عمل پیرا" ہونے کی سعادت حاصل کروں۔

☆ آخری بار کالو اور ڈبا سے کب ملاقات ہوئی اور اُن کے احساسات کیا تھے؟ اس کے علاوہ جن دیگر لوگوں کے لئے آپ نے نظم کی میں بہت کچھ بعد میں اُن کا کیا تاثر تھا خاص کر آپ کی بڑی ہمشیرہ صاحبہ کا؟

☆☆ کالو اور ڈبا وقت کی دھند میں کھو گئے۔ نہ معلوم وہ بیچ بچا کر اٹھایا پیچھے بھی یا نہیں۔ بہر حال اُن کے بارے میں کچھ علم نہیں کہ کہاں ہیں۔ کم سنی کے دنوں میں کہے گئے "بیت" "کچھ" "بے" تھے، جنہیں میں گایا بھی کرتا تھا۔ میری بڑی بہن جو آج کل آگرہ چھاؤنی میں ہیں، آج بھی بہت کہتی ہیں۔ انہیں میرے سے بھی کچھ بہت شاید یاد ہوں۔

☆ آپ فرماتے ہیں کہ میں نے ہجرت نہیں کی جب کہ آپ کے تمام اعمال میں کوٹ سارنگ، لدھیانہ، جالندھر، دلی، چنڈی گڑھ کے حوالے سے بہت ساری ہجرتیں درج ہیں۔ معاملہ جرم اور مجرم سے مماثل تو نہیں کہ ایک جرم کے بعد جس طرح مجرم کا حجاب کھل جاتا ہے اسی طرح ایک ہجرت کے بعد......؟

☆☆ جب میں کہتا ہوں میں نے ہجرت نہیں کی، تو میں ہجرت کے کانسیپٹ کو اس کے لغوی معانی میں استعمال کرتا ہوں یعنی ایک مقام سے مستقل طور پر دوسرے مقام کو روانگی، وہاں پر رہائش پذیر ہونا اور پھر وہیں کا ہو رہنا۔ جن ہجرتوں کا آپ نے ذکر کیا ہے، ان میں اگر آپ درس وتدریس کے سلسلے میں انگلستان، کینیڈا، امریکا اور سعودی عرب میں کئی برسوں کا قیام بھی گن دیں تو پھر ہجرت ہجرت ہی کہاں رہتی، ایک ایسا سفر نہ بن جاتا جو ہر پڑاؤ کو منزل سمجھ لیتا ہے اور تھوڑے سستانے کے بعد آگے بڑھ جاتا ہے؟ میری ایک نظم "راستہ اور میں" کی آخری سطریں یہ ہیں:

راستہ پاؤں کے تلووں سے لپٹ کر رونے لگتا ہے.....
"چلو ہمت نہ ہارو..... میں تمہارے ساتھ ہوں، دونوں چلیں گے!"

راستہ اور میں ابھی تک ہم سفر ہیں!

☆ ہجرت کے ساتھ سے اردو ادب کو منٹو، ساحر، بیدی، کرشن، بلونت، جوگندر پال، ستیہ پال آنند جیسے عالمی پایہ کے قلمکار دستیاب ہوئے۔ آپ اسے ادب بالخصوص اردو ادب کے لئے نیک ہیڈ فال کے کس پیمانے سے تشبیہ دیں گے اور کیا اردو ادب بڑے قلمکاروں کی نئی کھیپ کے لئے پھر سے کسی بڑے سانحے کی راہ تو نہیں تک رہا......؟

☆☆ ہجرت میں بہت کچھ چھوٹ جاتا ہے لیکن جو رہ جاتا ہے وہ اس سے کہیں زیادہ ہوتا ہے جو چھوٹتا ہے۔ یعنی آپ جس گھڑی بھی ہجرت کے سفر پر گھر کی دہلیز سے پاؤں نکالتے ہیں، اپنی آنکھیں نکال کر اپنی دہلیز پر نصب کر دیتے ہیں اور آنے والے برسوں میں جب بھی اپنی اندھی آنکھوں سے لوٹ کر دیکھتے ہیں تو یہ آنکھیں جلتی ہوئی شمعوں کی طرح آپ کو دکھائی دیتی ہیں۔ یہ Nostalgia کا کرشمہ ہے۔ میری کوٹ سارنگ کے زمرے کی ایک درجن نظمیں آج کی اندھی آنکھوں سے ان جلتی ہوئی شمعوں کو وقت اور فاصلے کی دوری سے دیکھ کر لکھی گئی ہیں۔ ان میں سے کچھ نظمیں میرے انگریزی شعری مجموعے Good bye' India & other Poems میں شامل ہیں (مطبوعہ نیویارک ۱۹۸۸ء) اس کے بارے میں ایک ریویو میں کارل ہیملٹن نے لکھا تھا۔

These poems are a category apart, because in them the poet breathes in two time zones at the same time.

آپ کے آخری سوال کے جواب میں یہی لکھنے پر اکتفا کروں گا کہ جن بھی بڑے قلمکاروں کے بیٹے بیٹیاں امریکا یا کینیڈا میں گرین کارڈ یا شہریت لے چکے ہیں، ان کا یہاں آکر آخری عمر میں بس جانا اگر یہ ہے کوئی چندا سنگھ ہوں یا حمایت علی شاعر یا کچھ اور دوسرے..... میرے دل میں ایک ہوک اٹھتی ہے، جب فون پر ڈاکٹر گیان چند جین مجھے بتاتے ہیں کہ ہفتوں گذر جاتے ہیں اور اردو ادب کے بارے میں کسی سے بات چیت نہیں ہوتی۔

☆ آپ جیسے پڑھے لکھے روشن دماغ اپنی صلاحیتوں کو چند ٹکوں کے عوض غیروں کو فروخت کیوں کرنے لگتے ہیں۔ کیوں اپنے لوگ، اپنے گرد و پیش کو اس سے مستفیض نہیں کرتے۔ کون سی چیز آپ کو اپنے کھیت کھلیان، اپنے گھر بار سے دور رکھے ہوئے ہے؟

☆☆ سچی اور کھری بات تو یہ ہے کہ اس سوال کا جواب میرے پاس نہیں ہے۔ مجھے انڈیا میں ہی رہنا چاہئے تھا، لیکن میری بیگم بضد تھیں کہ بڑھاپے میں بچوں کے قریب رہنا چاہئے۔ میرے تینوں بچے بہتر مستقبل کی تلاش میں پہلے اعلیٰ تعلیم کے لیے اور پھر روزی روٹی کے لیے یہاں آ کر یہیں بس گئے تھے اس لیے مجھے سر تسلیم خم کرنا پڑا۔

☆ سچی اور حقیقی تخلیق میں مشاہدات و تجربات کے علاوہ دل اور دماغ کا استعمال کس تناسب سے ہوا کرتا ہے یا آپ کے خیال میں ہونا چاہئے۔ آپ کے ہاں تخلیقی سوتوں کی روانی اور اُن کے تسلسل کا ماخذ کیا ہے؟

☆☆ حساب یا الجبرے کے کسی فارمولے کی طرح یعنی دو جمع دو = چار کے تناسب سے تو دل اور دماغ کی شرح کو نہیں سمجھا جا سکتا لیکن یہ بات اپنی جگہ درست ہے کہ کچھ اہل قلم کے ہاں دل (رومانی جذبہ، جوش، ولولہ، باطنی، احساساتی، جبلی، وجدانی محسوسات) اور کچھ کے ہاں دماغ (فراست، ژرف نگاہی، دانائی، ذکاوت، ادراک وغیرہ) دوسرے کی نسبت سے زیادہ پایا جاتا ہے۔ میرے خیال میں مشاہدات اور تجربات وہ سہاگہ ہیں جو اصلی سونے یا دل سے اٹھتے ہوئے

تخلیقی سوتوں کے رنگ کو چکاتے ہیں۔ روانی اور تسلسل بند ہو جاتے ہیں۔ آپ ان پر پابندی بھی نہیں لگا سکتے اور انہیں گھیر کر اپنے قابو میں بھی نہیں لا سکتے کہ جب چاہا قلم اٹھایا۔

☆ ابتدا آپ کی اردو شاعری سے ہوئی، ہندی کی جانب کب اور کس طور توجہ فرمائی نیز نثر کے کوچے میں کس تحریک پر تشریف آوری ہوئی اور پہلی بار کس زبان میں کس مزاج کی تخلیق وجود میں آئی؟

☆☆ ابتدا یقیناً اردو شاعری سے ہوئی لیکن اردو میں ہی افسانہ نگاری کا سلسلہ ۱۹۵۰ء کے لگ بھگ شروع ہو چکا تھا۔ ۱۹۵۵ء تک پہنچتے پہنچتے مجھے 'شمع' دلی سے ایک صد روپے فی افسانہ معاوضہ ملا کرتا تھا۔ جو اس وقت ایک دفتری بابو کی ایک ماہ کی پگار سے بھی زیادہ تھا۔ بیسویں صدی سے بھی پینتیس چالیس روپے مل جاتے تھے لیکن مجھے گھر کا خرچ، ایک بیوہ ماں اور دو چھوٹے بہن بھائی کا خرچ بمعہ پڑھائی جاری رکھنے کے لیے وقت اور روپیہ..... سب کچھ درکار تھا۔ ہندی میں یہ سب کچھ میسر تھا اس لیے ۱۹۵۸ء تک میری پانچ کتابیں ہندی میں چھپ چکی تھیں، جن میں دو ناول تھے۔ نثر میں لکھنا اس لیے ضروری تھا کہ اردو ہندی دونوں میں شعری تخلیق کا معاوضہ نہیں ملتا تھا۔ ہندی سے ایک بار پھر اردو کی طرف لوٹ آنے کی سب سے بڑی وجہ میری معاشی مجبوریوں سے رہائی تھی کیونکہ تب تک میں پہلے کالج میں اور پھر یونیورسٹی میں ملازمت پا چکا تھا اور چہ آنکہ اردو میں تب تک رسالوں سے معاوضہ ملنا تو در کنار، کتابیں بھی اپنے خرچ پر چھپتی تھیں میں اپنے first love یعنی اردو کی طرف لوٹ آیا۔ دوسری وجہ آنجہانی ہیرانند سوز کی life long رفاقت تھی۔ جو صبح و شام مجھے تلقین کیا کرتا تھا کہ میرا ذہنی جھکاؤ شاعری میں اردو کی طرف ہے اور مجھے اپنی قدرتی صلاحیتوں کو ضائع نہیں کرنا چاہیے۔

☆ سریندر پرکاش صاحب کی اس رائے کے بارے میں آپ کیا کہیں گے "ستیہ پال آنند خالص اردو میں لکھتے تو کرشن چندر سے بڑے لکھاری ہوتے......! ایک رائے یہ بھی ہے کہ آپ اردو کے مستقبل سے مایوس ہو کر ہندی کی جانب رجوع کر گئے.........!

☆☆ ۱۹۴۸ء سے ۱۹۵۳ء تک کے پانچ برسوں میں سریندر پرکاش لدھیانہ میں رہے۔ تب یہ بالکل نہیں لکھتے تھے اور اپنے ماموں کی سوڈا واٹر فیکٹری پر کام کرتے تھے۔ شام کو فارغ ہونے پر یہ ہم لوگوں، یعنی ہیرانند سوز، کرشن ادیب وغیرہ دوستوں کی محفل میں آ بیٹھتے۔ ہمارے افسانے سنتے نظمیں سنتے لیکن سوائے فحش اشعار سنانے کے اور کرشن چندر سے لے کر حاضرین محفل تک سبھی کو اپنے مغلظات سے محظوظ کرنے کے اور کچھ نہیں کرتے تھے۔ دلی اور بمبئی جانے کے بعد جب وہاں یہ کھل کھیلے اور کرشن چندر وغیرہ بڑے لکھاریوں کو اپنا تختۂ مشق بنایا تو شاید انہیں کسی ایسا ہی کی ضرورت پیش آئی جس کا موازنہ کرشن چندر سے کر کے اسے ہیچ ثابت کر سکیں.....تحقیق، سریندر پرکاش صاحب کی جو رائے آپ نے اوپر لکھی ہے (اور جس کے بارے میں مہندر ناتھ اور ناول نگار عادل رشید دونوں کی کانوں سنی شہادت چھپ چکی ہے) صرف سریندر پرکاش صاحب کا مطمح نظر پیش کرتی ہے۔ جو کرشن چندر کو ذلیل ثابت کرنے کے لیے ہے۔ اس سے میری بڑائی مقصود نہیں ہے۔ میرا کرشن چندر سے موازنہ خود میں ہی ایک irrelevant factor ہے۔ میں اردو کو چھوڑ کر ہندی کی طرف خاطر خواہ آمدنی کے لیے راغب ہوا۔ جب مجھے یہ آمدنی پروفیسر کے طور پر ایک معقول تنخواہ سے ہونے لگی تو میں اردو میں لوٹ آیا۔

☆ کچھ لوگوں کا خیال ہے کہ آپ بنیادی طور پر ہندی کے کوی ہیں۔ اردو کے قاری کو ہندو مائتھالوجی سے متعارف کرانے کی خواہش نے آپ کو اردو میں نظمیں کہنے پر مجبور کیا......!

☆☆ سراسر غلط ہے۔ اگر ایسا ہوتا تو میری کویتاؤں کی کتابیں ہندی میں شائع ہوتیں۔ ایسا نہیں ہوا۔ میں نے ہندی میں کچھ غزلیں ضرور لکھی ہیں۔ ہندی میں کویتاؤں کی گنتی ایک درجن سے اوپر نہیں ہے۔ چہ آنکہ پنجابی میں غزلیں، نظموں اور قطعات کے دو مجموعے ہیں۔ چونکہ اردو کا قاری ہندو مائتھالوجی سے کما حقہ تو کیا بنیادی طور پر بھی آگاہ نہیں ہے، اس لیے اسے پوری کتاب میں ایک درجن حوالے بھی گنتی میں زیادہ لگتے ہیں، چہ آنکہ اسی کتاب میں پچاس حوالے جو اردو کے مروجہ ذخائر کی دین ہیں، اسے معمول کے مطابق محسوس ہوتے ہیں۔ میں نے عیسائی مذہب کی، اور اس سے بھی پیشتر یونانی اور روما ئے قدیم کی تہذیب کی مائتھالوجی کو بھی کھنگالا ہے، اور شاید ہندو مائتھالوجی سے کچھ زیادہ ہی یہ حوالے میری نظموں میں موجود ہیں۔ ہاں یہ ضرور کہا جا سکتا ہے کہ میں نے مشرق وسطیٰ اور اسلامی sources پر ہی اکتفا نہیں کیا۔

☆ ایک زمانہ میں آپ نہ صرف اردو غزل کے پر جوش حامی تھے بلکہ ہندی میں بھی غزل کہنے اور کہلوانے میں سرگرم نظر آتے تھے۔ اب آپ اردو غزل سے تائب اور کسی قدر مخالف ہو گئے ہیں.....!

☆☆ آپ نے ٹھیک فرمایا کہ میں غزل سے نہ صرف تائب، بلکہ جس tonnage کے حساب سے یہ لکھی جا رہی ہے، دل برداشتہ ہو گیا ہوں لیکن یہ کہنا صحیح نہیں ہے کہ میں "غزل کا پر جوش حامی" تھا۔ کنور مہندر سنگھ بیدی جن مشاعروں کی نظامت کرتے تھے، ان میں شعرا حضرات اور خواتین صرف غزلیات یا کچھ قطعات اور رباعیات پڑھتے تھے، لیکن صرف مجھے یہ دعوت دی جاتی تھی کہ میں نظمیں پڑھوں۔ بلکہ کنور صاحب خود میرا تعارف کرواتے ہوئے کہتے تھے "یہ نوجوان اردو میں کیٹس یا شیلے کا ہم پلہ آج تو نہیں، لیکن کبھی ضرور بن کر دکھائے گا۔ اس کی نظمیں عصری حسیت کی نمائندگی کرتی ہیں۔" میں نے

ہندی میں غزلیں کہیں اور کہلوائیں لیکن وہ گل و بلبل لب و رخسار اور بجری کیا بری سفر یا آشیاں و صیاد کے استعاروں سے پاک ہیں۔ تین اشعار دیکھیے۔

بھرے بزے میلے میں گم تھے کس کے سہارے بھول گئے
کس کی انگلی تھی میں تھمی ہم بے چارے بھول گئے

جیون کی جب شام ہوئی تو سوچا گھر بھی ہو آئیں
کتنے دن جیون کے تھے اور کہاں گزارے بھول گئے

بڑ گئے اپنی جان کے لالے کیسے تیرے تھے ہم بھی
اک ناگن کو گلے لگایا آخر سارے بھول گئے

☆ اردو کا شعری ادب فارسی اور عربی کی غلامی کا طوق (بقول آپ کے) اتار پھینکے تو کم از کم باقی کیا بچ پائے گا؟

☆☆ بہت کچھ! لیکن اس کے لیے تو ذکر کرنا پڑے گا۔ جس بحث مند اوبی امتزاج کی شروعات امیر خسرو سے ہوئی (گوری سووے سیج پر مکھ پر ڈارے کیس... چل خسرو گھر اپنے سانجھ بھئی چہوں دیس) وہ آج تک پہنچتے پہنچتے مسخ ہو گیا۔ یہاں تک کہ ادبی اثر کات کی فہرست میں وہ لوک کہاوتیں (عوامی مکالمے) اور روزمرہ بھی درج کر لیا گیا جس کا ایک حصہ فارسی تھا اور ایک ہندوستانی (مثلاً ”گڑ گڑا“)..... اس کے علاوہ اردو نے اپنے گردو پیش کے علاقائی زبانوں کے ادب کو (پاکستان میں پنجابی، پشتو، بلوچی، سندھی وغیرہ) اور ہندوستان میں اٹھارہ زبانوں کے ادب کو (کچھ زبانوں کا ادب اردو سے کہیں زیادہ ترقی یافتہ تھا!) قابل اعتنا نہیں سمجھا۔ کیا وہ وقت نہیں آیا کہ یہ سوقیانہ رویہ اب ختم ہو جانا چاہیے؟..... ایک اور قابل افسوس بات یہ ہے کہ جو عربی اور فارسی ہم اپنے کو دمز میں پڑھاتے ہیں اور جن عربی اور فارسی محاوروں کو یا حرف و نحو کے مطابق عذب البیانی یا قواعدی اور تحریری طریقوں سے ہم کلاسیکی اور نیم کلاسیکی شعرا سے مستعار اصطلاحات یا طرز کلام کو اردو میں فہم الملت بنا کر پیش کرتے ہیں وہ ایران اور عرب ممالک میں کب کا پیچھے رہ گیا ہے ہم ابھی تک اس سے چپکے بیٹھے ہیں.....

☆ اگر آپ کا یہ استدلال تسلیم کر لیا جائے کہ غزل غیر تہذیب یافتہ صنف سخن ہے تو پھر ایک طرح سے میر، غالب، داغ، حسرت، جگر، امیر مینائی، شیفتہ، فراق سب کی یہ سر نگی بلکہ توہین تصور ہو گی.....!

☆☆ پہلی بات تو یہ ہے کہ میں نے یہ کبھی نہیں کہا کہ غزل ”غیر تہذیب یافتہ صنف سخن“ ہے۔ کلیم الدین احمد نے اپنے ایک مضمون میں یہ ضرور کہا تھا کہ غزل ”نیم وحشی“ صنف سخن ہے۔ میں نے منظور حسین صاحب کے ساتھ اپنے ایک انٹرویو میں کلیم الدین احمد کے حوالے سے ایک سوال کے جواب میں کہا تھا کہ غزل ”نیم تہذیب یافتہ“ صنف سخن ہے۔ ”نیم تہذیب یافتہ“ میں جواب پنہاں ہے وہ یہ ہے کہ وحشی قبیلوں کے وقت سے لے کر تہذیب آج تک اپنے ارتقائی منازل طے کرتی رہی ہے۔ غزل اس سفر میں ایک خاص پڑاؤ سے آگے نہیں بڑھ سکی۔ اس لحاظ سے یہ نیم وحشی نہیں ہے ”نیم تہذیب یافتہ“ ہے..... جن شعراء کے نام آپ نے گنوائے ہیں وہ عظیم شعرا ہیں لیکن میں اس جملے میں صرف ایک لفظ جوڑنے کی اجازت چاہوں گا۔ وہ ”عظیم غزل گو شعراء ہیں“ یہ کہنا بالکل ایسے ہی ہو گا جیسے ہم کہیں کہ ٹی ایس ایلیٹ بہترین ”نظم گو“ شاعر ہے۔ چونکہ اس نے منظوم ڈرامے لکھے ہیں لیکن اوڈ، سانٹ یا دیگر اصناف سخن میں طبع آزمائی نہیں کی۔

☆ کسی بھی قسم کا ٹھہراؤ یقیناً بوسیدگی کی علامت ہے۔ آپ کے خیالات میں جس قدر برق رفتاری سے تغیر و تبدیلی رونما ہوا ہے وہ بھی بہت سے لوگوں کی نظر میں کھٹکتا ہے۔ کم از کم جوش، مجاز اور ساحر جیسے ترقی شعرا سے آپ کی یہ ناپسندیدگی گردانی جائے گی......!

☆☆ میں آپ سے متفق ہوں۔

☆ کیا آپ اپنے بارے اس رائے سے متفق ہیں کہ آپ کے نظریہ تجربات میراجی، مجید امجد، اختر الایمان سے مماثل ہیں؟

☆☆ جی ہاں۔ لیکن آپ ن م راشد کو تو بھول ہی گئے۔ میراجی کو میں بھی مجھ سے سینئر ہیں۔ وزیر آغا بھی ہیں۔ میں ان سے بھی متاثر ہوا ہوں لیکن مغربی تعلیم و تربیت اور مغرب پڑھانے کی وجہ سے ایک جہت جو ان سب سے مختلف ہے وہ تقابلی ادب کی ہے۔ اس لحاظ سے میری نظموں میں کلاسیکی ادوار سے لے کر آج تک یعنی رومانے قدیم کی تہذیب، قدیم یونانی تہذیب، وسطی اور جدید ادوار کا یورپی ادب، اور امریکی ادب..... کسی سے کہیں نہ کہیں تخلیقی خاطر یا تخلیقی افادہ موجود ہے۔ ہندوستانی کلاسیکی ادب تو اس میں شامل ہے ہی!

☆ آپ نے نئے مزاج، آکٹین اور زبان کی حامل نظموں پر اپنے وقت کے صرف ایک جید نقاد سے تا اثرات لے کر خود کو درست گردان لیا۔ بہتر ہوتا کہ آپ ایک سے زائد ناقدین بلکہ ایک سے زائد زبان کے ماہرین قلم سے رجوع کر کے کسی نتیجے پر پہنچتے......!

☆☆ آپ کے سوال میں ایک مفروضہ ہے اور ایک کڑی حقیقت پہلے کڑی حقیقت کو ہی لیں۔ یہ رواج سا ہو گیا ہے کہ ہم لوگ (یعنی لکھنے والے شاعر، کہانی کار) ناقدین کے دروازے کھٹکھٹاتے ہیں کہ ہمارے بارے میں چند الفاظ لکھ کر ہمیں اپنے حلقہ گوشوں میں شامل کر لیں۔ یہ ایک بے حد گھناؤنا بیماری ہے۔ دونوں ملکوں، ہندوستان اور پاکستان میں سینکڑوں لکھنے والے اس بیماری کا شکار ہیں۔ دوسری بات ایک مفروضہ ہے جو میرے بارے میں ہے اگر آپ کا اشارہ ڈاکٹر گوپی چند نارنگ کی طرف ہے۔ جنہوں نے میری کتاب

"دستِ برگ" کا اختتامیہ لکھا جو ان یک سطری نظموں کا مجموعہ تھا، جو ایک طے شدہ پراجیکٹ کے سلسلے میں ایک امریکی یونیورسٹی میں قیام کے دوران لکھی گئی تھیں۔ میرا جواب یہ ہے کہ جب یہ سطریں لکھی گئی تھیں تو دونوں جید حضرات (نارنگ اور فاروقی) ایسے ہی دوست تھے جیسے آپ اور ہم ہیں۔ اس کے بعد آج تک میں نے اردو کے کسی بھی نقاد سے رجوع نہیں کیا کہ میرے بارے میں کچھ لکھے۔ آپ مجھے گالی مت دیجیے گا۔ کیونکہ جواب میں اب لکھنے والا ہوں وہ میں نے نہیں، مرحوم نعیم اعظمی صاحب نے مجھے کہی تھی جب میں سات آٹھ دنوں کے لیے ان کے دولت کدے پر ۲۰۰۲ء میں ان کا مہمان تھا۔ انہوں نے کہا تھا۔ "آپ نے جو کچھ آج تک لکھا ہے وہ ان ناقدین کی فہم سے بالاتر ہے یہ آپ کے بارے میں کیا لکھیں گے؟"

☆ آپ کے ہاں موت بہت اہم موضوع ہے۔ "مرگِ ناشناسائی" "مرگِ آشنائی" "مرگِ دوائی" "مرگِ آگاہی" اور "مرگِ پیش آگاہی" وغیرہ اس کی زندہ مثال ہیں۔

☆☆ جی ہاں۔ میں نے خود محسوس کیا ہے کہ ۱۹۹۵ء کے بعد لکھی گئی نظموں میں لگ بھگ ۲۵ نظمیں ایسی ہیں جن میں موت کیسے ہوگی؟ موت کب ہوئی؟ موت کیا ہوگی؟ کیا میں موت کے بعد اس زندگی کو دیکھ سکوں گا؟ موت کے بعد میرے پسماندگان مجھے کیسے یاد کریں گے؟ موت کے بعد مجھے کیا احوال درپیش کرنا پڑے گا؟ کس کو پیش کرنا پڑے گا؟ سزا و جزا کا تصور کیا ہے؟ روح کیا ہے؟ "آتما" کا "پرماتما" سے کیا رشتہ ہے؟ بھگتی یوگ کیا ہے؟ کیا صوفی ازم اور بھگتی یوگ ایک ہی سکے کے دو رخ ہیں؟ بدھ مت کے مختلف پہلو کیا ہیں؟..... یہ نظمیں اگر "تتھاگت نظموں" کے سیریز میں شامل کر لی جائیں تو تعداد میں پچاس سے کچھ اوپر ہو جاتی ہیں..... شاید میں بھی عمر کے اس آخری حصے میں بقول ڈاکٹر عبداللہ "بوڑھے بڈھوں کی طرح گیان دھیان کی باتیں کرنے لگا ہوں۔"

☆ بقول آپ کے راشد کو موضوعات اور تکنیکوں کا جو تنوع میسر نہ تھا جو فن کی قبولیت کر سکتا۔ یہی صورت حال آپ کے ہاں بھی ہے۔ آپ اپنے قلم کی طاقت اور تخیل کی پرواز سے کتنے عرصے تک قاری، ناقد اور طالب علم کو مسحور کر سکیں گے؟

☆☆ شاید زیادہ عرصہ نہیں۔ یہ اردو کی بدقسمتی ہے۔ آپ پاکستان کے بڑے شہروں (لاہور، کراچی) کی حالت ہی دیکھ لیں۔ ادبی آبادی ترقی پسندوں اور "جدیدیوں" میں بٹا ہوا ہے۔ جدیدیت اور مابعد جدیدیت بھی اب پرانی پڑتی جا رہی ہیں کیونکہ انڈیا میں کچھ لوگوں کو اپنے رسالوں اور گروہوں کے حوالے سے گروہوں کی تلاش ہے۔ مثلاً آج کے رسالوں 'شاعر' بمبئی وغیرہ کی مثال اظہر من الشمس ہے لیکن دہلی میں 'استعارہ' گروپ اس کی تازہ ترین مثال ہے..... میں تو بھائی جان اپنے بارے میں کسی غلط فہمی میں نہیں ہوں۔ میری ایک نظم ہے "مشہوری بس ایک گٹھڑی ہے" جو میں ملفوف کر رہا ہوں۔ شاید آپ نے پہلے دیکھی بھی ہو۔

☆ ہمارے ہاں خالصتاً مشرقی تہذیب و روایات اور تجربات کے حامل اہل قلم و فکر کا تعین نہیں کیا جاتا، جس قدر مغربی زبان و ثقافت اور بودوباش سے آشنا قلم کاروں کا ہوا کرتا ہے۔ آپ کے خیال میں ایک قلم کار خاص کر مشرقی قلم کار کو لازمی طور پر مغربی تہذیب کا شناور ہونا چاہیے؟

☆☆ جی نہیں، یہ ضروری نہیں ہے۔ لیکن 'قبلہ' یہ تو دیکھیے کہ اقبال اگر مغربی تہذیب سے واقف نہ ہوتے تو مقابلے اور موازنے میں مشرقی تہذیب و تمدن کے بارے میں وہ باتیں کیسے کہہ سکتے، جو ہم نے بھلا دی تھیں۔ سرسید جیسے رہنما کو بھی غالب نے "آئینِ اکبری" کی تقریظ لکھنے کی دعوت کے جواب میں اپنے سفرِ کلکتہ کے احوال نامے کی رو سے مغربی تہذیب کے فوائد سے روشناس کروایا تھا..... میں یہ نہیں کہتا کہ مغربی تہذیب کے گہوارے میں جھول کر ہی کا ہو رہنا ضروری ہے لیکن اس کا علم تو بہر حال ہونا ہی چاہیے۔

☆ ہمارے قارئین کو آپ کے ہندی ناول پر لگنے والی پابندی کی وجوہات اور اس کے آپ کی ادبی زندگی پر مضمرات جاننے میں یقیناً دلچسپی ہوگی.....!

☆☆ اب تو بات بہت پرانی ہو گئی ہے۔ ساہتیہ پرکاشن ملی واڑہ دہلی سے میرا ہندی ناول "چوک گھنٹہ گھر" شائع ہوا۔ یہ لدھیانہ شہر کے چوک گھنٹہ گھر کے ماحول پر تحریر کردہ اٹھارہ گھنٹوں کے time span پر مشتمل ایک دن کی داستان تھی۔ یعنی ناول صبح چھ بجے شروع ہوتا تھا اور رات بارہ بجے ختم ہو جاتا تھا..... پنجاب کے وزیر اعلیٰ ان دنوں پرتاب سنگھ کیروں تھے جو مطلق العنان حاکم تھے اور پنڈت جواہر لال نہرو کے منہ چڑھے ہوئے تھے۔ لدھیانہ کے ایک ایم ایل اے کو اس ناول میں اشتراکیت کے پرچار کی بو آئی۔ پرتاب سنگھ کیروں امریکہ کے تعلیم یافتہ تھے اور کمیونزم کے لفظ سے ہی بدکتے تھے۔ انہوں نے حکم دیا کہ ناول پر پابندی لگا دی جائے۔ پابندی لگنے پر پولیس نے میرے گھر پر چھاپہ مارا۔ ناول کی کچھ جلدیں ضبط کر لیں..... نتیجہ یہ ہوا کہ پولیس اور میرے درمیان تو آنکھ مچولی تھی ہی (انہوں نے مجھے گرفتار نہیں کیا) بلکہ پنجاب کی حکومت اور میرے درمیان بھی آنکھ مچولی شروع ہو گئی۔ ناول کا اردو ایڈیشن، دیپک پبلشرز جالندھر سے "صبح دوپہر شام" کے زیر عنوان شائع ہو گیا۔ اس پر پابندی لگی تو اسی ناول کا پنجابی (گورمکھی) ایڈیشن لاہور بک شاپ لدھیانہ کے مالک سردار جیون سنگھ نے شائع کر دیا۔ ہندی ایڈیشن کا نام بدل کر "ایک دن کی کتھا" کے زیر عنوان سے ایک اور ایڈیشن شائع ہو گیا..... اب اس ناول کے کئی ایڈیشن پنجاب میں بکتے ہیں، پنجاب کی حکومت کی اس بات کے بارے میں کیا

پوزیشن ہے؟ مجھے اس کا علم نہیں ہے..... کچھ جعلی ایڈیشن چھپنے کی وجہ سے مجھے جو "ٹیکسائی" لی وہ تو الگ، لیکن مجھے وقت اور روپے کے زیاں کا بھی سامنا کرنا پڑا۔

☆ ہماری اطلاع کے مطابق سب کو تعجب ہے کہ آپ واحد قلمکار ہیں جن کی تخلیقات سب سے زیادہ تعداد میں امریکی 'لائبریری آف کانگریس آن لائن' نے محفوظ کی ہوئی ہیں آپ ہمیں اُن کی تفصیل اور لائبریری میں اُن کے مصرف کی بابت آگاہ کیجیے؟

☆☆ یہ کتابیں ڈاک سے منگوانے والوں کو ان کے ڈاک خرچ پر بھیجی جاتی ہیں اور اسی طرح وہ لائبریری میں پہنچتی ہیں۔ انھیں منگوانے کے لیے 'آن لائن' انٹرنیٹ پر بھی پیغام بھیجا جا سکتا ہے۔ مجھے سب سے زیادہ خوشی تب ہوئی۔ جب انڈیا میں ایک American Ambassador designate صاحب (نام نہیں لوں گا) یہاں ایک ملاقات کے وقت انہوں نے مجھے بتایا کہ انہوں نے میری کتاب The Asian Identity کے کچھ حوالہ جات پڑھے ہیں۔ جو ان کے ایک صلاح کار نے انھیں "مارک" کر کے دیے تھے۔ کیا یہ واقعی درست تھا؟ پبلک ریلیشنگ کے کوڈ کے تحت مجھ سے ملاقات سے پہلے انھیں یہ جملہ مجھے کہنے کے لیے تیار کر کے دے دیا گیا تھا؟ مجھے اس کا علم نہیں ہے لیکن بہر حال لائبریری میں کتابوں کا ہونا ایک اہم بات ہے۔

☆ گلوبل سٹیزن بننے کی خواہش کس مرحلے میں ہے؟

☆☆ وہ تو میں ہوں۔ تخلیقی ادب پڑھا جاتا ہوں تو دور دور سے اساتذہ اور پڑھنے والے مجھ سے رجوع کرتے ہیں کہ میں انھیں کچھ بتاؤں۔ اب صحت اجازت نہیں دیتی کہ چند برسوں کے لیے نکل جاؤں اور دنیا کے کچھ ممالک میں وہاں رہ کر زندگی جیئوں۔ کچھ دہشت گردی سے پیدا شدہ حالات بھی سدِّ راہ ہیں۔

☆ ایک سے زائد شعبوں میں معروف کار لوگ اکثر متنازعہ گردانے جاتے ہیں۔ آپ کو اردو، ہندی، پنجابی اور انگریزی زبانوں میں سے زیادہ پذیرائی اور تنقید کہاں ملی؟

☆☆ کسی زمانے میں یہ ہندی میں تھی۔ اب یقیناً اردو میں ہے۔ انگریزی اتنی بڑی زبان ہے کہ آپ آسانی سے اپنا سکہ نہیں چلا سکتے۔ ایک زمانہ ایسا آیا تھا کہ Indian English Literature کو ایک الگ صنف مان کر اسے Indish لٹریچر کہا جانے لگا تھا۔ تب بھی میرا نام کہیں "وغیرہ وغیرہ" کی فہرست میں شامل ہوتا تھا اس سے زیادہ نہیں۔

☆ اپنے ادبی سفر اور مقام و مرتبے سے آپ کس قدر اطمینان محسوس کرتے ہیں نیز مستقبل کی بابت کیا ارادے اور خواہشات ہیں؟

☆☆ میرے مطمئن ہونے یا نہ ہونے سے کیا فرق پڑتا ہے؟ میں بہر حال آخری سانس تک شعر کہتا رہوں گا، تنقید لکھتا رہوں گا اور جہاں تک مجھ سے بن پڑے گا اپنی تحریروں کو اشاعت کا جامہ پہنانے میں کوشاں رہوں گا۔

☆ اردو، ہندی، پنجابی، انگریزی کے اعزاز یافتہ شاعر، افسانہ نویس، ناول نگار، نقاد، ماہر سماجیات کس حیثیت اور شناخت میں مستقبل سے ہمکلام رہنا پسند کریں گے؟

☆☆ اردو شاعر کے طور پر۔

☆ اردو زبان و ادب کی موجودہ روش، رفتار اور معیار کی روشنی میں اس کی تعمیر، ترقی اور مستقبل کی بابت آپ کیا احساسات رکھتے ہیں۔ موقع کی مناسبت سے اس کی بہتری کے لیے کیا کہنا پسند کریں گے؟

☆☆ سوال کا جواب دو ملکوں کے حوالے سے دو حصوں میں ہے۔ مجھے انڈیا میں اردو کے روشن مستقبل کے بارے میں کوئی خوش فہمی نہیں ہے، جب تک کہ اسے دیوناگری ہی میں نہ لکھا جائے۔ لیکن کیا اس سے ان اعتراضات کا جواب مل سکے گا۔ جو اسے Hinduization of Urdu سے تعبیر کرتے ہیں؟ مرحومہ عصمت چغتائی اس کے حق میں تھیں۔ میں اس کے نہ حق میں ہوں اور نہ ہی اس کے بالکل مخالف ہوں۔ میں چاہتا ہوں کہ زیادہ سے زیادہ اردو کتب as they are (یعنی ترجمے کی شکل میں نہیں) ہندی رسم الخط میں منتقل کی جائیں۔ آنے والا وقت ہی بتائے گا کہ اس سے اردو ادب کی ایک مختلف شکل میں جانے کا کیا نتیجہ نکلے گا۔ مترجم شکل میں ترکی ادب اس کی ایک مثال ہے..... جہاں تک پاکستان کا تعلق ہے یہ دیکھ کر افسوس ہوتا ہے کہ اب بھی کتابیں مصنفین کے اپنے خرچ سے چھپتی ہیں اور ایڈیشن کی تعداد ایک ہزار سے زائد نہیں ہوتی۔ انڈیا میں ہندی کتابوں کے ایڈیشن دس ہزار سے ایک لاکھ کی تعداد میں چھپتے ہیں اور کملیشور جیسے کچھ ناول نگار اس زمرے میں سب سے آگے ہیں۔ پاکستان میں سرکاری اداروں اور ان پر ہونے والے اخراجات کے باوجود حالت بہتر نہیں ہے۔ عام آدمی کی قوت خرید اس بات کی حامل نہیں ہے کہ کتابیں خرید سکے۔ میری تجویز ہے کہ جیسے ۱۹۵۰ء کی دہائی میں پنجاب (انڈیا) میں ڈاکٹر مہندر سنگھ رندھاوا نے "لائبریری تحریک" شروع کی اور گاؤں کی سطح پر "پنچایت لائبریری" سے لے کر قصبہ، سمال ٹاؤن، میونسپل کمیٹی اور ضلع کی سطح پر لائبریریوں کا جال سا بچھا دیا، یہاں تک کہ ایک ہزار چھپنے والے پنجابی (گورمکھی) ایڈیشن کی پانچ چھ سو جلدیں انہی لائبریریوں میں خرید لی جاتی تھیں اسی طرح پنجاب اور پاکستان کے دیگر صوبہ جات میں گاؤں کی سطح سے صوبے کے صدر مقام کی سطح پر لائبریریوں کا جال بچھا دیا جائے جنھیں خاطر خواہ فنڈز فراہم کیے جائیں۔ یہی اقدامات پرائمری اسکولوں سے لے کر ہائی اسکولوں کو دی جائیں تو اردو کا بھلا ہو سکتا ہے۔

اردو کا سنجیدہ بہی خواہ

پروفیسر گوپی چند نارنگ

ڈاکٹر ستیہ پال آنند کی ایک سو نظموں کا یہ مجموعہ جسامت کچھ قیمت بہتر کے مصداق اس لیے بھی ہے کہ آزادی کے بعد کی اُردو شاعری کے تجزیاتی مطالعے کے جس احساسِ لاحاصلی پر پہنچی ہے اس سے بعض ایسے سنگین سوال سامنے آتے ہیں جن سے اُردو کا کوئی سنجیدہ بہی خواہ صرفِ نظر نہیں کر سکتا مثلاً غزل ہماری شاعری کی آبرو اور ہماری مرکزی صنفِ سخن سہی لیکن اُردو میں روایتی شاعری کی یلغار کیوں ہے یعنی شاعروں کی بات تو الگ رہی ہمارے ادبی رسائل کا زیادہ تر حصہ کیوں روایتی گھسی پٹی شاعری کی نذر کیوں ہو جاتا ہے یا یہ کہ اُردو میں نظم کی روایت اپنی سمتی اعتبار سے اگرچہ راسخ ہے لیکن آزادی کے بعد نظم کی ترقی رکی رکی دبی دبی سی کیوں ہے یا قطع نظر کچھ کے چند شعرا کے ہماری نظمیہ شاعری میں وہ معنیاتی اور موضوعیاتی تنوع یا ہمہ گیری کیوں نہیں جو دوسری ترقی یافتہ زبانوں کا طرۂ امتیاز ہے؟ یہ نتائج معروضی طور پر ہندوستان سے باہر ایک غیر ملکی یونیورسٹی کے تحقیقی پروجیکٹ میں اخذ کیے گئے۔ قطع نظر طریق کار کے فرق کے یا اُن ضرورتوں کے جن کے تحت اس نوع کا پروجیکٹ قائم کیا گیا میرا خیال ہے کہ یہ مسائل اس قدر شدید ہیں کہ اگر یہ پروجیکٹ بجائے کسی غیر ملکی یونیورسٹی کے دہلی یونیورسٹی میں یا علی گڑھ مسلم یونیورسٹی میں قائم کیا گیا ہوتا تب بھی نتائج کم و بیش یہی برآمد ہوتے اور احساس بھی مرتب ہوتا کہ تخلیقی صورتِ حال کی اس سنگینی پر اُردو والوں کو ضرور غور کرنا چاہیے اور اس کے تدارک کی ہر ممکن سعی بھی کرنا چاہیے۔

اس پروجیکٹ کے کوآرڈینیٹر پروفیسر ستیہ پال آنند انگریزی اور تقابلی ادب کے پروفیسر ہیں اور پنجاب یونیورسٹی چنڈی گڑھ کے علاوہ واشنگٹن ڈی سی کی ساؤتھ ایسٹرن یونیورسٹی سے بھی ان کا برسوں سے تعلق ہے۔ انگریزی اور ہندی میں ان کے متعدد شعری مجموعے ناول اور افسانوی مجموعے شائع ہو کر خراجِ تحسین وصول کر چکے ہیں۔ جو شخص آج سے بیس پچیس برس پہلے راجندر سنگھ بیدی، کرشن چندر، ملک راج آنند، خواجہ احمد عباس اور کنہیا لال کپور جیسی عظیم ہستیوں سے اپنی تخلیقی قوت کا لوہا منوا چکا ہو، اُردو میں اس کی واپسی لائقِ مبارک باد ہے۔ حال ہی میں اُردو میں ان کا ناول "شہر کا ایک دن" اور افسانوں کا مجموعہ "اپنی اپنی زنجیر" شائع ہوئے ہیں اور اب یہ شعری مجموعہ "دست برگ" پروجیکٹ کے تحت منظرِ عام پر آرہا ہے۔

زیرِ نظر مجموعہ درحقیقت اس وسیع تر احساسِ محرومی کا زائیدہ بھی ہے کہ غیر ملکی یونیورسٹیوں میں تقابلی ادب کے سلسلے میں جنوبی ایشیا کے ادبیات کی نمائندگی بالعموم ٹیگور، آر کے نارائن، راجا راؤ وغیرہ تک محدود ہے اور اُردو کا کوئی عمل دخل نہیں۔ اس پروجیکٹ میں اس صورتِ حال سے یہ نتیجہ اخذ کیا گیا کہ اُردو غزلیہ شاعری کا ترجمے کی زد میں نہ آسکنا اور اُردو شاعری کا بالعموم روایت زدہ ہونا اس راہ کی سب سے بڑی رکاوٹ ہے۔ اس سے نمٹنے کی ایک صورت یہی ہو سکتی ہے کہ اُردو نظم کی ایسی روایت پر توجہ کی جائے جس میں اُردو کی اپنی ثقافتی پہچان بھی ہو اور معنیاتی اعتبار سے وہ ایسی پیچ و پوچ نہ ہو کہ مغربی قارئین اسے "اورینٹل" کہہ کر حقارتاً رد کر دیں۔ قطع نظر ان مباحث کے کہ تقابلی ادب کے تمام ایشیائی نصابات میں فکشن زیادہ اور شاعری کم جگہ کیوں پاتی ہے یعنی کیا ترجمے میں زیرِ دام لانا تقریباً ناممکن ہے، یا ترجمے کی ضرورتوں کے تحت جو شاعری کی جائے گی وہ شعری عمل کا حق کس حد تک ادا کر سکے گی، یہ حقیقت اپنی جگہ غور طلب ہے کہ یہ نظمیں آٹھ سال کی مدت پر پھیلی ہوئی ہیں اور مختلف مقامات پر مختلف کیفیتوں میں کہی گئی ہیں۔ ان میں جو معنیاتی قوسِ قزح ہے، مشرقی اور مغربی شعری روایت کے درمیان جو جمالیاتی پُل بنانے کی کوشش ہے، انگریزی سوچ، ہندوستانی مزاج اور اُردو اظہار کا جو جزر و مد ہے، ہندی اور پنجابی تاثر کی جو پرچھائیں ہے، جو شوخ رنگ اور نیا ذائقہ ہے، وہ اپنی الگ نوعیت رکھتا ہے۔ اگرچہ خالص لسانی نقطۂ نظر سے کچھ باتیں اختلافی بھی ہو سکتی ہیں، لیکن بعض نظمیں بالخصوص زین بدھ ازم سیریز کی نظمیں یا کبیر کی چادریا، نوش کلیا، نرسنگھا یا، جو یرفا یا کبھی کھاتا یا دیکھو یا، کبیرو کی کہانی، یا شب سب کی نظموں کا مرکز بنیں گی اور اس میں شاید ہی کسی کو کلام ہو کہ اُردو میں یہ اپنی نوعیت کی پہلی کوشش ہے۔ اُردو کے ہم عصر شعری منظرنامے اور عالمی تقابلی ادب کے جو مسائل اس کا محرک رہے ہیں اگر یہ مجموعہ اُردو والوں کی توجہ ان مسائل کے تئیں مبذول کرا سکا تو ہر اعتبار سے یہ اقدام مستحسن قرار پائے گا۔

باطن یک دیگر

ڈاکٹر گیان چند جین

میں جنوری ۱۹۹۸ء میں امریکہ منتقل ہوا۔ یہاں آنے سے پہلے ہی میں ڈاکٹر ستیہ پال آنند سے غائبانہ طور پر واقف تھا۔ ان کی تحریریں یا ان کے بارے میں تحریریں رسالہ "شاعر" بمبئی "کتاب نما" اور "شب خون" میں پڑھی تھیں۔ امریکہ آنے کے بعد انھیں تفصیل سے جانا۔ مراسلت ہوئی۔ فون پر بار ہا باتیں ہوئیں۔ اگلے زمانے میں مراسلت کو نصف ملاقات کہتے تھے۔ فون پر گفتگو کو کیا کہا جائے؟ پون ملاقات! ابھی تک پوری ملاقات نہیں ہوئی۔ شنیدہ سے آگے دیدہ کی منزل تک نہیں پہنچے۔ شنیدہ کے بود مانند دیدہ۔

وہ عمر میں مجھ سے خاصے کم ہیں۔ ۲۴ اپریل ۱۹۳۱ء کو کرہ ارض پر وارد ہوئے۔ میں ان سے ساڑھے آٹھ سال آگے ہوں لیکن صرف ماہ و سال کے اعتبار سے۔ بزرگی بہ عقل نہ بہ سال۔ میں صرف اردو وہ بھی قدیم اردو جاننے والا دقیانوسی، جس نے صرف ایک ملک ہندوستان میں پڑھایا ہے۔ وہ اردو کے علاوہ فلسفہ کے بھی ڈاکٹر، اردو، ہندی، پنجابی اور انگریزی چار زبانوں کے لکھک۔ اردو کے علاوہ انگریزی کے بھی اعزاز یافتہ شاعر، افسانہ نگار، ناول نویس، نقاد، سماجی موضوعات پر لکھنے والے جنھوں نے کم از کم پانچ ملکوں ہندوستان، برطانیہ، امریکہ، کینیڈا اور سعودی عرب کے طلبہ کی آبیاری کی ہے، نہ صرف انگریزی ادب بلکہ فلسفہ اور آرٹ بھی پڑھایا ہے۔ مختلف زبانوں کا تقابلی ادب اُن کا میدان اختصاص ہے۔ کاش میں ان کے اڑوس پڑوس میں ہوتا تو کچھ ان سے حاصل کر لیتا۔ اب تو میرا حصہ صرف دور کا جلوہ ہے۔

انھوں نے اپنی تاریخ ولادت کے بارے میں ایک دلچسپ انکشاف کیا ہے۔ مہاتما گوتم بدھ کے پہلے چیلے اور جانشین بھکشو آنند نیز شیکسپیئر ان کے مطابق ۲۳ اپریل کو پیدا ہوئے تھے۔ ستیہ پال آنند ان تک تو نہیں پہنچے لیکن ان عظماء سے ایک گونہ اشتراک تو ہے۔

جہاں تک مجھے معلوم ہوا ہے انھوں نے اردو میں اپنی حسب ذیل تخلیقی کتابیں شائع کی ہیں۔

شعری مجموعے: دست برگ ۱۹۹۱، وقت لا وقت، دہلی ۹۳ء، آنے والی سحر بند کھڑکی ہے، لاہور ۱۹۹۴ء، لہو بولتا ہے، دہلی ۱۹۹۷ء، مستقبل آ مجھ سے مل، دہلی اکتوبر ۹۹ء، آخری چٹان تک، دہلی ۲۰۰۰ء۔

افسانوی مجموعے: جینے کے لیے۔ دل کی بستی۔ اپنی اپنی زنجیر۔ پتھر کی صلیب۔

ناول: آہٹ۔ عشق، موت اور زندگی۔ شیر کا ایک دن۔ اپنے مرکز کی طرف۔ چار جاسوسی ناول جو شیر اور تبسم کے نام سے چھپے۔

ان میں اگر ہندی، پنجابی اور انگریزی کی کتابوں کو بھی شامل کر لیا جائے تو ان کی کتابوں کی تعداد ۲۸ سے تجاوز کر جاتی ہے۔ انھوں نے بہت سی نظمیں پہلے انگریزی میں لکھیں اور بعد میں ان کو اردو نظم کے قالب میں ڈھال دیا۔ ۳۲ اردو نظموں کو انگریزی نظم کی ہیئت میں بدل کر ایک انگریزی مجموعہ On man and God ۱۹۸۷ء میں شائع کیا جس پر ساہتیہ اکادمی کے پروفیسر وی کے گوکک نے پیش لفظ لکھا۔ ان کی اردو کتابوں کی تحسین بطرز کول ڈاکٹر وزیر آغا، آنجہانی انجم ریاض اور ڈاکٹر گوپی چند نارنگ جیسے اساطین ادب نے کی ہے۔ چاروں جدید اردو ادب کے طارم اعلیٰ کے ابر پر متمکن ہیں، پہلے تین بہت بڑے تخلیق کار اور دونوں ڈاکٹر بہت بڑے نقاد ہیں۔ ان کی تحسین کے بعد ڈاکٹر آنند کی تصانیف پر میری لب کشائی کچھ معنی نہیں رکھتی۔ جدید اردو ادب کی ...... بالکل نیاز مندوں اس شعبے میں میرا علم اتنا صرف اپنی ہیچ مدانی کا شہرہ کرنا ہو گا۔ میں نئی تنقید کے اسلوب، تخیلات اور اصطلاحوں پر گرفت نہیں رکھتا۔ اس لیے سیدھے سادے براہ راست انداز میں اپنے تاثرات پیش کروں گا۔

اٹھارویں صدی کے آخر تک اردو ادب نے عربی اور فارسی کے سرچشمے سے اپنی پیاس بجھائی۔ ان کی روایات اور موضوعات کی نقالی کی۔ انیسویں صدی سے اس نے مغربی ادب بالخصوص انگریزی سے استفادہ شروع کیا۔ بیسویں صدی میں اس کی لے اور تیز ہو گئی۔ اردو ادب میں نظریاتی اعتبار سے جو کچھ حذف و اضافہ ہو رہا ہے، شعریات اور نثری رجحانات کی جو تشکیل نو ہو رہی ہے وہ سب مغربی نظریات کی عکاسی اور نقالی ہے۔ اردو کے کئی اہم نقاد مغربی ادب سے کافی واقفیت رکھتے ہیں لیکن ظاہر ہے کوئی بھی ڈاکٹر ستیہ پال آنند جیسا عرفان نہیں رکھ سکتا۔ آج کل مطالعہ ادبیات کا سب سے اہم اور سکہ رائج الوقت تقابلی ادبیات ہے اور آنند کا موضوع اختصاص یہی ہے۔ انھوں نے اس موضوع پر کام کیا ہے اور شاگردوں سے کام کرا رہے ہیں۔ خود چار زبانوں کے ادیب ہیں۔ ادب کے علاوہ فلسفہ اور آرٹ کے ماہر ہیں۔ وہ نظریاتی نقطہ نظر سے موشگافیوں پر بہت زور دیتے ہیں۔

اردو شعرا کو غزل ترک کر کے حتی الامکان نظمیں لکھنی چاہئیں۔ خود

آنند نے اپنی شاعری کی ابتدا غزل گوئی سے کی لیکن منشی تلوک چند محروم نے ان سے اصرار کیا کہ غزل کو یک قلم ترک کر کے نظم لکھیں۔ غزل کے روایتی موضوعات کی تنقید سب سے پہلے حالی نے مقدمے میں کی۔ پھر عظمت اللہ خاں، عندلیب شادانی، جوش ملیح آبادی اور کلیم الدین احمد نے شدت سے مخالفت کی۔ آنند ان سب سے زیادہ غزل سے دامن چھڑا لینے کے حق میں ہیں کیونکہ ادبیات عالم میں غزل کی شاعری کو کبھی عظیم نہیں تسلیم کیا جائے گا۔ رالف رسل نے اپنی تاریخ The pursuit of urdu literature - A select history (London 1992) میں لکھا ہے کہ انگریزی بولنے والے مغربی قارئین کے لیے غزل کو سمجھنا اور اس کی قدر شناسی کرنا بہت مشکل ہے۔ وہ غزل کے عشق، غزل کے عاشق اور محبوب کے کردار اور رقیب، شیخ وغیرہ کو نہیں سمجھ پاتے۔ غزل کی ریزہ خیالی انہیں ہولاتی ہے۔ غزل کی لڑی پر بیش قیمت جواہر خزف اور کانچ ایک ساتھ ٹانک دیے جاتے ہیں۔ غزل کے محبوب کی جنس مغربی قارئین کی فہم سے بالاتر ہے۔ غزل ناجائز عشق کا بیان کرتی ہے۔ (دوسرا باب) غزل کا سب سے بڑا شاعر غالب ہے لیکن کیا وجہ ہے کہ کسی دوسری زبان میں پورے دیوان غالب کا ترجمہ نہیں کیا جاتا، صرف انتخاب پر اکتفا کی جاتی ہے۔ اگر متداول دیوان غالب کا یہ شعر پیش کیا جائے۔

زخم پر چھڑکیں کہاں طفلان بے پروا نمک
کیا مزا ہوتا، اگر پتھر میں بھی ہوتا نمک

تو انگریزی ترجمے میں یہ کچھ ایسے پیش کیا جاتا:

Lado do not dress my wounds with salt,

How nice would it be if their brick bats could be

saline.

تو اس مضمون کو پڑھ کر مغربی قارئین حیران ہو گئے کہ یہ کیا بکواس

ہے

آنند نے دوسری بات یہ کہی ہے کہ اردو کے شعر و ادب کا تعلق آس پاس سے کم اور دور دراز سے زیادہ رہا یعنی ایجاد اس نے اپنے آس پاس کی لسانی اکائیوں سے بچاتے ہوئے اس نے اپنی محبت اور دوستی کے لئے ہمیشہ ان کی طرف دیکھا ہے جو بیرون ہند کے تھے۔ یہ ضروری تھا کہ اردو ہندوستان کے مین اسٹریم لٹریچر کے ساتھ ساتھ علاقائی زبانوں کے ادب کے ساتھ بے اعتنائی کے رویے کی سب سے بڑی مثال پنجاب کا لوک ادب ہے، جس سے صوفیائے کرام کا کلام جڑا ہوا ہے.....ایک دو جن سے لوک گائکی کی طرزیں ہیں........
کچھ اصناف سخن صوفی شاعروں کی ایجاد کردہ ہیں۔
آنند مجھے لکھتے ہیں۔

میرا یہ کہنا ہے کہ اردو کا شعری ادب فارسی اور عربی کا طوق غلامی اتار پھینکے شاید میری موت کے بعد پہچانا جائے گا۔ مجھے آپ سے امید ہے کہ کبھی آپ اس موضوع پر بھی قلم اٹھائیں گے کہ ہندوستان کی تہذیب اور کلچر سے ناطہ نہ جوڑ کر اردو نے کیا کھویا۔ (مکتوب مورخہ ۲۲ اگست ۲۰۰۹ء)

نظم کے شاعروں پر نظر ڈالی جائے تو اقبال اردو کے سب سے بڑے شاعر ہیں لیکن انہیں بھی ان کے مخصوص نظریات جمہوری نظام کی مخالفت، شاہین کی وکالت، نطشے اور مسولینی سے عشق، در پردہ فسطائیت سے ہمدردی اور ان کی ملت پرستی کی وجہ سے عالمی معیار کے شاعروں میں جگہ نہ مل سکی۔ میں آنند کے دونوں نظریات کی بڑی حد تک تائید کرتا ہوں پوری طرح نہیں۔

آنند کے شعری مجموعوں کی سیر کیجئے تو سب سے پہلی چیز جو توجہ کھینچتی ہے یہ ہے کہ ان کا کینوس زماں اور مکاں دونوں کے اعتبار سے بہت وسیع ہے
زمانی اعتبار سے چھ ہزار برس پہلے سے مستقبل تک۔ نظم "وارث"
مجھے ہزار برسوں تک / آرٹ، فلسفہ، تاریخ / میں نے کب سنبھالے
ہیں / آج کے .... یگ میں
(واشنگٹن میں ہندوستانی نوادر کی ایک نمائش دیکھنے کے بعد)
اور مکانی اعتبار سے دیکھئے تو امریکہ سے ہندوستان تک پھیلا ہوا ہے۔ ان کے کلام کے متنوع خطوں کی سیر کرتے ہوئے ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے کسی بڑے انٹرنیشنل ہوائی اڈے کے لاؤنج میں آگئے ہیں۔ جہاں دنیا بھر کے ملکوں اور تہذیبوں کے حامل انسانوں کا جمگھٹ دکھائی دے رہا ہے۔ آنند کے ماخذ اور محرکات میں دو سب سے زیادہ نمایاں اور طاقت ور ہیں۔ گوتم بدھ (تتھا گت) اور انگریزی ادب، جو زماں اور مکاں دونوں کے پھیلاؤ کو ظاہر کرتے ہیں۔ انہوں نے اساطیر اور تلمیحات سے خوب کام لیا ہے اور ان اساطیر میں سب سے زیادہ ہند قدیم کی اور پھر قدیم یورپ نیز امریکہ کی پچھلی دو تین صدیوں سے تعلق رکھتی ہیں۔

بات بڑھتی جا رہی ہے، میں اطناب سے بچنے کے لئے آج کی تقریب کے موضوع ان کی تازہ ترین کتاب آخری چٹان پر آتا ہوں۔ یوں منظر میں کہیں کہیں اس کے پیش رو مجموعے "مستقبل آ مجھ سے مل" کی کسی نظم کا ذکر بھی آ جائے گا۔ میرے لئے بڑی دقت یہ ہے کہ آنند مستقبل کے فن کار ہیں، مستقبل سے حال کی طرف آتے ہیں۔ میں حال سے ماضی کی طرف لوٹنے والا شخص ہوں۔
اپنا ایک شعر پیش کرتا ہوں۔

کیا مستقبل، مجھے تو حال بھی ملا نہیں
اپنے ماضی کے کھنڈر میں کھوتا رہتا ہوں میں

حال تو اقلیدس کے نقطۂ خیالی کی طرح ہے لحۂ حاضر کے پیچھے
اتھاہ ماضی ہے تو آگے بیکراں مستقبل۔ حال محض ایک لمحے کے بھی جزو کے برابر
ہے۔ وہ میری گرفت میں کیونکر آئے۔ آنند نے کئی نظموں میں مستقبل و حال کا
تعلق واضح کیا ہے۔ اپنی نظم 'میرے مستقبل! آ مجھ سے مل' کے آخر میں محض
حیات و ممات کے انجام کو جاننے کی خواہش ہے لیکن آخری چٹان تک کی غالب
سیریز کی نظم 'کرسٹل بال' میں کہتے ہیں۔

اے نجومی یہ تو سوچو جس نے غالب کی طرح ہی/ اپنے مستقبل کی
سے کو بیتے کل میں زندہ رہ کر دیکھ لیا ہو/ اس کے کرسٹل بال میں تم جھانک کر بھی
کیا کرو گے؟ (آخری چٹان تک، ص ۱۰۲)

اس سے بھی زیادہ مکمل کر نظم "بیک ٹو فیوچر" میں لکھتے ہیں۔

تم تو لوگو/ ماضی سے دو چار قدم ہی آگے آ کر/ یہ کہتے ہو تم نے
بہت ترقی کر لی/ ہم جو مستقبل سے چل کر/ ہم جو مستقبل کے امکاں/ اور یقیں
کے خود خالق ہیں۔

ہم ہیں ایسے حال کے داعی/ جو مستقبل کے ہر پل کو اپنے بیتے کل
میں بھوگ چکا ہے (ص ۵۲۔۵۱)

نظم کا عنوان تو دیکھئے: بیک ٹو فیوچر' مستقبل ان کے اقدام کا نقطۂ
آغاز یعنی پہلا قدم ہے۔ جہاں سے وہ حال تک پہنچے ہیں۔ میں حال سے ماضی
میں جا نکلتا ہوں۔ میں کیونکر ان کی تیز گامی کا ساتھ دے سکتا ہوں، ان کے شب
تخیل کی گرفت کر سکتا ہوں! اوپر میں نے "غالب سیریز" کا فقرہ لکھا تھا۔ آنند
کے یہاں ایسے کئی چھوٹے چھوٹے سلسلے ہیں جن میں کئی نظمیں ایک دوسرے
کے ہاتھ میں ہاتھ دیے چلتی ہیں مثلاً مجموعہ "وقت لاوقت" کے آخر میں "تتھا
گت" (گوتم بدھ) نظمیں "بولو بولا ہے" کے آخر میں "یہ سچ لنا سپ" نظمیں یا
"مستقبل آ مجھ سے مل" میں پانچ کوٹ سانگ (ان کا مولد) کی نظمیں یا
"پہاڑوں کے گیت" تین نظمیں/ مجموعہ "آخری چٹان تک" میں تین "سچی
نظمیں"، "چچا غالب، نجومی اور میں" چار نظمیں یا "وقت مسافر سے مکالمہ" چار
نظمیں/ "کپل وستو کے معصوم شہزادے سے مکالمات" تین نظمیں اور ایسے نظم نمبر ۱۱
"سچ تو سانپ ہے" اور نظم نمبر ۱۳ "بدن کی جنگ میں ہاری گئی استری" کو بھی اسی
سلسلے میں رکھ سکتے ہیں کیونکہ ان میں بھکشو آنند اور تتھاگت کا مکالمہ ہے۔ واضح
ہو کہ تتھاگت سے مراد گوتم بدھ ہیں۔

آنند کے یہاں شرق و غرب سے متعدد تلمیحات ملتی ہیں، ان میں
گوتم بدھ سے متعلق سب سے زیادہ ہیں۔ ان کے اس کی وجہ یہ معلوم ہوتی ہے
کہ مہاتما بدھ کے پہلے چیلے کا نام بھی آنند تھا اور آنند ہی کے مطابق وہ بھی ان کی
طرح ۲۴۴۳ برس پہلے پیدا ہوئے تھے۔ وہ آنند سینئر تھے، ستیہ پال آنند جونیئر ہیں۔

میں قارئین و سامعین کو آنند کی نظموں سے متعارف کرانا چاہتا
ہوں۔ دقت یہ ہے کہ بیشتر نظمیں میرا دامنِ دل کھینچ کر مطالبہ کر رہی ہیں کہ میں
ان کے طویل اقتباسات اور پھر ان پر مشاہدات دوں لیکن مضمون کی تنگ دامنی
میں اتنی سمائی کہاں۔ میں اس بزم میں ان کی زیادہ نظموں کو لانے کے لئے یہ طریقہ
اختیار کرتا ہوں کہ نظموں کے انتخاب اور ان کے ضروری اقتباس ہی کی معرفت
اپنا خاموش تبصرہ قلم بند اور صدا بند کروں۔ یہ طائرانہ جائزہ بھی آنند جی کا کافی
حق ادا کر سکے گا۔ میں اپنے تعارفی یا تشریحی الفاظ قوسین میں دوں گا تو آپ
پر وہ تو ہم صغریٰ کریں۔

نظم پانچ 'ایک فنکار، ایک فن پارہ'
(فنکار کامل خوابیدہ فن پارے کی تلاش ہے)

اور میں نے پتھر کو چھو کر تمہیں کہا تھا/ اس میں سے ایک بت کی
صورت/ جھانک کے مجھ سے یہ کہتی ہے/ میں منتظر ہوں، مجھے تراشو/ اور میں
نے لفظوں کو اپنی نوک زباں سے/ امر سنگیت کے ہار پرو کر/ پھولوں جیسا گوندھ
دیا تھا۔ میری روح کے اندر کا فن پارہ/ آج بھی خوابیدہ ہے تم نے کہا تھا
(ص ۱۹۔۱۸)

نظم آٹھ 'لے مزرب' Les miserables
(امریکہ میں کالی نسلوں کا مسئلہ)

تین سو برسوں کی ذلت کا مداوا کچھ نہیں ہے/ اور شاید ہے اگر تو
رہزنی، غارت گری ہے/ نشہ آور ذہن کُش کوکین، ہیروئن ہے/ یہ بے مخلوق/ (حبشی)
تھے کبھی اب نیگرو کالی ہے/ (فرق؟) فقط نسلاً مگر شہری ہیں امریکہ کے/ ریپ
میوزک/ کاپ کلنگ/ رہزنی، غارت گری، بردہ فروشی، قتل و خون/ بے حسی و مقصد
تمرد ہی شعارِ زندگی ہے (ص ۲۵۔۲۴)

نظم ۱۲ 'یہ لاش تو اب بڑھے گی لوگو'

غالب نے خود کو یہ کہہ کر بہلایا تھا کہ اب میری قدر اس لیے نہیں
ہوتی کہ میں اپنے زمانے سے آگے کی باتیں کرتا ہوں۔

؎ میں عندلیب گلشنِ نا آفریدہ ہوں

اور

؎ شہرتِ شعرم بہ گیتی بعدِ من خواہد شدن

آنند بھی کہتے ہیں

کبھی کسی نے/ خراجِ تحسین، منقبت، قدر و منزلت سے نہیں نوازا/
نہ کوئی اعزاز، نقد انعام یا وظیفہ/ نصاب سازوں نے، صاحبِ اقتدار لوگوں نے/
فن کے نقاد یا رکھوں نے/ اکادمی میں/ ادب سے وابستہ اہلِ بست و کشاد نے/
خود سے دور رکھا/ یہ لاش تو اب بڑھے گی لوگو/ کہ مرنے والے کا قد طوالت میں/

جینے والے کے قد سے اکثر بلند ہوتا ہے / شاعری میں۔

(ص ۴۱۔۴۰)

دیکھیے کیا ہوتا ہے سانحہ ذوق اور داغ کی لاشیں ان کی حیات
کے قد سے گھٹ گئی تھیں۔

نظم ۱۵۔ "لاوارث" (ہندوستان کے ۱۰۰۰ سال کے قیمتی آرٹ
کی کوئی قدر نہیں کی بالخصوص اہلِ اردو نے)

سب قصور میرا ہے / جتنے ہزار برسوں تک / آرٹ، فلسفہ، تاریخ /
کب انھیں سمیٹا ہے / اپنے آج کے یُگ میں میں نہیں ہوں دعوے دار / اس عظیم
ورثے کا / میں ہوں ایک لاوارث

(ص ۴۴۔۴۳)

نظم ۱۸۔ "سو ٹکڑوں کا ایک منظر" انھوں نے ترجمہ کیا ہے
Gigsaw puzzle کا۔ میرے نزدیک یہ ایک بہترین کولاژ
(Cllage) ہے جس میں اصوات یا معنوی مرکبوں سے مکمل اور نکمل جملے کے بغیر
ایک طویل داستان لکھی ایک مریض کائنات کی ہے۔ اکبر الٰہ آبادی کی نظم "دہلی
دربار" یا جوش کے "چند الہ سجاد" کی یاد آتی ہے۔ آنند کی یہ لا وزن پڑھنے سے تعلق
رکھتی ہے۔ چند ٹکڑوں سے کیا ہوگا۔

لمس تتلی رنگ گلابی / اُبلی، اَرفع اک گنبد سے / اُلٹک بوس ہیرام
بچھڑے / ابد بیت ان گھڑ یہ ٹکڑے / لولے لنگڑے ٹنڈے منڈے / الف بے جیم
پشت نہنگے / بھولے بد صورت، بھک سنگے..... آئیں میں بیعت کر یں تو / ستیہ پال
آنند کی صورت / خیر و شر کا ایک مرقع / ان سے شاید آشنا ہو /

(ص ۵۰۔۴۸)

نظم ۲۱ "گھر کہاں ہے" (ماسو لو بچہ دریا کے خون میں ہاتھ پاؤں
مار کر پار اترتا ہے)

پار اترتے ہی خوشی سے / چیخ کر اعلان کرتا ہے کہ لوگو / میں بحمد اللہ
عافیت سے گھر تک آ گیا ہوں

(اس ابتدا کی انتہا یہ ہے کہ طائرِ جاں نزع کی حالت میں)

وہ قفسِ عنصری سے چھوٹتے ہی / چیخ کر اعلان کرتا ہے "کہ لوگو / میں بحمد اللہ واپس
اپنے گھر میں / عافیت سے آ گیا ہوں گھر کہاں ہے!!

(ص ۵۶۔۵۵)

نظم ۲۲ "آؤ گھر کو چلیں" (گوری نسل پرست جماعت کو کلکس کلان
Kuklux Klan کے ڈر سے)

شہر کی شاہراہوں پہ چلتے ہوئے / گندمی کالے چہروں کو جو / ایک
لقمہ بنا کر نگل جائیں گے

(گندمی سے اشارہ ہے ایشیائیوں کی طرف اور کالے سے مراد
افریقی سیاہ فام لوگ) (ص ۵۷)

نظم ۲۳ "گفتگو" (شام کو میں جھیل کے کنارے ایک ضعیف العمر جوڑا)
فقط ہاتھ میں ہاتھ / لب کشا دو فقط چند الفاظ / لیکن کہے بن کہے / ایک گفتگو
ہے ہوا کی / جو پانی کو چھوتی ہوئی / اپنی دھن میں مگن چل رہی ہے

(ص ۶۰)

نظم ۲۵ "لوک میں ہوں"

(شمالی امریکہ برف اور برفانی ہواؤں کا علاقہ ہے جس سے ہم
جنوبی کیلی فورنیا والے آشنا نہیں۔ وہاں ایک صبح شاعر اور ان کی ۶ سالہ بیٹی
یونیورسٹی کے باغ میں گھومنے گئے۔ بیٹی نے نرسری بک میں پڑھا تھا کہ ہر پل
کہ ہم خود کو کسی بھی شکل میں بدل سکتے ہیں۔ اس نے لوں چاٹ کر خواہش کی
میں لڑکا ہوتی)

ایک پل / تا کہ میں دنیا کو کندھوں پہ اٹھا کر چل سکوں / آج میں
خود بھی وشواس رکھتا ہوں / اس لیے (لڑکا نہ ہو کر بھی) تمھیں / دنیا کو کندھوں پر
اٹھائے بوجھ اٹھانا پڑ رہا ہے۔

(ص ۶۲۔۶۱)

نظم ۲۶ "ختم ہوا شام کا" (ستیہ پال آنند کا ایک بہت ہی مرغوب
موضوع زوال عمر اور اس کے ساتھ نفسیاتی اور جسمی وسوسے ہیں۔ اس مجموعے
میں بعد کے حصے میں کم از کم آدھی نظمیں ایسے ہی احساسات و حسیات ہیں۔ نظم
۲۵ کے بعد میں بھی جست لگا کر نظم ۲۹ پر آ گیا ہوں۔ اس نظم کے چار حصے ہیں۔
شاعر کانڈو (Condominium) یعنی کئی منزلہ اپارٹمنٹوں والی عمارت
کی بیسویں منزل کے کھلے ٹیرس پر خیالات کی رو میں بہہ رہا ہے)

ختم ہوا شام کا اک مرحلہ ہے / رات کی اندھی چڑیلیں چیختی ہیں /
آسمان کی گیلی رسی سے بندھے بے بس اندھیرے کالی قربانی کے بکروں کی طرح
گردن بریدہ / نزع کے عالم میں گرتے / ہانپتے ہیں /

(شاعر کو نیویارک کی طوفانی ہواؤں میں اپنے وطن پنجاب کے
شہر سے متعلق اپنے قصبے کے پرانے لمحے یاد آ رہے ہیں جہاں ان کا بچپن اور کچھ
اور جوانی گزری)

صبح ہے پنجاب کے اس شہر میں اس وقت / جس میں سائیکل رکشے
سکوٹر / روڈ میں مصروف ہیں۔

لوکل بسوں کا اڈا چالو / جاری و ساری ہے / دیکھ سکتا ہوں کہ ٹھنڈا
نیم جاں / توس، اک کپ چائے کا۔ بیا شتہ / اس جسم و جاں کی آبیاری کے
لیے کافی نہیں ہے / جو ضعیف العمر والد / اور سدا بیمار ماں کا بوجھ / اپنے ناتواں

کندھوں پہ سے گھر چل رہے ہوں
(بچی کسی اسکول میں آٹھ گھنٹوں تک پڑھا کر شام کو گھر لوٹتی ہے)
دوسرے دن بھر کے / اپنے سائیکل کے کیریر کے بیگ میں پوشیدہ
رکھ کر / جتنے چہرے سے کھوگی /
ماں تمہارے واسطے گھورا ہوئی ہوں / ذرا پیچھے کر تو دیکھ /
دیکھ سکتا ہوں / تمہارے بھول سے ماتھے پہ شکنیں پڑ رہی ہیں / تم
زیادہ عمر کی لگنے لگی ہو / ختم ہوا شام کا اک مرحلہ ہے جانتا ہوں / ختم ہوا زندگی کا
کس قدر آسان ہے / میں بیسویں منزل کی اونچائی پہ ہوں /
نیرس کھلا ہے /

(ص۱۱۰_۱۵)

(یہ اردو کی شاعری ہے، جس پر کتنی غزلیں، کتنی دیو پری کی مثنویاں
قربان کی جا سکتی ہیں۔ کتنی حقیقت نگاری، کتنے درد کے چشمے، یہ اس بچی کی داستان
ہے جس نے وہیں پالی کر گھر کی طرح دنیا کا بوجھ اٹھانے کی ہمت مانگی تھی)

نظم ۳۹ "میری کھڑکی"

دس برس پہلے تلک کھلتی تھی / بائیں باغ کی جانب۔ جہاں سے /
گیلی مٹی اور پھولوں کی مہک / چڑیوں کی میٹھی چہچہاہٹ / کھیلتے بچوں کا شور وغل /
مجھے مژدہ سناتے تھے کہ میں زندہ ہوں /
(ہر برس کھڑکی ایک منزل کے برابر اونچی ہو جاتی ہے)
میں فقط بادل کے ٹکڑوں / ایک پڑیا میں بند سے آکاش کو ہی / دیکھ
سکتا ہوں
زندہ ہونے کا وہ مژدہ / اس بلندی پر مرے کانوں سے ٹکراتا نہیں
ہے / میں تو شاید مر چکا ہوں /

(ص۶۷_۶۸)

نظم ۴۵ "انجیل میں لکھی عمر" (انجیل میں انسان کی فطری عمر
Three acores and ten یعنی ۷۰ سال لکھی ہے

(شاعر نے سوچا تھا) اب میں خود کو کر / خود کو پانے کی منزل کی
جانب چل نکلا ہوں / اپنی عمر کی سرحد پر آ کر بھی ایسے کیوں لگتا ہے / سب کچھ مبہم
غیر یقینی بھول بھلیاں / دھند میں کچھ بھی نہیں ہے /

(ص۸۰_۸۱)

نظم ۵۰ "غزلوں کی چیونگم اور کاکروچ" (چیونگم Chewing
gum) اردو میں پچھلی صدیوں میں / شاید ایک کروڑ سے کچھ اوپر ہی غزلیں لکھی
گئی ہیں / شاعر بے چارہ بیمار ہے موضوع کہاں سے ڈھونڈے /
آج کا شاعر ہو غزل کا رسیا مستقبل کا شاعر / دونوں چیونگم سے چپکے
جس کا کروچ ہیں

نظم ۹ "قصہ طوطا جا"

ملک گیری کی ہوس میں / جنگ میں / یا دین و مذہب کے فسادوں
میں / کروڑوں لوگ مر جاتے ہیں اپنی نسل کے ہاتھوں / آدمی کی نسل ہی / ساری
خدائی میں اکیلی ہے / جو اپنی نسل کش ہے /

(ص۱۳۰_۳۱)

نظم ۱۲ "سمبایاسز" (Symbiocosis)

(کچھ بزرگ پیڑ یعنی بوڑھے، کچھ رفیق پیڑ یعنی بھائی دوست،
ساتھی، کچھ عزیز پیڑ شاداب کونپلوں سے بھرے یعنی معصوم بچے)
یہ پیڑ میرے ہی جسم سے پھوٹ کر اُگے ہیں / میں ان کے جسموں
سے شاخ در شاخ اُگ رہا ہوں

(ص۱۳۲_۳۳)

نظم ۱۳ "The mid life crisis" (آتندری کی نظموں
میں یہ موضوع اکثر ہے کہ زوال کی عمر میں دفعتہً زوجیت واضح کر سکے)
اے مری جان / الوداع کہو / مجھ کو یا میرے جسم کو......
چھوڑ دو اس کے حال پر / اب یہ / ریت کی ڈھیلی سرد مہری سے /
یوں لپٹ کر بغیر جذبے کے / سو نہیں سکتا /

(ص۱۳۷_۳۸)

نظم ۱۴ "اور کوئی شاداب نیا دن"

اپنے وطن میں کئی ہزاروں دنوں تک کام پر جا، شام کو کھانا کھا کر
سو جانا، سوچا تھا کوئی شاداب نیا دن بھی آئے گا؟
پھر نئے وطن میں نئی نویلی دلہن سا / اک نیا دن آسمان سے نیچے
اترا / (اور اب) کئی ہزاروں دنوں تک ایک تھکے کمبل سا / اپنے تن کے گرد لپٹے /
تھک سا گیا ہوں /
کس سے پوچھوں / اور کوئی شاداب نیا دن بھی اترے گا آسمان
سے؟ /

(ص۱۳۹_۴۰)

نظم ۱۵ "دے مرے مولا رہائی" (شاعر کتنی قیود سے رہائی مانگتا
ہے)
(۱) شاعری کی قید سے / (۲) دوستوں سے / جو ہمیشہ تاک میں رہتے ہیں / مجھ کو
گھیر کر مجبور کر دیں /
کوئی تو مہمل مقالہ، تبصرہ لکھوں / کہ جس میں ان کی تعریفوں کے پل باندھے
گئے ہیں / (۳) سوچ سازک سے / جو آتی تخت ہے...... / (۴) صبح اٹھ کر کام پر
جانے سے / میں آرام کرنا چاہتا ہوں / (۵) اس وفا کی مورتی، ایثار کی دیوی

سے / جو آدھی صدی سے ساتھ میرے اس طرح چپکی ہوئی ہے / جیسے کوئی جونک ہو / سارا لہو پی کر بھی پیاسی رہ گئی ہو /

(آخری پابندی سے رہائی کی خواہش پر مجھے سخت احتجاج ہے)

(ص ۴۳۔۱۴۴)

نظم ۶۶ ''آخری چٹان تک'' (اس نظم کا نقش اول ۱۹۹۳ء کے مجموعے 'وقت لا وقت' میں ملتا ہے آخری مجموعے میں یہ اسے نام تبدیلی ہے)

وہ ہوس کی آخری چٹان تک پہنچا تو پانی بڑھ چکا تھا /

(ص ۱۴۵)

نظم ۶۷ ''جو مجھ کو عورت بنایا ہوتا مرے خدا نے''

(اس نظم میں اس نظام پر تنقید کی ہے جہاں عورت کی کوئی آدھی مانی جاتی ہے... ایک تجارتی معاہدہ ہے شوہر مجازی خدا ہے زوجہ خادمہ کی خادمہ ہے ایک لفظ کو تین بار ادا کرنے سے یہ رشتہ ایک پل میں ٹوٹ سکتا ہے بڑی جسارت کی ہے آنند نے یہ سب کہنے میں۔ نظم کا تقاضا اس عنوان کا تھا جو مجھ کو عورت بنایا ہوتا مرے خدا نے لیکن اعتراض کی دھار کی تیزی کو کم کرنے کے لئے صیغہ واحد متکلم استعمال کیا ہے)

(ص ۱۴۷۔۱۴۸)

نظم ۶۸ ''جگل بندی'' (یہ نظم ۶۲ اور ۶۶ سے آگے کی منزل ہے آنند کلاسیکی موسیقی کی اصطلاحوں میں بولتے ہیں اس لیے پوری نظم موسیقیت میں ڈوبی ہوئی ہے)

یہ جسموں کی جگل بندی / جسے چالیس برسوں سے / مقرر کیا ہوا ہے اس طرح مدھم سے پنچم تک / کہ یک آہنگ دو جسموں کے سُر سنگیت کی لہریں / بہم مل کر ہماری زندگی کے راگ کی تکمیل کرتی ہیں / چلو آؤ / یہ امرت رس میں بھیگا سر ملن / اب اپنے جسموں کی حدوں سے دور نیچے / روح کی گہرائیوں میں ڈوب کر / اک ایسے انوپ راگ میں ڈھالیں / کہ یہ سمبندھ سرگم کا / یہ سنگت پریم بندھن میں بندھی دو آتماؤں کی / رہے قائم جگل بندی میں آنے والے جنموں تک /

(ص ۱۴۹۔۱۵۰)

(نظم ہندی اور ہندو پس منظر میں لکھی ہے جوانی میں جب جسموں کا سمبندھ ہوتا تھا تب بھی راگوں اور سُروں کا ملن ہوتا تھا اب جسموں کی حدوں سے دور نیچے یہ تمنا کی ہے کہ روحوں کی گہرائی میں یہ سمبندھ جاری رہے نہ صرف اس جنم میں بلکہ آنے والے جنموں میں بھی۔ کہاں یہ ارفع تصور کہاں اس سے پہلی نظم کا حساب تجارت)

آنند کیسے قادر الکلام شاعر ہیں۔ عمر بڑھنے کے ساتھ جس طرح وصل میں شوق کا زوال ہوتا ہے اور اس سے بعض رسیا طبیعتوں کو جس طرح مضمحل کر دیتا ہے اسے انہوں نے تہذیب کے پرکاری کے ساتھ شرح کیا۔ میر جیسے استاد نے ایک شعر اسی محرومیت کو غیر شاعرانہ انداز میں پیش کیا ہے

راحت دنیا سے کیا بہرہ ہمیں
پاس عزت ہے وطے ہے ضعف باہ

آنند نے اس نازک پردے کی بات کو کیسا فنکارانہ اظہار عطا کیا ہے۔ تعریف نظم میں اتحاد جسمانی کے جزئیاتی بیان سے بہت چڑتا ہوں ناپسند کرتا ہوں یہاں اسے کوئی ماہر سنگ تراش کی طرح جھلملاتے پکپاتے پردے میں پیش کرتے تو اس سے ایک انوکھی حظ کا احساس ہوتا ہے

جی چاہتا تھا کہ قارئین و حاضرین کے ساتھ آنند کی کچھ اور نظموں میں ڈوبتا تیرتا چلوں لیکن نثار کا دائرہ کب ایک یا دو عوامل آنند کی زبان کے بارے میں:

خلاف توقع و معیاری لفظیات و شعریات سے خاصی واقفیت رکھتے ہیں۔ کسی لفظ کے آخر میں ایک ساکن مصرعے (Vowel) کے بعد حرف ع موقوف آئے تو ہم اہل اردو اس کا تلفظ نہیں کرتے مثلاً ''وداع'' ''موضوع'' میں۔ پریشانی یہ ہے کہ اردو عروض کا مطالبہ ہے کہ اسے حذف نہ کیا جائے اگر ایسا لفظ مصرع کے بیچ میں آتا ہے تو آخری عین کو متحرک کر کے اگلے لفظ کے شروع میں مُشک کر کے بولتے ہیں۔ میری رائے میں یہ تکلف بے جا بلکہ تعقید بے جا ہے۔ حیرت ہوئی کہ آنند نے اسے کہیں حذف نہیں کیا۔

یہ موضوع سب مرے پڑھے ہوئے ہیں ('' آخری چٹان تک'' ص ۷۲)
شاعر بے چارہ پریشان رہے موضوع کہاں سے ڈھونڈے (ایضاً ص ۱۱۲)
اے مری جان الوداع کہو (ص ۱۳۶)
آخری بار الوداع کہو (ص ۱۳۸)

نظم کے وزن کا ساتھ دینے کے لئے ان سب میں عین کو ادا کیا ہے۔ دوسری طرف ان کے یہاں بعض اوقات بے احتیاطی بھی دکھائی دے جاتی ہے مثلاً ''مستقبل آنجہانی'' کی نظم مہاجر کے آخری مصرعے یوں ہیں

چڑھتا رہا اللہ اللہ / ذکریا ذکریا ذ..... ک..... یا

(ص ۸۳)

کتاب میں ذکریا تخمیر کا نام ''ذال'' سے چھپا ہے اس طرح مصرع کا آخری لفظ خوش ہو جاتا ہے صحیح ''ز'' سے ہے ممکن ہے کہ انہوں نے ذکریا اور ذکر لکھا ہو۔ سہو طباعت نے اسے ذال میں بدل دیا ہوگا۔ اس کے باوجود کم از کم ساتی اعتبار سے ذم کا پہلو تو مضمر رہے گا ہی۔

آنند کے شعری مجموعوں میں ایک بھی ''شعر'' نہیں کیونکہ ان کی

اکائی "مصرع" ہے "شعر" نہیں۔ یہاں غزل دروازے میں سے جھانک کر اپنی طرف توجہ مبذول کرانا چاہتی ہے۔ "مستقبل آ مجھ سے مل" کے فلیپ پر ڈاکٹر نارنگ جیسے جدید و مابعد جدید نقاد نے کہا ہے "ہر چند کہ میں ان لوگوں میں سے ہوں جن کے ذہن سے بادۂ پارینہ کی بو نہیں گئی اور جو غزل کی معنویت اور مرکزیت کے بغیر اردو شعریات اور جمالیاتی روایت کا تصور بھی نہیں کر سکتے"

اور میں بھی غزل کا حشیش چشیدہ ہوں۔ میں ایسے شعریت آمیز یا فکر انگیز اشعار کو کیونکر بتا نہ دوں۔

غزل اس نے چھیڑی مجھے ساز دینا
ذرا عمر رفتہ کو آواز دینا

(صفی)

کوئی آگاہ نہیں باطن یک دیگر سے
ہے ہر اک فرد جہاں میں ورق ناخواندہ

(غالب)

ہستی کے مت فریب میں آجائیو اسد
عالم تمام حلقۂ دام خیال ہے

(غالب)

ہے آدمی بجائے خود اک محشر خیال
ہم انجمن سمجھتے ہیں خلوت ہی کیوں نہ ہو

(غالب)

اب بھی اک عمر پہ جینے کا نہ انداز آیا
زندگی چھوڑ دے پیچھا مرا میں باز آیا

(شاد)

لیکن میں کلاسیکی غزل پر جدید غزل کو ترجیح دیتا ہوں۔

وقت کی ڈور خدا جانے کہاں سے ٹوٹے
کس گھڑی سر پہ لٹکتی ہوئی تلوار گرے

(شکیب جلالی)

رہتا تھا سامنے ترا چہرا کھلا ہوا
پڑھتا تھا میں کتاب یہی ہر کلاس میں

(شکیب جلالی)

یوں ہوا ہے چاک ملبوس یقیں سلتا نہیں
پھینک دینا بھی ہے مشکل، دوسرا ملتا نہیں

(عمیق حنفی)

تمہارے سر پہ کئی آسماں کے سائے ہیں
ہمارے پاؤں تلے تو کوئی زمیں بھی نہیں

(سلطان اختر)

میں غزل کی گردن مارنے کے حق میں نہیں۔ اس کا تناسب کم کرنے کی ضرورت سمجھتا ہوں۔ پاکستان میں فیض الرحمٰن اور ساتھیوں نے ایک پروجیکٹ کے تحت جائزہ لیا تو معلوم ہوا کہ ۱۹۸۱ء اور ۱۹۸۲ء کے درمیان پاکستانی رسالوں میں چھپنے والی شعری تخلیقات میں ۸۱ فی صد غزلیں تھیں۔ میں متفق ہوں کہ یہ تعداد بہت کم کردی جائے۔ پہلے میں ۳۰ فیصد پر آیا تھا۔ آنند کی نظمیں پڑھ کر میں محسوس کرتا ہوں کہ غزلوں کو ۱۵ فیصد زمین مل جائے تو کافی ہے۔ دراصل غزل ہم اردو والوں کے لئے ایک نشے، ایک لت کی طرح ہے جیسے سگریٹ یا شراب یا ہیروئن (ہائے مفتوح اور یائے لین کے ساتھ، دوسرا حرف یائے معروف ہو تو کسی کو کیا اعتراض) ہوں۔ نظم روزانہ کے دل پسند طعام کی طرح ہے۔ آنند کی نظموں کی حقیقت نگاری، ان کی ارضیت کی بو باس، ان کی علاقائی سرسراہٹ، اس کی مٹی کا سوندھا پن اور سبزے کی لہلہاہٹ آپ کو مجبور کر کے غزل کے بادلوں سے اتار کر زمین کا لوک گیت سنائے گی۔ کاش آنند نے قافیے کی موسیقیت سے ترک موالات نہ کر دیا ہوتا۔ ن۔م۔ راشد اور فیض نے نظم معرا میں بھی بارہا مصرعوں میں ایک نہیں کئی کئی قافیے استعمال کئے ہیں۔ آنند بھی اس کا فائدہ اٹھاتے تو بہتر ہوتا۔ ویسے وہ شعریت سے محروم نہیں۔ ان کے یہاں ایسے مصرعوں کی کمی نہیں ہے۔

☆ میں نیند کے سو رنگ رنگوں کی جھیل میں ڈوبنے سے پہلے
☆ ہراس سبز کھڑکیوں سے سٹ کر کھڑا ہوا تھا
☆ آسماں کی گیلی لکڑی سے بندھے بے بس اندھیرے
☆ رات کی اندھی چڑیلیں چیختی ہیں
☆ اپنے سائے کی خنک چادر سمیٹے
☆ کیا یہی کچھ ماحصل لاحاصلی تھا؟
☆ میں کئی قرنوں سے اپنی کھال کی چادر لپیٹے

شروع میں آنند بھی غزلیں کہتے تھے۔ مشفق تلوک چند محروم نے انہیں سمجھایا کہ غزل چھوڑ کر نظم کہیں۔ آنند صاحب دنیا بھر کی سیر کر کے، عالمی ادب، فلسفہ اور آرٹ کا مطالعہ کر کے اس نتیجے پر پہنچے ہیں کہ اردو ادب کی نجات نظم سے ہے، غزل سے نہیں۔ مجھے یقین ہے کہ آپ ان متنوع نظموں کی بوقلمونی دیکھ کر "آنند مارگی" ہونا پسند کریں گے۔

☆

مرگِ پیش آگہی

اختر عبداللہ

میں ڈاکٹر ستیہ پال آنند سے لگ بھگ پندرہ برس پہلے متعارف ہوا۔ زمانہ طالبعلمی میں ان کی منظومات اور کہانیاں بڑے شوق اور انہماک سے پڑھا کرتا تھا۔ لیکن ذاتی طور پر ان سے کوئی رابطہ نہیں تھا۔ علیگڑھ مسلم یونیورسٹی المنائی ایسوسی ایشن کے ایک کارکن کی حیثیت سے مجھے یہ موقع ملا کہ ستیہ پال آنند صاحب کی واشنگٹن ڈی سی میٹرو پالیٹن ایریا میں ۱۹۸۸ء میں آنے کے بعد ان کے لئے ایک اعزازی نشست کا انعقاد کروں۔ اس طرح نہ صرف ان سے ذاتی طور پر متعارف ہونے کا موقع ملا۔ بلکہ یہ تعارف ربط اور رابطے کے پڑاؤ طے کرتا ہوا بالآخر دوستی کی شکل میں مستحکم ہوا۔ مجھے اس بات کا فخر ہے کہ دیار مغرب میں ان کے احباب کی فہرست میں میرا بھی کہیں نام ہے۔

ڈاکٹر آنند کی منظومات میں ایک موضوع جو مختلف شکلوں میں گذشتہ تین برسوں سے در آیا ہے وہ اردو شاعری میں پہلے بہت کم دیکھا گیا ہے۔ یہ موضوع Death Consciqusness کا ہے۔ اردو شاعر جو عمومی طور پر غزلیہ شاعری میں حسن و عشق یا ترقی پسند تحریک کے زمانے میں انقلاب، کسان اور مزدور سے متعلق موضوعات سے یا پھر جدیدیت کے دور میں تحلیل نفسی، انتشار اور فشار کے مضامین کو لے کر اپنا تخلیقی سفر طے کرتا رہا ہے بہت کم لوگ آگاہی یا مرگ پیش آگاہی کی مختلف جہتوں کے رموز کو لے کر اس راہ پر گامزن ہوئے۔ اس لئے یکے بعد دیگرے ڈاکٹر آنند کی لگ بھگ تیس نظمیں گذشتہ کچھ برسوں میں ان موضوعات پر میری نظر سے گزریں تو مجھے عجب سا محسوس ہوا۔ کیا یہ نظمیں کسی ناگہانی حادثے کا پیش خیمہ ہیں؟ کیا نجوگ سے جوگ کی طرف بوڑھوں کی طرح وہ گیان دھیان کی باتیں کرنے لگے ہیں؟ جواب چاہے کچھ بھی ہو، یہ حیرت کی بات ہے کہ ڈاکٹر آنند نے جہاں پانچ سو سے کچھ اوپر نظمیں لکھ کر اردو شعری ادب میں اپنا ایک منفرد مقام بنایا ہے۔ جہاں ان کے پیچھے چلنے والے تو بہت ہیں لیکن ان کا مثیل پیشرو کوئی نہیں۔ ہندو کیوں ان موضوعات پر لکھنے لگے ہیں؟ یہ نظمیں ایسے موضوعات کے بند کواڑ کھولتی ہیں۔ جنہیں اردو کی روایتی شاعری نے ممنوعات کی فہرست میں درج کئے رکھا ہے۔ ڈاکٹر آنند کے ایک دوست ڈاکٹر احمد کنول نے (ڈاکٹر آنند پی ایچ ڈی میں ان کے مشیر رہے ہیں) ان کی نظم "تیرا زخم" پر تبصرہ کرتے ہوئے ایک بار حضرت علیؓ کے اپنے بیٹے حضرت حسینؓ کے لئے تحریر کردہ وصیت نامہ کا ایک اقتباس پیش کیا تھا۔

"موت تیرے تعاقب میں لگی ہوئی ہے تو اگر بھاگے گا بچ نہیں سکتا..... ایک نہ ایک دن تجھے شکار ہونا ہے۔ لہٰذا ہوشیار رہو کہ موت ایسی حالت میں نہ آ جائے کہ تو ابھی توبہ اور انابت کی فکر میں ہی ہو اور وہ درمیان میں حائل ہو جائے۔ ایسا ہو تو بس تو نے گویا خود کو ہی ہلاک کر ڈالا....."

جو لوگ ڈاکٹر آنند کو قریب سے جانتے ہیں وہ مجھ سے اتفاق کریں گے کہ ڈاکٹر آنند نہ صرف اسلامی ادب سے بخوبی واقف ہیں بلکہ قرآن مجید کے ارشادات انہیں حفظ ہیں۔ یہ حقیقت صرف اسلام تک ہی محدود نہیں ہے بلکہ کلیسائی ادب، بودھی ادب، یہودی ادب اور دینیات کی کتابیں ان کے آس پاس بکھری رہتی ہیں۔ اور رات میں دیر تک ان کا مطالعہ کرتے ہیں۔ اس لئے یہ بعید از قیاس ہو گا کہ ڈاکٹر آنند اس احساس سے نا واقف ہیں خصوصی طور پر جب کہ وہ دو کلیدی الفاظ "توبہ" اور "انابت" ان کی نظم "تیرا زخم" کی بھی کلید کل ہوں۔

ڈاکٹر آنند کی ان نظموں کو تجزیے کی سہل نگاری کے لئے چار حصوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے۔ (ایک) وہ نظمیں جو میری موت کیسے ہو گی؟ کس طرح سے مجھے دبوچے گی؟ میں کیسے مروں گا؟ یعنی "مرگ شناسائی" یا "مرگ آشنائی" کی نظمیں ہیں۔ یا مرگ کی دائمی خواہش یا خاموشی سے قفس عنصری سے روح کے پرواز کر جانے کی اُمید پرستی ہیں۔ (دو) وہ نظمیں جو "موت کے بعد کیا ہو گا؟" میں کیا رہوں گا جو اب ہوں یا کسی اور شکل میں تبدیل ہو جاؤں گا؟ یعنی پیشین گوئی کی نظمیں ہیں۔

(تین) وہ نظمیں جن میں خالق عالم سے تخاطب ہے یا سزا و جزا کے تصور پر بحث و مباحثہ ہے۔ اور (چار) وہ نظمیں جن میں نظم کا تخلیق کار خود کو صرف ایک عام انسان نہ سمجھ کر ایک شاعر کے طور پر دیکھتا ہے اور خود کو کسی ولی سے کم نہیں سمجھتا اور اس لحاظ سے موت کو زندگی کا ایک وقفہ سمجھ کر "آواگون" کے فلسفے کی تاکید کرتا ہے۔ پہلے زمرے کی نظمیں تعداد میں بارہ ہیں۔ ان میں "کرٹین کال" کے بعد "Ars Moriendi" "شیشے میں ایک گھڑی ہے" "شیر اور میں" "تنکا ڈھلک گیا ہے" اور "سائرلین" وغیرہ مثال کی جا سکتی ہیں۔

"کرٹین کال کے بعد" میں استعارہ تھیٹر ہال کا ہے جہاں ایک شو کے اختتام کے بعد تالیوں کی گونج میں اداکار Last Bow لیتے ہیں۔ جب پردہ پھر گر جاتا ہے تو اکثر بیشتر اداکار تھیٹر کے عقبی دروازے سے نکل کر اپنے اپنے گھروں کو لوٹتے ہیں۔ آنند صاحب منظری کی مدد سے اس "بے دخلی" کے منظر کو مختلف منظر ناموں میں پیش کرتے ہیں۔ ہر منظر نامے کا تصویری مفہوم کسی نہ کسی طرح کی موت کا اعلانیہ ہے۔ کچھ اموات شور شرابے کی آواز کی طرح ہیں۔ جنہیں دنیا دیکھتی ہے۔ سنتی ہے اور ان کا ماتم کرتی ہے۔ کچھ اموات چپکے سے بغیر کسی کے ماتم کے وقوع ہو جاتی ہیں۔ سوال و جواب کے فریم آف ریفرنس میں ہر نظم اس طرح شروع ہوتی ہے

☆ "ستھے پال آنند تاؤ/ کرنٹین کال کے بعد تمہارا/ زیست کے پچھلی دروازے سے یہ بدخلی کا منظر آخر کیسا ہوگا؟"

پھر ایک کے بعد دیگرے چھ منظرنامے پیش کیے جاتے ہیں۔ ہر منظرنامہ اس "مرگ آشنائی" یا "مرگ شناسائی" کی ایک ممکنہ (Possible) یا امکانی (Probable) تصویر پیش کرتا ہے۔ لیکن ایک بات بالکل یقینی Certain ہے کہ موت سر پر کھڑی ہے کرنٹین کال کے بعد بےدخلی ہوگی۔

☆ کیا تم بچے توے پر گندے تیل سے جلتے/ آگ بجھاتے' سڑسڑ کرتے/ بھک سے اڑ جاؤ گے

☆ یا اک بھاری مرتبان کے گر کر ریزہ ریزہ ہونے/ کی آواز سے/ اپنی شکست ذات کا خود اعلان کرو گے؟

☆ ربڑ کی گیند کے سوراخوں سے/ سوں سوں کرتی ہوا کی کاتا بھی جیسے/ پچکے کان لپیٹ کے خارج ہو جاؤ گے؟

☆ یا پھر ایک ٹونٹی سے دھار میں بہتے بہتے/ قطرہ قطرہ خود کو ضائع کرتے کرتے/ آخر گیلی مٹی میں دب جاؤ گے؟

☆ کیا تم میں ایسی جرأت ہے/ ایک چمکتے سورج کی مانند آگ اگلتے/ دور خلا میں "کوئی خدا ہے" کہتے کہتے/ تم آخر ایک بلیک ہول ہی بن جاؤ گے؟

یا پھر کرنٹین کال کے بعد سب ہی ایکٹر کرتے ہیں/ تم ایک ماچس کی تیلی کی طرح بھڑک کر/ ننھا سا اک گل دہکا کر/ ایک لمحے میں بجھ جاؤ گے؟

"مشہوری بس ایک گھڑی ہے" حالانکہ متون کے نقطۂ نظر کے حوالے سے ایک مختلف موضوع کی شاعری کرتی ہے پھر بھی اس کا Image Pattern موت کے مختلف منظرناموں کی ایک کڑی ہے سوال و جواب کا یہ فریم آف ریفرنس اس نظم میں خودکشی کی سطح پر ہے۔ کس سے پوچھوں؟ سے یہ نظم شروع ہوتی ہے اس کے بعد مختلف منظرنامے ہیں۔

☆ اک ٹوٹے تارے کی طرح جو اس جل کر/ میرے دھرتی پر گرنے کے بعد بھلا کوئی پوچھے گا/ کون شخص تھا؟

☆ شاید میرا نام کسی گلدان میں رکھے/ سوکھے گلدستے سا/ پھولوں کی خوشبو کی یاد دلاتا/ رہ جائے حساس دلوں میں!

☆ شاید کوئی یاد کرے اس قوس قزح کو/ جس نے رنگی تھی لوگوں کی سوچوں کے تاریک افق پر؟

☆ شاید کوئی استعجاب کے لہجے میں یہ بھی پوچھے گا/ کیسا شخص تھا، جس نے خشک بیاباں میں پانی کے چشمے/ اپنے پیچھے آنے والے/ پیاسے صحرا گردوں کی خاطر ڈھونڈے تھے؟

Ars Moriendi (فرانسیسی یعنی "موت کا فن") اس نظم کے حوالے سے ہے جس میں کہا جاتا ہے کہ بوڑھے ہاتھی جب ناکارہ ہو جاتے ہیں تو چپکے سے جا کر جنگل میں ایک ایسی جگہ لیٹ جاتے ہیں، جس کو فرنگی "ہاتھیوں کا قبرستان" کہتے ہیں۔ وہاں دنوں ہفتوں تک کچھ کھائے پیے بغیر یہ ہاتھی بیٹھ کر موت کا انتظار کرتے ہیں۔ اس نظم کا پہلا بند یہ ہے۔

☆ "کبھی جھکڑ سے ہوا بانسوں میں اس کو/ کان میں سرگوشیاں کرتے ہوئے پھسلائے' پھر اک سال رک جاؤ/ کہ جانا تو سبھی کو ہے/ مگر جلدی بھی آخر اس قدر کیا ہے؟

اس کے بعد تین کے لگ بھگ سطروں میں بوڑھے ہاتھی کو ملائم دھوپ' نٹ کھٹ بادلوں کے جھنڈ' درخت' طائر اور دیگر مظاہر قدرت ترغیب دیتے ہیں کہ ابھی کچھ دن اور زندہ رہ کر زندگی کے مزے لوٹو۔ آخری سطریں البتہ فیصلہ کن ہیں۔

☆ مگر جاتا ہے کچھ دیر پہلے یا ذرا تاخیر سے/ وہ سوچتا ہے/ پھر میرے پرکھے بھی اپنی زندگی کے/ سارے بندھن توڑ کر/ جاتے رہے ہیں اپنی مرضی سے/ چلوں اب میں بھی جا کر لیٹ جاؤں/ موت آئے گی تو اس کے/ استخوانی ہاتھ کی انگلی پکڑ کر/ چل پڑوں گا میں۔

"شیر اور میں" میں منظرنامہ سرکس میں شیر کے سدھانے والے فنکار کا ہے جو اپنے آخری شو میں سرکس منیجر یا سامعین کو خبر کیے بغیر بوڑھے شیر (زندگی) اور خود اپنی موت کا حقیقی منظر (Live Show) میں پیش کرنا چاہتا ہے۔ آخری سطریں یہ ہیں۔

☆ میرا ٹوٹو قدردو تو/ آج شب میں اپنا سر جب/ شیر کے منہ میں بہت دھیرے سے رکھ کر/ اپنی آنکھیں میچ لوں گا/ اور پس منظر میں سازندے بگل/ آخری "ڈیڈ مارچ" کی دھن تیز کرکے/ روک دیں گے/ روشنی کا ایک ہالہ مجھ پر ہی مرکوز ہوگا تو میرا اپنا سدھایا/ میرا ہمدم شیر اپنا پہلا کرتب بھول کر/ یکبارگی جبڑوں کو اپنے بند کرکے/ میری گردن کاٹ دے گا/ میرا ٹوٹو قدردو تو/ شیر اور میں/ ہمدم اور دیرینہ شریک/ اپنی پابندی سے یوں آزاد ہوں گے!

"فنکار تھک گیا ہے" میں Protagonist یعنی نظم کا واحد متکلم ایک نٹ ہے جو دو مضبوط بانسوں سے بندھی ہوئی رسی پر ایک سرے سے دوسرے سرے تک چلتا ہے یعنی قدم بقدم زندگی کا سفر رسی پر چل کر طے کرتا ہے اور تماشائی اسے دیکھ کر تالیاں بجاتے ہیں۔ نظم کی آخری سطریں یوں ہیں۔

☆ اپنے کرتب میں تماشا ہو/ تماشائی نہیں ہو/ میرے اندر کا یہ کرتب باز نٹ کہتا ہے مجھ سے/ اور اس سچائی کو پہچان کر بھی/ اپنے اندر کی حقیقت جان کر بھی/ ننگے پاؤں میں تنی رسی پہ چلتا/ لڑکھڑاتا' ڈولتا' کچھ کچھ سنبھلتا/ خود سے اتنا پوچھتا ہوں/ کتنی دوری اور طے کرنی ہے مجھ کو؟

دوسری اور تیسری قسم کی نظمیں پیش از مرگ کی نظمیں نہ ہو کر بعد از مرگ کی نظمیں ہیں۔ فلسفے کے اعتبار سے یہ نظمیں زیادہ اہم ہیں۔ ان میں تتھاگت سیریز کی چھ نظمیں بھی شامل کی جا سکتی ہیں۔ جن کا ذکر یہاں نہیں ہوگا لیکن کچھ نظمیں جو اسلامی' ہندو اور عیسائیت کے عقیدوں پر استوار کیے گئے منظرناموں

پرچکی ہیں۔ ان کا ذکر آ گزرا ہے۔ ان نظموں کے اسلوب میں خود کلامی، مکالمہ، خطاب، علامت، فکر کی مختلف ترکیبیں استعمال کی گئی ہیں۔ خطاب کا لہجہ زبان آور ہونے کی حد تک جوش بیانی کا شکار تو نہیں ہوتا لیکن اس میں سخن آرائی کی فصیحانہ طلب المعانی موجود ہے۔ اپنی بات کہنے میں ان نظموں کا واحد متکلم یا راوی عدم تصنع سے بات کہتا ہے۔ اس بے تکلفی کی بنا پر دو ٹوک بات میں احتجاج تو ہے ہی، کسی حد تک کرختگی اور درشتی بھی ہے۔ انہیں پڑھ کر اقبال کے شکوہ کی یاد تازہ ہوتی ہے۔ جس میں خدا سے براہ راست "تو" کے لہجے میں مخاطب کر کے شکایت اور منافقت سے دل کی بھڑاس نکالی گئی ہے۔

"ذرا حوصلہ رکھ" میں "شکوہ" اور "جواب شکوہ" دونوں کا تاثر دکھائی دیتا ہے۔ شروع کی سطور یہ ہیں۔

☆ "میں مدت سے تحت الثریٰ میں پڑا ہوں / تجھے علم ہے / میں نے اٹھنے کی کوشش میں کیا کچھ کیا ہے / بڑی جان توڑی ہے

جان توڑنے کی تفصیل درجن بھر سطور میں بیان کرنے کے بعد شاعر پوچھتا ہے۔

☆ میں اب تھک گیا ہوں / مجھے پوچھنے دو / یہ تیری مشیت ہے یا میری تقدیر کا ہے نوشتہ / یہی تیرا انصاف ہے میرے مولا / کہ مجھ جیسے مرد وفا ہر قدم پر / سنبھلنے کی کوشش میں گرتے رہیں؟

اور "جواب شکوہ" کی معنویت کا تاثر ان سطور میں ہے

☆ شکایت کے الفاظ / گھائل پرندوں کی مانند / تحت الثریٰ کی اندھیری فضا میں اڑے / تو دعا کے لئے ہاتھ بھی اٹھ گئے / کہیں اوپر سے آواز آئی / ذرا حوصلہ رکھ / اے میرے مالک۔

نظم "شاعر" میں احتجاجی عنصر درشتگی سے ابھرتا ہے۔ یہ نظم دعائیہ یا حمدیہ نہیں ہے۔ اس میں خدا ایک مطلق العنان ڈکٹیٹر کے طور پر پیش کیا گیا ہے جب کہ مدعی زنجیروں میں جکڑا ہوا باغی ہے۔ جس کی آواز کو دبانا کار سے دار والا معاملہ ہے۔ نظم میں بقول شاعر خدا الگ ہے اس کے پاس کوئی جواب نہیں۔

☆ فصیلوں کے اس پار باب حجر تک / بہت دیر ٹھہرا رہا ہوں / پھر آہستگی سے / اٹھوں، عذابوں کی گٹھڑی کو کاندھوں سے لے کے اتارا / کیا کوئی ہے جو پکارے مجھے / مجھ سے پوچھے کہ میں کون ہوں / اپنی گٹھڑی میں کیا کچھ اٹھائے ہوئے / دیر سے پھر رہا ہوں / فصیلوں کے اس پار کیوں پتھروں کے در آخرت پر کھڑا ہوں /

لیکن اسے کوئی جواب نہیں ملتا۔ در آخرت وا نہیں ہوتا اور شاعر کی اپنی ہی آواز بازگشت اس کے کانوں سے ٹکراتی ہے۔ آخری سطر یں مایوسی کا اظہار لیے ہوئے ہیں جیسے کہہ رہے ہوں، اگر کوئی ہے تو جواب کیوں نہیں ملتا۔

☆ فقط شام کے سائے تھے / اور باب حجر / کور آنکھوں کی بے مائیگی سے اسے تک رہا تھا!

اس کے بعد شاعر اپنا احوال نامہ پیش کرتا ہے جو حسب حال ہے اور غالب کے اس شعر کی یاد دلاتا ہے "پکڑے جاتے ہیں فرشتوں کے لکھے پر ناحق آدمی کوئی ہمارا دم تحریر بھی تھا"

☆ کیا پھر کوئی ہے جو کہتا ہو / تم بھی لکھتے ہیں لمحہ بہ لمحہ / میرے خیر و شر نیک و بد کا نامہ؟

☆ میرے کرم کاتبوں کا اعمال نامہ؟ / کہ میں خود حرف حرف و سخن ہوں / کہ میں خود حساب اپنا لکھتا رہا ہوں / کہ گٹھڑی میں میری وہ سب کچھ بندھا ہے / جو میں نے کمایا ہے / اچھا برا تو اسے دیکھتا ہے / جو کاتب ہے تقدیر کا اور میرے / نوشتے کو اس پار بیٹھا ہوا / اپنی مرضی سے یک طرفہ لکھتا رہا ہے

لیکن اسے جواب نہیں ملتا۔ باب حجر صرف اس کی آواز کی گونج ہی واپس اس کی طرف پھینکتا ہے۔ یہ سطر یں دل پر اپنا گہرا نقش چھوڑتی ہیں "جوابا فقط اس کی اپنی ہی آواز کی گونج تھی۔

سائے تھے

اور باب حجر تھا"

"میرا انگوٹھا کہاں لگے گا؟" اس احتجاج کی ایک اور مثال ہے۔ یہ نظم اختلاف اور ناراضگی، خدا کے انصاف کے تئیں بے اعتمادی اور تشکیک کے جذبے سے گندھی ہوئی ہے لیکن استعارہ ہندو پاک میں عدلیہ کا نظام ہے جو کرپٹ ہے جس میں گناہگار صاف بچ کر نکل جاتے ہیں اور بیچارے گنوار ان پڑھ بے قصور لوگ دھر لئے جاتے ہیں۔ اس لحاظ سے یہ نظم ظاہری حد تک (نعوذ باللہ) خدا کے غیر روادار رویے پر اعتراض اور احتجاج کی حامل ہے۔

☆ میں ایک ناخواندہ شخص / لایا گیا ہوں جکڑا ہوا سلاسل سے / اس عدالت میں جس کا قانون، ضابطہ / دھرم شاستر، شرع، شریعت / میرے لئے حرف مبہم ہے

☆ مگر میں جاہل گنوار اس عدلیہ کے دستور سے منحرف / جواب دعویٰ / مدعائے دعویٰ سے بے خبر نیک و بد سے غافل کھڑا ہوں۔

ہندو پاک کی کچہریوں کا یہ منظر نامہ ایک غیر مانوس سچائی نہیں، جانی پہچانی حقیقت ہے۔ اس کا اطلاق دھرم راج کی کچہری پر کرنا ایک ہندو کے لئے بے حد پر معنی ہے

دوسرا بند "ایک ناخواندہ شخص" کی تکرار سے شروع ہوتا ہے

☆ میں ایک ناخواندہ شخص / تقدیر کے گھر سے پوچھتا ہوں / مرا جو اعمال جرم آپ نے لکھا ہے / مجھے یقین ہے درست ہوگا / میں کتنے جنموں سے / اپنا کردہ جرم سارے / قبول کرتا ہوا آ رہا ہوں خود ہی / تو اب بھلا اس جنم میں کیا اعتراض ہوگا؟ / مجھے بتائیں مرا انگوٹھا کہاں لگے گا؟

"آسمانی ایلچی سے ایک مکالمہ" جو احمد ندیم قاسمی صاحب کی ایک نظم سے متاثر ہو کر لکھی گئی تھی اور انہی کے نام منسوب ہے۔ بازپرس کی شکل

میں خدا سے تو نہیں لیکن آسمانی ایلچی (جبرائیل) سے ایک سوال ہے۔ اس نظم کا واحد متکلم فرد واحد کے طور پر نہیں بلکہ جملہ انسانی برادری کے ترجمان کے طور پر سوال پوچھتا ہے۔ آخری سطور میں لہجہ کچھ درشت ہے۔

☆ اب کچھ کیا ارتقاء کی / آخری سیڑھی سے آگے کوئی چھت ہے؟ / اور اس چھت پر پہنچ کر / آل آدم اور ملائک اک برابر / آسمانی نور کا حصہ ہیں؟ جو فنا کی نہیں ہے / ارتقاء کی آخری چھت پر پہنچ جانے / کی صورت میں ہمارا / ابتر و کمتر موشی کے بدن میں / لوٹ آنے کا تو کچھ امکان نہیں ہے؟ / ایلچی بولو / تمہارے آخری پیغام کے ہم منتظر ہیں۔

میں نے یہ نظم پڑھنے کے بعد ڈاکٹر آنند سے پوچھا کہ ابتر و کمتر موشی کے بدن میں لوٹ آنے سے ان کی کیا مراد ہے تو انہوں نے آواگون کے سلسلے میں ہندو عقیدے اور بودھی عقیدہ میں تفاوت کا ذکر کیا ہے۔ ہندو عقیدہ کے مطابق ۸۴ لاکھ جونیاں انسان کے علاوہ باقی جانوروں کی بھی ہو سکتی ہیں یعنی ایک جسم کی بجائے یہاں دوسرے جسم میں روح کو ارتقاء کی سیڑھی پر نیچے کی طرف دھکیل کر ابتر و کمتر موشی کا جسم دے سکتی ہے جب کہ بودھی فلسفے میں انسانی روح جب دوبارہ جسم کا جامہ اوڑھتی ہے تو یہ جسم انسان کا ہی ہوتا ہے۔ اس کا اخلاقی درجہ کمتر و بہتر ہوتا ہے اور وہ نروان کی منزل سے زیادہ دور چلی جاتی ہے۔

چوتھی تحلیل کی نظمیں "مرگ پیش آگاہی" کی براہ راست نظمیں ہیں جن میں شاعر کو امید ہے کہ وہ موت کے بعد آگے سفر پر روانہ ہوگا۔ اس سلسلے کی پہلی نظم صرف پانچ سطروں پر مشتمل ہے۔

☆ اور کہا شاعر نے مرنے سے پہلے / دنیا شاید / میری عظمت سے انکار کرے گی لیکن / مجھ کو کیا پروا ہے اس فانی دنیا کی / میں نے اس سے بہتر دنیائیں دیکھی ہیں!

اس نظم کو شاعر "یوگ" کی کچی سادھی مانتا ہے یعنی ابھی وہ جنم نہیں آیا جس کے بعد اسے مکتی ملے گی "میں ابھی کچی سادھی ہوں" یوگ سادھنا کے استعارے میں ملبوس ہے۔ نظم کی پہلی سطروں میں یہ منظر نامہ ایک چارکول اسکیچ کی صورت میں ابھرتا ہے۔

☆ میں کئی قرنوں سے اپنی کھال کی چادر لپیٹے / چوکڑی مارے ہوئے بیٹھا ہوں /

☆ وہ جو مجھ سے پیشتر ہیں / اور سادھی سادھنا کے یوگ تک پہنچے ہوئے ہیں / اپنے شوآسن کی گہری نیند میں سوئے ہوئے ہیں /

☆ میں مگر کچا پکا یوگی / اب تک کچی سادھی میں ہوں / مجھ کو مت جگاؤ /
نظم کی آخری سطریں اس "مت جگاؤ" کو جملہ متعلق بناتی ہیں

☆ "مت جگاؤ" کوئی مردہ / اپنی کچی نیند جاگے (تو کہتے ہیں) / اسے زندہ کی دنیا میں پلٹ کر / اپنی کایا کے بنا آنا پڑے گا / میں ابھی کچی سادھی میں ہوں / آدھا سویا ہوں اور آدھا جاگتا ہوں / مت جگاؤ

اس نظم کے برعکس ڈاکٹر آنند کی ایک بہت مقبول نظم "خود نوشت سرگذشت" ہے، جو حسب با نظموں میں سب سے پہلے لکھی گئی ہے۔ اس نظم میں جمیل بیر اتند سوز "اسلام اور ہندومت جیسے آپس میں گلے مل رہے ہیں۔ جہاں لب آخرت ہے وہاں باب آخرت کو آخرش عبور کر کے ایک نئے جہاں کی سمت جانے کا تذکرہ بھی ہے۔ جو حیات بعد از ممات یعنی ایک نئے جنم کا اشارہ دیتا ہے۔

☆ جو سکے تھے گل ہوئے / جو راستے تھے کٹ گئے / جو منزلیں تھیں طے ہوئیں

تحلیل کے ساتھ سکوں کے گل ہونے، راستوں کے طے ہونے کا ذکر امیجری کی سطح پر تین امیجز کے ساتھ نظم کے تار و پود میں گندھا ہوا ہے

☆ گداگروں کی طرح / جو پڑاؤ سارا ست / طلب کے خوشگار تھے / صدائے خیر کے لٹتے شور میں / الجھ کے پیچھے رہ گئے۔ جو ہمسفر تھے / گرد کی ردائیں اوڑھ کر اندھیری گھاٹیوں کے موڑ مڑ گئے / بچھڑ گئے۔

جو تشنہ لب گزارشیں تھیں / پیاس کے سوال تھے / شگفتہ بیر حاصلی کے سب جواب مل گئے / تو فیضیاب ہو گئے۔

لب نظم کی ساعت عزیز سب کے لئے تک پہنچتی ہے۔ اس ساعت کی دید ایک "عصائے نور" ہے حضرت موسیٰ کے عصا کی طرح ہے جس نے نیل کو توڑ کر سمندر میں راستہ بنا دیا تھا۔ یہ ساعت عزیز جب شاعر کو ملتی ہے تو وہ فصیل شہر تک پہنچتا ہے۔

☆ جہاں رقم تھی / حرف حرف میرے باب زندگی پہ / عمر کے مرے سفر کی داستاں / عبور و جست ذات کی طویل داستان غم / شروعات سے تا ہنک / جسے میں شعر و لکھ چکا تھا شعر شعر / میرے سالوں کی روش روش بیاض میں

لیکن شاعر یہاں رکا نہیں کیونکہ ایک نیا جہاں اس کا منتظر ہے۔

☆ نوشتہ وجود وہ سب پڑھ گیا / میں خود نوشت سرگزشت پڑھ گیا / میں باب آخرت کو آخرش عبور کر کے / ایک نئے جہاں کی سمت آگے بڑھ گیا!

اللہ کرے ڈاکٹر آنند کو حیات خضر ملے لیکن "مرگ آگاہی" اور "مرگ پیش آگاہی" کی یہ نظمیں جو یکے بعد دیگرے ڈاکٹر آنند نے لکھی ہیں۔ یہ الگ قسم کی نظمیں ہیں۔ جہاں ان میں God negotion کے تضادات ہیں وہاں God Reaffirmation کے جملہ لوازمات بھی ہیں۔

نثر، شعر اور رمز و کنایہ کے سبکے تو ہر زبان اور ہر دور میں شاعری کی فکر کو اکساتے رہے ہیں اور ڈاکٹر آنند اس سے دامن نہیں چھڑا پائے لیکن یہ نظمیں ان کے احباب اور ان کے قارئین کو ان کی شاعری کی ایک نئی جہت سے روشناس کرواتی ہیں جو پہلے اردو میں کم کم دیکھنے میں آتی ہے اور ان کی نظموں میں بھی خال خال تھی۔

''لہو بولتا ہے''

(ایک سال کی تاخیر سے بھیجا جا رہا ہے۔ تفصیل معلوم ہو جائے گی۔ اس حالت میں یہ مضمون مکمل نہیں ہو سکے گا۔ بہت سی نظموں کا ذکر رہ گیا ہے۔ پر بجائے اسے مکمل کرنا چاہیے تھا کہیں چھپنے کے لئے بھیج رہا ہوں۔)

ہیرانند سوز

ستیہ پال آنند کا شعری مجموعہ ''لہو بولتا ہے'' (۱۹۹۷ء) مرتب کرتے ہوئے ۸۸ نظموں کے اس مجموعے کی آخری ایک درجن نظموں نے مجھے تعجب میں مبتلا کر دیا۔ یہ نظمیں باقی کی ۷۱ نظموں سے مختلف تھیں۔ آنند نے انہیں مروجہ شعری اصطلاح پوسٹ کارڈ نظمیں Picture Post Card Poems کی بجائے پوسٹیج سٹامپ Postage stamp نظموں کی اصطلاح دی تھی۔ پوچھنے پر آنند نے جو جواب مجھے دیا اس سے میری تسلی نہیں ہوئی' لیکن خود میں وہ ایک منطقی جواب تھا۔ اس نے کہا کہ اس کی یہ نظمیں اپنی جسامت اور حجم میں ان نظموں سے چھوٹی ہیں جنہیں زویرٹ بروک اور دوسرے شعراء نے پہلی جنگ عظیم اور دوسری جنگ عظیم کے درمیانی وقفے میں لکھا۔ آنند نے مزید کہا کہ یوں بھی آج کل ڈاک کے ٹکٹ بادشاہ کی تصاویر سے مزین نہیں ہوتے۔ ان میں ملک کے لوگوں کا لباس' تاریخی عمارات یا قدرت کے مناظر تصویر کشی کیے جاتے ہیں اور یہی کام اس نے کیا ہے۔

پکچر پوسٹ کارڈ نظمیں آخر ہیں کیا؟ انسائیکلوپیڈیا میں صرف دو سطریں ملتی ہیں لیکن Judson Jerome نے اپنی دو کتابوں The Poetry and its poet اور the poem Essence میں اس صنف کا خاص ذکر کیا ہے اور ایک درجن سے کچھ اوپر نمونے دیے ہیں۔ بنیادی طور پر پکچر پوسٹ کارڈ نظم ایک تصویر ہے جو ساکن و ساکت بھی ہو سکتی ہے اور چلتی ہوئی بھی ہو سکتی ہے۔ اس میں ایک یا دو یا اس سے کچھ زیادہ (لیکن تعداد میں بہت زیادہ نہیں) کردار ہیں۔ پیش منظر بھی ہے اور پس منظر بھی۔ یہ تصویر آج کی دنیا' آج کے حالات' یعنی عصر حاضر کی زندگی پیش کرتی ہے۔

ایک نہایت اہم بات یہ ہے کہ مضمون 'معنی' خیال' پیغام یا Moral کی سطح پر نظم کا ماحصل یا منشا سیدھے سادے الفاظ میں پیش کیا جاتا ہے۔ متبادل الفاظ' استعارہ و تمثیل استعمال نہیں کیے جاتے بلکہ حقیقی 'واقعی' کی حد تک تصریحی یا مکمل طور پر قابل فہم الفاظ کو بروئے کار لایا جاتا ہے (اردو میں اس کا مطلب یہ بھی ہے کہ فارسی ترکیبوں کو بالائے طاق رکھ دیا جائے۔ حالانکہ آنند نے کہیں کہیں ترکیبیں استعمال کی ہیں) اس صاف بیانی کو شاعر بے کم و کاست ڈھنگ سے بھی اور موثر یا گہری ہوئی زبان کے استعمال سے بھی خوشگوار بنا سکتا ہے..... مضمون خود میں ہی قاری کے لیے جانا پہچانا' واضح' قابل فہم ہونے کی وجہ سے اسے کہیں بھی پیرائے کی سطح سے دو سیڑھیاں نیچے اتر کر ذو معنویت یا ابہام یا صنعت توضیح میں خود کو الجھانا نہیں پڑتا۔

یہ تمہید کچھ زیادہ طویل ہوتی جا رہی ہے اس لیے اسے یہاں ختم کرتے ہوئے آنند کی نظموں کی طرف متوجہ ہوتا ہوں۔ ''لہو بولتا ہے'' میں آنند کی نظموں پر میں نے جو نوٹ لکھا تھا اسے حرف بحرف نقل کر رہا ہوں۔

پوسٹ کارڈ نظمیں جدید تر شاعری کی وہ صنف ہے جس میں کسی ایک منظر' کردار' واقعے' یا کہانی کو ایک ہی لمحے میں مقید کر کے Still Life یا سینما سلائیڈ کی طرح پیش کیا جاتا ہے۔

جو نظمیں انڈیا کے حوالے سے ہیں۔ ان میں ''زندہ در گور'' ''مجو وں بھائی'' ''آخری سفر کا ساتھی'' اور ''گلی آگ اور پانی کا سنگم'' سر فہرست ہیں۔ کچھ اور بھی ہیں لیکن زیر بحث یہی چار نظمیں آئیں گی۔ ''زندہ در گور'' مختصر نظم ہے اس لیے اسے پوری طرح نقل کیا جا سکتا ہے

اور قبرستان میں بیٹھے ہوئے
میت کے ساتھ آئے ہوئے سارے لوگ
جن میں چوپلے منہ کے بڑے بوڑھے
ضعیف العمر بیوہ عورتیں
ان سب کے قصے
......جو کبھی زندہ تھے
اب در گور ہیں.........
ایسے سناتے ہیں کہ جیسے
ان کا یہ سب منتظر در گور ہونے کے لیے
امیدواروں کی ''کیو'' میں
اپنے نمبر پر کھڑا ہوا ہے
اپنے نام کی آواز پڑنے تک!!

جیسا کہ پہلے عرض کر چکا ہوں۔ یہ نظم ایک تصویر ہے جو متحرک ہے ویڈیو کی طرح چلتی ہے اس میں ایک سے زیادہ کردار ہیں۔ کرداروں کے چہرے مہرے نمایاں ہیں۔ ''چوپلے منہ کے بڑے بوڑھے'' ''ضعیف العمر بیوہ عورتیں'' ہیں۔ جو رفتگان کے قصے شوق سے سنتے سناتے ہیں۔ شاعر کا comment یوں تو نظم کے عنوان میں ہی مستور ہے۔ ''زندہ در گور'' لیکن ایک طنز آمیز لہجے میں ان بڑے بوڑھے لوگوں کو (جو شوق اور اشتیاق سے مدفون لوگوں کی باتیں کرتے ہیں) جیسے راشن کا دانہ کے ڈپو کے باہر ایک ''کیو'' (قطار) میں کھڑا دکھلایا گیا ہے ''اپنے نام کی آواز پڑنے تک!''

''مجو وں بھائی'' بھی ایک ویڈیو تصویر ہے۔ دو نوں شخص' جو کاروبار میں ایک دوسرے سے ''جڑے ہوئے'' ہیں' ہوٹل کی ''نظر پرور حسین لابی'' میں جڑ کر

بیٹھے ہوئے ہیں۔ 'بہت ہی اہم ذاتی' کاروباری یا سیاسی" بات چیت میں
مصروف ہیں۔

خلوص و آشتی کی مورتیں
یک جان دو قالب ہیں

انھیں بے حد شیریں زبان میں باتیں کرتے ہوئے دکھانے کے لیے ایک فارسی اصطلاح کا استعمال کیا گیا ہے۔ جس سے گریز بھی کیا جا سکتا تھا لیکن آنند سے پوچھنے پر اس نے مجھے بتایا کہ آج کل کی بول چال کی فارسی میں یہ ایک عام اصطلاح ہے۔

یوں 'قربان شوم' کہتے ہیں
جیسے جڑواں بھائی ہوں!

یہاں شاعر کا طنز ایک کٹیلے خنجر کی طرح ابھرتا ہے۔ دونوں اس بات کو جانتے ہیں کہ

ایک اصلی مال کے تھیلے سے
نقلی مال دینا چاہتا ہے
دوسرا واقف ہے لیکن
مال کے بیچنے کی چوری رقم کا بھگتان
نمبر دو کی کالی مد سے کرنا چاہتا ہے
دوست ہیں..... قربان شوم ان کی اساس زندگی ہے!

"جڑواں بھائی" میں بھی نظم کا ماحصل یا عندیہ استعارہ یا تمثیل سے پیش نہیں کیا گیا۔ صراحت اور صاف بیانی سے' واضح الفاظ میں کیا گیا ہے لیکن طنز کی بھرپور چوٹ پہلی نظم کی طرح ہی نہ صرف عنوان "جڑواں بھائی" میں ہے بلکہ آخری الفاظ میں بھی ہے۔ "ان کی اساس زندگی ہے!"

ایک اور مختصر نظم جو بے حد متاثر کرتی ہے۔ وہ جودھپور راجستھان کا ایک منظر ہے' جسے شاعر نے اپنی آنکھوں سے دیکھا اور فوراً قلمبند کر لیا۔ بقول آنند کے یہ نظم پانچ منٹ میں مکمل ہوئی اس کا عنوان "آخری سفر کا ساتھی" ہے۔

گاؤں کی کچی سڑک
کچھ ریتلی' کچھ بھربھری سی
"اونٹ گاڑی" میں جتا
اک اونٹ
حسبِ معمول جھاگ کے گالے اڑاتا
بے دلی' آہستگی سے اونٹ گاڑی کھینچتا
چابک کی چوٹوں سے فقط اک جھرجھری لیتا
مگر اپنی ہی رفتار سے چلتا ہوا
اونٹ گاڑی پر لدے دو جسم
زندہ جسم' گاڑی بان کا چابک چلاتا
اور مردہ جسم مادہ اونٹ کا
وہ اونٹنی جو زندگی بھر اونٹ کی ساتھی رہی!

اس نظم میں کوئی کمنٹ نہیں ہے۔ کوئی طنز نہیں ہے۔ ذو معنویت اگر کہیں ہلکے سے اشارے کے ساتھ ابھرتی بھی ہے تو وہ دو الفاظ کے استعمال "زندہ" اور "مردہ" میں ہے۔ یہ نظم پوسٹ کارڈ نظموں کی لڑی میں ایک بلیک اینڈ وہائٹ پکچر پوسٹ کارڈ ہے' جس میں رنگوں کی چمک دمک اور پیچ در پیچ سے پرہیز کیا گیا ہے۔

اس نظم سے قطعاً مختلف چمکتے دمکتے ہیرے موتیوں جیسی رنگت کی نظم "بجلی' آگ اور پانی کا سنگم" ہے۔ میں اگر ستیہ پال آنند کا قریبی دوست نہ ہوتا تو اس نظم کو اسکے شروع جوانی کے رومانی تخیل کی اپج سمجھتا مگر نہیں۔ یہ نظم واقعی ایک پکچر پوسٹ کارڈ ہے جو البم میں سنبھال کر رکھے جانے کے قابل ہے۔ منظر نامہ یہ ہے۔ وہ پہاڑ پر ہے۔ سائیکل کی گھنٹی سی کھنک کی آواز سے اس کی چال کی موسیقی کا اندازہ ہوتا ہے۔ اب دیکھیے اس نوجوان پہاڑن کی سج دھج......

باریک ململ کی دھلی بے داغ ساڑھی
صبح کے اشنان سے چپکی ہوئی گیلے بدن پر
دونوں ہاتھوں میں اٹھائے
پیچھے بالوں سے بجلی سی ٹپکتی ہوئی پیتل کی تھالی

لیکن پیاری ایک پہاڑن ہے جو اپنے "اشٹ دیو" کی پوجا کے لیے جا رہی ہے' اس لیے ضروری ہے کہ دیگر لوازمات کو بھی پیش کیا جائے

گھی کا اک جلتا دیا
اک ساریل
پوجا کی سامگری' اگربتی
مقدس گنگا جل کی ایک گڑوی

پیاری شو مندر کی طرف کیوں جا رہی ہے۔ اس کا ایک ہلکا سا اشارہ ملتا تو ہے' جو پکچر پوسٹ کارڈ کو نیا دکھا دیتا ہے' لیکن تصویر کو سنخ نہیں ہونے دیتا۔ کہا جاتا ہے کہ بیاہتا استری کا شولنگ کو دھونا! یعنی اس پر جل چڑھانا کنواری کا منتا کرنے کی پوجا ہے۔ اس لیے نظم کی آخری سطریں اسے اس کے نقطہ عروج پر پہنچا دیتی ہیں۔

بیاہتا' لیکن کسی بچی کنواری آگ کا شعلہ
جسے شولنگ کو دھونا ہے
گنگا جل کے کنوارے سر دو دھارے سے
بجلی' آگ اور پانی کا سنگم!

معنی' مضمون اور متن کے نقطہ نظر سے ان نظموں سے مختلف ہوتے ہوئے بھی مغرب کی زندگی کے بارے میں جو پکچر پوسٹ کارڈ نظمیں ہیں' یہی لوازمات بروئے کار لاتی ہیں یعنی صاف بیانی' صراحت' بے لاگ لپٹ سیدھے الفاظ میں ایک منظر اور اس منظر میں ملوث کرداروں کا چلن۔ کہیں کہیں کرداروں میں مکالمہ

ان منظومات کو ڈرامائی تکنیک سے روشناس کروانا ہے۔ مارگریٹ ایٹووڈ کی انگریزی نظمیں جو لگ بھگ سبھی پکچر پوسٹ کارڈ ہیں، اسی تکنیک کو استعمال کرتی ہیں۔

دنیا کا قدیم ترین پیشہ جسم فروشی ہے۔ امریکا میں کال گرل کا دھندہ اکثر دلالوں کی وساطت سے ہوتا ہے۔ آنند کی نظم "کھلا اسرار" اسی موضوع پر ہے۔ کچھ سا مختصر سا کھنچے ہوئے کی سی شکل والا ایک بے ہودہ صورت کالا (حبشی) شخص میٹرو Metro (انڈر گراؤنڈ ریلوے) کی سیڑھیوں کے پاس ایک بہت خوبصورت گوری عورت سے ہٹ کر کھڑا ہے۔ شاعر خود سے پوچھتا ہے کون ہیں یہ؟ کیا رشتہ ہے ان کا؟ کیا یہ شخص اس عورت کا ملازم ہے؟ پڑوسی ہے؟ اسے اس کالے بھجنگے کنجے سے جیسے شخص اور کوہ قاف کی پری کا رشتہ بہت بے ڈھنگا سا لگتا ہے لیکن حقیقت جاننے کے لیے یہ ضروری ہے کہ وہ اس گفتگو کو سنے جو ان دونوں کے مابین ہو رہی ہے۔ کالا کچھ بول رہا ہے

"جاؤ اب گاڑی پکڑ لو
گھر کا نمبر تو تمہیں معلوم ہی ہے
بوڑھا کھوسٹ ان میں بیٹھا تمہارے واسطے بیتاب ہوگا
ساٹھ ستر اسی نوے تک وصولی ممکن ہے
......اور دیکھو
کم سے کم چالیس ڈالر میرے حصے کے ضروری ہیں
جو آتی ہو تو تمہارا"

پمپ سالا!!

"پمپ" Pimp یعنی "دلال" شاعر کا نفرت سے بھرا ہوا comment ہے جو نظم کے آخر میں ایک سطر کی صورت میں وارد ہوتا ہے جیسے شاعر نے ایک پتھر اٹھا کر کالے بھجنگے دلال کے سر پر دے مارا ہو یا اس کے منہ پر تھوک دیا ہو... ایسے comment عام طور پر پکچر پوسٹ کارڈ نظموں کی تکنیک کے منافی ہیں لیکن میرے پوچھنے پر آنند کہنے لگے۔ "یہ میرا conditioned reflex تھا۔ کیا کروں سو ڈیڑھ سو سے کچھ اوپر نظمیں لکھنے کے بعد یہ میری عادت ثانیہ بن گئی ہے۔"

"لانڈری" اور "عزاداری" دونوں نظمیں امریکہ میں بوڑھے لوگوں کی حالت زار کے بارے میں ہیں۔ "عزاداری" میں بوڑھا ماں باپ کرسمس کے موقع پر گھر سجاتے ہوئے، ڈنر اور فیملی ری یونین کا انتظام کیے ہوئے، بجلی کے قمقموں اور کیک کے ساتھ اس انتظار میں ہے کہ کب بچے بہوئیں پوتے پوتیاں آئیں اور کرسمس منائی جائے لیکن.......

کرسیاں سب
میز کے چاروں طرف خالی پڑی ہیں
جیسے ماضی کی عزاداری میں جھک کر پوچھتی ہوں
گھر کے سارے فرد، بیوی، بیٹیاں، بیٹے کہاں ہیں؟

ایک اور نظم جو امریکا کے دارالخلافہ واشنگٹن ڈی سی کے کالے لوگوں کے علاقے کا ایک بھیانک اور روح فرسا منظر پیش کرتی ہے، وہ "شام ہوتی ہے" عنوان نظم سے مطابقت نہیں رکھتا لیکن یہ نظم کالے لوگوں کی زندگی کے ایک گھناؤنے رخ کا پتا دیتی ہے اور بقول آنند "اخباروں میں روز ایسی خبریں چھپتی ہیں۔"

آنند کی یہ نظم ان کے کسی مجموعے میں شامل نہیں ہے۔ کراچی کے ایک رسالے میں شائع اشاعت ہوئی تھی۔ منظر نامہ یہ ہے۔ شام ہوتی ہے واشنگٹن کی کالی بستی میں ایک گھر کے دروازے کے باہر ایک پانچ برس کا کالا بچہ بیٹھا ہوا سسک رہا ہے۔ شاید بھوکا پیاسا ہے۔ شاید سردی بھی اسے ستا رہی ہے۔ ایک کتیا اس کے پاس بیٹھی کوں کوں کرتی کبھی اٹھ کر چند قدم دور چلی جاتی ہے کبھی پھر آ کر بیٹھ جاتی ہے۔ جہاں جہاں اس منظر نامے سے کچھ اوپر اٹھ کر شاعر خود بولتا ہے، نظم میں ایک نئی جہت پیدا ہو جاتی ہے۔

سوختوں کی بے بس کالی روح کا اک ہیولا سا پیکر
دھو کر اشکوں میں ڈھلا
باہر آنے کو بیتاب سا جھانک رہا ہے

اس لڑکے کی غیر شادی شدہ ماں کی عمر صرف بیس برس ہے۔ اب تک تین بچوں کو جنم دے چکی ہے جو مختلف مردوں کے نطفے سے ہیں۔ دوسرے دونوں بچے گھر کے اندر سو رہے ہیں یا رو رہے ہیں۔ ماں اپنے نشے کی عادت سے مجبور ہے

گلیوں کے دھندے میں کچھ کوکین جٹانے
اپنے دوست کے ساتھ گئی ہے

لڑکا پاس بیٹھی ہوئی کتیا کی پیٹھ کھجاتا کھجاتا بلک بلک کر رو گیا ہے۔ پھر یکدم ایک لمحہ ایسا آتا ہے کہ کتیا جیسے نیند سے چونک اٹھتی ہے۔ بچے کے کپڑوں، چہرے کو سونگھ سونگھ کر کوں کوں کرتی کچھ دوری پر جا کر آسمان کی طرف منہ اٹھا کر رونے لگتی ہے۔ کالے جسم والے اس بچے کی روح کا ہیولا پیکر.....

سانسوں کے سنگ اٹھا اٹھا باہر آ کر
اک آزاد پرندے جیسا
ڈوبتے سورج کی کرنوں میں گھل گیا ہے
واشنگٹن میں شام ہوتی ہے!!

آخر میں ایمان نے ستیہ پال آنند کی "مجھ بولتا ہے" پر رائے لکھتے ہوئے شاید انہی نظموں کے بارے میں لکھا تھا "یہ نظمیں وقتی، ذوقی، تاثراتی نوعیت کے ہوتے ہوئے بھی اس سے اوپر اٹھ کر پوری زندگی کا احاطہ کرتی ہیں، یعنی ان کو پڑھنے کے بعد ایک چلتی پھرتی بلکہ بعض اوقات بولتی ہوئی حیات ذہنی کا نقشہ ابھر آتا ہے۔"

جدیدیت اور اساطیر کی پیوستگی

ڈاکٹر فہیم اعظمی

ہماری کلاسیکی شاعری میں اساطیر اور روایتی کہانیوں کے کرداروں اور واقعات کو اکثر تمثال کا حصہ بنا کر پیش کیا جاتا رہا ہے۔ ان کی قدر و قیمت زیادہ تر جمالیاتی تھی اور ان کی اہمیت تلمیحی تھی۔ جام جم، مسند، نقش ایسے حوالے تھے جن کا کام غیر حقیقت سے آئیڈیل کو تشبیہ دے کر کوئی تاثر پیدا کرنا تھا۔ رفتہ رفتہ ناولوں اور افسانوں میں، خصوصاً مغربی فکشن میں اساطیر کو تمثیل کے طور پر استعمال کیا جانے لگا۔ اساطیر کے کرداروں اور واقعات کو عصری معاشرے اور سماج کے حقیقی کرداروں اور واقعات سے مماثلت دینے کے لئے ناولوں اور کہانیوں کا حصہ بنایا گیا۔ ان میں زیادہ تر نیکی اور بدی کے موضوعات کو اہمیت حاصل رہی۔ جس میں نیکی کی خیر اور بدی کی شر کے طور پر پیش کیا مقصود تھا۔ جدید ادب میں اساطیر اور روایتی کہانیوں کو محض تشبیہ سے زیادہ وسعت دے کر سمبل کے طور پر پیش کیا گیا۔ اس طرح یہ سمبالک کہانیاں غیر موجود جاتی اور خود مختار وجود رکھنے والی علامت کے طور پر ہماری تحریروں کا حصہ بن گئیں۔ اساطیر اور جدیدیت کا یہی Juxtaposition یا پیوستگی ہے جسے جیمس جوائس نے "یولیسس" میں اپنایا اور جس کے بارے میں ٹی ایس ایلیٹ کہتا ہے

"اسطورہ کے استعمال میں قدیم اور جدید کے درمیان لگاتار متوازیت کو عصر منسوی کے ساتھ برتنے میں جوائس نے ایک نیا انداز اختیار کیا ہے جس کا تتبع لوگ اس کے بعد بھی کرتے رہیں گے"

اور یہ تتبع غیر شعوری طور پر نثر و نظم میں شروع ہوا۔ اساطیر کے متعلق بھی جدید ذہنوں میں ایک انقلاب برپا ہوا۔ انھیں ابتدائی اور فرضی قصہ کہانیوں کے بجائے ابتدائی سائنس اور لسانی سسٹم گردانا گیا اور ان میں وہ ساخت تلاش کی گئی جو دنیا کی تمام اساطیر میں مشترک ہے۔ مغرب میں تمثیلی انداز تحریر اور سمبالک اظہار کے طریقے نے ڈی ایچ لارنس کی "The escaped cock" جیسی کہانی کو جنم دیا۔ لیکن اردو ادب میں تقلیدی رجحان اتنا غالب رہا کہ کسی متبرک ہستی کے متن کردار کو اس طرح کہانی کا حصہ نہیں بنایا جا سکا جس طرح لارنس نے بنایا۔ حالانکہ ڈی ایچ لارنس نے اس کہانی میں مصری اور رومی اساطیر کے کرداروں اوسیرس (Osiris)، آئسس وغیرہ کو بھی پیش کیا ہے مگر سب کا سمبالک رول متبرک ہستی کی فرضی محبت کی کہانی کے حوالے سے آیا ہے اس لیے ایسی کہانی اردو ادب یا اردو لسانی سسٹم میں تقریباً نایاب ہے لیکن ہندو اور یونانی اساطیر میں ..... دیوتا اپنی تمام تر مافوق الفطرت صفات اور طاقت کے ساتھ ساتھ اسی زمین کے باسی ہوتے ہیں اور انسانی اشرفیت اور اسفلیت کے حامل، اس لئے وہ ہماری شاعری اور فکشن میں بہترین سمبل ثابت ہوتے ہیں۔ ہندو اور یونانی اساطیر کے بہت سے واقعات اور بہت سے کردار تاریخی اہمیت کے بھی حامل ہیں۔ اس طرح کے تاریخی کرداروں کو ہم سمبل اور تمثیل کے طور پر استعمال کر سکتے ہیں اور کرتے ہیں مگر ہمارے ہاں متبرک ہستیاں کہانیوں میں تمثیل کے طور پر پیش نہیں کی جا سکتیں۔ ہندو، یونانی، رومی، یورپ کے دوسرے ممالک کی اساطیر کو علامت بنانے پر کوئی ایسی پابندی نہیں ہے بلکہ مغرب میں متبرک ہستیوں کی کہانیوں کو بھی فینٹاسائز اور ڈرامیٹائز کیا گیا ہے۔

ڈاکٹر ستیہ پال آنند نے اپنی نظموں میں زیادہ تر ہندو دیومالائی اور یونانی اساطیر کے واقعات اور کرداروں کو علامت بنایا ہے۔ وہ اساطیر اور جدیدیت کے Juxtaposition یا ان کو پہلو بہ پہلو لانے میں بڑی مہارت رکھتے ہیں۔ اساطیری کردار اور واقعات ستیہ پال آنند کی نظموں میں جمالیات اور معنویت دونوں پیدا کرتے ہیں۔ ان کی نظموں میں اساطیر کے سمبل کو انسان کی وجودی کیفیت اور دنیا میں Detrop کے روپ میں نمودار ہونے والے آدمی کی عکاسی کے لئے استعمال کیا گیا ہے۔ آدمی جو معاشرے کا حصہ بن کر بھی اکیلا ہے اور زندگی بسر کرنے کے جبر اور آزادی کی متضاد کیفیتوں سے گزرتا ہے۔ اپنی بے بسی پر قابو پانے کے لئے اس نے دیوتاؤں کی فوج جمع کر رکھی ہے مگر سیموئل بیکٹ کے "Waiting for the godot" کی طرح وہ انتظار میں ساری عمر گزار دیتا ہے۔ وہ آسمانی کتابوں میں لکھے ہوئے خدا اور آدمی کے درمیان عہد (Covenant) کو پورا کرتا رہتا ہے، اور دیوتاؤں کے کرم کا منتظر رہتا ہے مگر دیوتا سا گر پار سے نہیں لوٹے

وہ تک بھی نہیں بجلی ہو طیر پر جائے
اور خاموش ہے کوئی بادبان اپنے پر پرواز کھولے .....

.....

اور طویل انتظار کے بعد

دیوتا یا مر چکے ہوں گے یا اپنی
جاگتی کی آخری سانسوں کے زخم سے علیل رہے ہوں گے
نہیں آئیں گے شاید
اور چودہ قرن ہم دست طلب پھیلائے
اپنا عہد پورا کر چکے ہیں
تھک گئے ہیں
لوٹ جائیں گے

(تکمیل عہد)

"مہابھارت" کو تاریخ سمجھا جائے یا اسطورہ لیکن اس میں بھیشم
پتامہ کا ایسا کردار ہے جسے ہم ماورائے عقل اور حیرت آمیز کہہ سکتے ہیں۔ بھیشم پتامہ جو
کورو اور پانڈو دونوں کے جد امجد تھے کورو کا ساتھ دیتے ہیں اور یدھ میں ان کو
اتنے تیر لگتے ہیں کہ وہ تیروں کے بستر پر دراز ہو جاتے ہیں۔ آپ کے نفاق اور
"اتجعل فیہا من یفسد فیہا و یسفک الدماء" کی پیش گوئی کی
علامت بن جاتے ہیں۔ ستیہ پال آنند بھیشم کے علامتی کردار کو اپنی نظم کی اساس
بنا کر قطع محبت اور صلہ رحم کے فقدان کا وہ ڈسکورس پیش کرتے ہیں جو کل بھی ایک
سچائی تھی اور آج بھی ہے اور جب تک دنیا رہے گی جد امجد بھیشم اسی طرح بھاشن
دیتے رہیں گے اور مرتے رہیں گے۔

تم آلِ بشری

برادرانِ عزیز دو بھائی مجھ سے بچے
ابھی تو بچپن سے عنفوانِ شباب کی منزلوں کے رستے
پہ تم نے پہلا قدم ہی رکھا تھا میرے بچو
کہ ڈگمگا کر الجھ گئے.....

جو رشتے ناطے تھے ایسے ٹوٹے ہیں جیسے جڑنے
کی شرط ہی الگ رہے ہوں
کہ ٹوٹے رشتوں کی اس تجسیم کا کوئی نام تک نہیں ہے

(جدِ امجد پتامہ بھیشم)

اور بھیشم پتامہ کے آخری الفاظ.....ایک المیہ، ایک وصیت، ایک نصیحت، ایک
لازمانی حقیقت:

■ چپ رہو اب آتما کی شانتی کے بچو
اٹھاؤ کمان سے کما جاتا ہے آخری اے مرے عزیزو
میں جدِ امجد
پتامہ بھیشم
تمہارا شاعر
لہو کے قطروں سے کرم بھومی کو سینچتا
آ رہا ہوں صدیوں سے
اب مجھے شانتی سے مرنے دو میرے بچو
میں آخری بار اپنی آنکھوں کی دید روشنی
کو بند کر دینا چاہتا ہوں!

(جدِ امجد پتامہ بھیشم)

ستیہ پال آنند خیر و شر کی جنگ کے متعلق روایتی کہانیوں اور اساطیر
کو اپنی نظموں میں تکنیکی کاٹ اور شعری زبان عطا کرتے ہیں اور انھیں ایک نئی
ساخت دے کر اپنے عصر کی مجبوری کے طور پر پیش کرتے ہیں:

خودکشی جانا کہ "اصلی میں"
کون ہوں؟ اور اگر کوئی ہوں تو
ایسے ناسپاس کو جسم سے اپنے
کیسے خارج کروں؟ کہ وہ میرا
اپنا ہی ہم زاد ہے
اب یہ ڈر ہے یہ راکھشس مجھ کو
ایک دن میری شخصیت سے کہیں
کر کے محروم خود نہ قابض ہو
میرے "میں" پر کہ ستیہ پال آنند
مر ہی جائے یہ جنگ لڑتے ہوئے

دیوتا کوئی بچاؤ مرے
اصلی جیکل کو ہائیڈ سے کہ اگر
بچ نہ پایا جو یہ تو دوزخ کی
فتح ہو گی خدا کی جنت پر!

(جیکل اور ہائیڈ)

نظم "مر ہی جائے یہ جنگ لڑتے ہوئے" پر ختم ہوتی تو یہ اہورمزدا
اور اہرمن کی دائمی جنگ اور Co-existence کی حقیقت شناسی ہوتی لیکن
شاعر کی سیماب پائی میں دیوتاؤں کی مدد سے جنت کی جیت اور دوزخ کی شکست
کا آئیڈیل جیکل کو بچانے کے لئے دستِ دعا اٹھانے پر مجبور کرتا ہے۔ لیکن
تھوڑی دیر کے لئے سوچنا پڑتا ہے کہ کیا اس ناممکن تمنا کے لئے ہاتھ واقعی اٹھے
ہیں یا یہ دیوتاؤں کی مجبوری پر طنز ہے جنھوں نے جیکل اور ہائیڈ دونوں کو جنم دیا!
شیو نٹ راج کے رقص کو آدمی کے اندر لے اور سانس کی علامت کے
طور پر ستیہ پال آنند نے جامع سچائی "لیلا" کی نفی اور دنیا کی دائمی فعالیت کی عکاسی
کیا ہے۔ شو نٹ راج کے رقص کو مختلف زاویوں سے نمایاں کر کے تمام مادی اور
روحانی سچائی کی ترجمانی کرتے ہیں۔

جو یہ ہماری عمر سے کمتر ہے
اس کے بھاؤ......
اترا دکی ان عناں میں مدرا مگرہ
ناچ کی مدراؤں میں لیکن انگلیاں شیش
پر نیا ناچ سے ناطہ و ناچ تک بھی ہیں
مر جاتی ہیں......
یہ ہماری بھی ویسے ہی عمر الجھن ہے

جیسے میرے بھیتر کا بہاؤ...... کہ میں تو
آفاقی رقاص ہوں شیو نٹ راج کا مظہر!

اور حقیقت یہی ہے کہ ہم میں سے ہر انسان شیو نٹ راج کے رقص کی طرح رقاصی کرتا ہے۔ داخلی طور پر بھی اور خارجی مظہر کے طور پر بھی اور جب بھی یہ رقص رک جائے گا تو زمیں کی گردش ختم ہو جائے گی لیکن فرد کا رقص اندر کے لہو اور سانس کے رقص بند ہونے پر ختم ہو جاتا ہے۔ اس کے لئے موت ہی دنیا کی تباہی ہے۔ شیو نٹ راج کے Cosmic رقص پر مبنی یہ نظم علمی، فکری اور فلسفیانہ گہرائی کا ماڈل ہے۔

ستیہ پال آنند اپنی شعری جہت میں قارئین کو اساطیری کرداروں واقعات سے محض متعارف نہیں کراتے بلکہ ان کو اپنی ہی دنیا کے کردار واقعات بنا کر پیش کرتے ہیں۔ ان کی نظمیں پڑھنے سے ایسا لگتا ہے کہ رام، ارجن، وشنو، بھیشم پتامہ، ٹرسیا، ذبیح کیا، سب ہمارے ارد گرد موجود ہیں اور ہم شیو نٹ راج کی طرح دائمی رقص میں ہیں، مایا کے جال سے نکلنا چاہتے ہیں، ہائیڈ اور ہراکش کو ختم کرنا چاہتے ہیں مگر پھر احساس ہوتا ہے کہ ہم تو خود بے بس ہیں، بے بضاعت بے جوہر...... باہر سے کھڑے ہو کر دنیا کے اسٹیج پر جاری ڈرامے کو محض ایک Outsider کی طرح دیکھ سکتے ہیں، کچھ کر نہیں سکتے، بے کیے کی سزا بھگتے ہیں۔

ستیہ پال آنند کی جدید فکر اور اساطیری علامتوں کے Juxtaposition سے تخلیق کی ہوئی نظمیں شعری جمالیات سے لطف اندوز ہونے کا موقع فراہم کرنے کے ساتھ ساتھ علم و فکر کی عمیق سطح پر لے جاتی ہیں۔ ہم ایسے آئینہ خانوں میں پہنچ جاتے ہیں جہاں ہم خود اساطیری کردار نظر آنے لگتے ہیں اور ہم سوچتے ہیں کہ کیا دنیا واقعی پرانی ہے؟ یا سب کچھ وہی ہے جو ہزاروں سال پہلے تھے۔ ہم آزاد بھی ہیں، مقید بھی، بول بھی سکتے ہیں اور بے زباں بھی ہیں، ہم جنس بھی اور اجنبی بھی۔ Bad faith میں زندہ رہنا ہمارا مقدر ہے:

مجھے اپنے کندھے پہ کب تک کسی جھوٹ کا / بھاری پتھر اٹھائے
ہوئے سی سی فس کی طرح / لامکاں لازماں / آسماں کی بلندی پہ چڑھنا پڑے گا:
(آنے والی سحر بند کھڑکی ہے)

لیکن مرنا ناممکن ہے۔ چٹان کو اٹھا کر ڈھلوان پہاڑ تک جانا اور چٹان کے لڑھکنے کے بعد پھر اسے اٹھا کر ڈھلوان پہاڑی پر چڑھنا ہمارا مقدر ہے۔ ہماری زندگی اسی فضائی تکرار میں گزرتی ہے۔ آنے والی سحر کا سورج دکھائی نہیں دیتا، روشنی اور سرخی ملا ہے۔ کھڑکی بند رہتی ہے...... لیکن ہم اپنے من کی کھڑکی سے ستیہ پال آنند کی نظموں کے کرداروں اور واقعات کو اپنے ہی درمیان دیکھتے ہیں۔ ان کے لئے نہ تو زماں کا تعین ممکن ہے اور نہ مکاں کا۔

ستیہ پال آنند کا شعری تجربہ

عتیق اللہ

اردو شاعری میں تقریباً تمام اصناف سخن پر قصیدہ/غزل کی لسان ہی کا اجارہ رہا ہے یعنی لسان کا یہ وہ کردار ہے جس نے مجموعاً شاعری کی زبان کا ایک تصور دیا تھا اور جو شعوری طور پر ہیئت کے نظام موضوع میں خلط ملط رہا ہے ہمیں یقیناً غزل کی اس بیش بہا دین پر فخر کرنا چاہئے مگر افسوس وہاں ہوتا ہے جہاں صرف اور صرف زبان رہ جاتی ہے اور شاعری کی اپنی فکر/اپنی واردات اور اپنا تجربہ غزل کے لسانی محاورے میں دب جاتا ہے۔ دوسرے یہ کہ ہیئتی سطح پر غزل مختلف اکائیوں کا نام ہے کہیں کہیں یہ باطنی کسی مسلسل خیال یا موڈ کی تلاش کی جاتی ہے مگر بحیثیت ایک منفرد صنف کے تسلسل یا وحدت یا یک رنگی کے تاریخی تصور سے اسے کوئی علاقہ نہیں ہے۔ غزل کی یہ ایک خاص خوبی ہے اور اسی خوبی میں اس کی انفرادیت کا راز بھی پنہاں ہے جو اسے دوسری اصناف کی تجسیم سے ایک علیحدہ منصب عطا کرتی ہے مگر عدم تسلسل کی اس شعری عادت نے ہماری نظم کو اکثر متاثر کیا ہے۔ نیپ کے مصرعوں یا قطعہ بند ٹکڑوں پر مشتمل نظموں سے قطع نظر ان نظموں کی تعداد سب سے زیادہ ہے جن میں ارتکاز اور جامعیت کی کمی کے ساتھ ساتھ ایک حاوی جذبہ یا خیال یا کیفیت یا تاثر یا تجربہ کو ایک ایسی زبان میں نہیں پیش کیا جا سکا ہے جسے کسی واردات کی زبان کا نام دیا جا سکے۔ نظم میں ہمارے تجربوں اور جذبوں کی زبان پر غزل کی بحر و زبان کا سایہ محیط ہو جاتا ہے اور مغرب اور معرب تر ایک 'معمولہ لفظی خوشی' روایتی مشابہتوں اور استعاروں سے جو تصنیف کی عمارت کھڑی کی جاتی ہے وہ بظاہر انتہائی بلند کوش اور مرعوب کن مگر ایک دم مانوس ہوتی ہے۔ دراصل غزل کی تہذیب لسان کی جڑیں اردو ادبی معاشرے کے عظیم لاشعور میں اتنی گہری پیوست ہیں کہ تجرباتی زبان کے مسلسل اصرار کے باوجود دس بیس برس کے وقفے سے اس کی ساختیں بری طرح پلٹ کرنے لگتی ہیں۔ یہ عمل اس جاپانی پیداکاری سے مماثل ہے جو Reproduction سے کم اور Replication سے زیادہ علاقہ رکھتا ہے۔ یہی سبب ہے کہ اپنی کلیت نیز بیشتر مثالوں میں ہماری غزلوں کا سرمایہ Genetic Duplication کا تاثر فراہم کرتا ہے اسی لئے غزل کو شعرا کی لسانی انفرادیت کا تعین ایک مشکل عمل ہے۔ ہمارے بعض نظم گو شعرا نے غزل کے اس حاوی محاورے سے گریز کی جو مثالیں قائم کی ہیں ان میں بہرحال توسیع کے امکانات موجود ہیں۔ میراجی اور پھر ان کے بعد مجید امجد اور اختر الایمان نے اس روایت کو کافی وسیع کیا ہے۔ ترقی پسند شعراء زبان کے اعتبار سے کلاسیکی طبیعت کے حامل تھے اسی لئے ان کی زبان میں جاگیردارانہ شعار اور لسانی تکلفات کی جھلک صاف نمایاں ہے اسی لئے غزل کی زبان کی روایت سے وہ اپنے آپ کو کم ہی علیحدہ کر پائے ہیں۔

ستیہ پال آنند دراصل میراجی، مجید امجد اور اختر الایمان کے سلسلے ہی کے شاعر ہیں۔ انہوں نے اختر الایمان کی طرح زبان کے برتاؤ نثر کے آہنگ کو بحال بھی کیا ہے اور اسے برقرار رکھنے کی سعی بھی کی ہے مگر اسے کھردرا اور درشت بننے سے باز رکھا ہے بلکہ اساطیری اور فلسفیانہ آب و رنگ سے نظمیں موضوع کو نیا ڈھنگ اور گہرائی دیا ہے اس طرح کی نظمیں اپنا ایک استعاراتی اور اساطیری تناظر رکھنے کے باوصف نہ تو زیادہ پیچیدہ ہیں اور نہ بہت دیر تک معنی کو گردش میں رکھتی ہیں۔ ستیہ پال آنند ایک ایسے شاعر ہیں جن کے تجربات کی دنیا وسیع ہے اور جو اپنے اردگرد کی دنیا اور وقوعوں Happenings پر گہری نظر رکھتے ہیں بلکہ اشیاء اور ان کی حرکات کے درمیان اپنے وجود کو کوئی معنی دیتے رہے ہیں اور ان کی نظر میں ان رشتوں کی خاص اہمیت ہے جو ذات کو ان کے ماحول میں ضم کر دیتے ہیں۔ اس طرح ایک وسیع تر ضمیر متکلم کی تخلیق کا امکان بھی روشن ہو جاتا ہے۔ ستیہ پال آنند کے تخلیقی کردار میں یہ ساری چیزیں بیک وقت کارفرما ہیں۔ جیسا کہ عرض کیا جا چکا ہے کہ آنند کے پاس کہنے کے لئے بہت کچھ ہے اور وہ اپنی ہر نظم میں کچھ کہنا چاہتے ہیں بلکہ سنانا چاہتے ہیں۔ سنانے کے اسلوب ہی نے ان کی نظموں میں نثر کے آہنگ کے لئے گنجائش پیدا کی ہے جس کے تحت مصرعوں کی نحوی ساختیں جملوں یا بہت سی مصرعی سطروں سے مل کر طویل جملے کی شکل اختیار کر لیتی ہیں۔

میں ابھی بچہ تھا لیکن مجھ کو یہ احساس تھا 'تم/ منہ اندھیرے روز
سورج کو پکڑنے کے لئے گھر/ سے نکل پڑتے تھے ایسے جیسے ماہی گیر کوئی/ جال
کاندھوں پر اٹھائے اور آنکھوں میں سمندر/ کی سی گہرائی لئے' موجوں سے
ٹکرانے کی خاطر/ سر بکف جاتا ہے (پیر پدرم)

رکے ہوئے آدمی نے پوچھا/ .... کہاں چلے ہو؟/ جو تیز
قدموں سے چل رہا تھا۔

بغیر ٹھہرے جواب میں رو دیا 'کہا بھائی چل رہا ہوں' مگر مرے
دوست/ یہ نہ پوچھو' کہاں چلا ہوں/ یہ بات میری سمجھ سے باہر ہے/ چلتے رہنے
ہی کو مقدر سمجھ لیا ہے/ میں کب' کہاں' کس جگہ رکوں گا/ میں خود نہیں جانتا........
مگر بھائی/ تم یہاں رکے ہوئے ہو؟ (رکا ہوا آدمی)

ستیہ پال آنند کی نظم کہیں اپنے سلسلے تہذیبی تاریخ سے اخذ کرتی ہے (لوسٹ گا بیلا' محراب' مرنا نہیں ہوں وغیرہ) کہیں اساطیر کے آب و رنگ سے اپنے نفس موضوع کو جلا بخشتی ہے (لوٹ جائیں' سارتھی زندہ ہو' گوتم زمیں' باغباں و دوی مری شکل کشو زندہ ور گو' آنے والی کھڑی کی ہے میں جد امجد' نثر رنج' مرنا نہیں ہوں وغیرہ) اور کہیں ان رشتوں سے اپنے تانے بانے بنتی ہے جن کا اپنا ایک زمان بھی ہے اور مکان بھی (وہ آ گیا ہے' آزمائش شرط تھی وغیرہ)۔ وقت ایک مسلسل گریز کی شکل میں تہہ بہ تہہ کارفرما ہے (اڈ ہان اپنے سفر پر' نباتاتی عمر وغیرہ)۔ مگر گریز کی یہ صورت کہیں فرار ڈھونڈھتی یا احتجاج میں

تبدیلی نہیں ہوتی۔ شاعر نے ہر جگہ کوئی نہ کوئی نئے معنی فراہم کرنے نیز انگیز کرنے کی سعی کی ہے۔ ستیہ پال آنند نے جہاں وقت کو ایک بہت بڑی ناقابل تردید حقیقت کے طور پر قبول کیا ہے وہاں خود ان کی ذات ایک زبردست سوال کے طور پر ابھرتی ہے کہ وہ کیا ہے؟ اور کیوں ہے؟ حتیٰ کہ دوسروں کی موجودگی بھی ان کے لئے ایک سوالیہ نشان بن جاتی ہے (لوگ یہاں سائے ہیں) شاید یہ سوال ان کے اس وجود کی آگاہیوں سے برآمد ہوئے ہیں جو تہذیبی سطح پر بیتائی کے ذاتی تجربے کا منطقی نتیجہ ہیں۔ اسی لئے اس قسم کی نظمیں (تمام نظمیں یا بیشتر نظمیں نہیں) ایک وسیع تر المناکی اور کھونے کے شدید احساس سے مملو دکھائی دیتی ہیں (آپ اسے دانش ورانہ المناکی بھی کہہ سکتے ہیں)۔ ستیہ پال آنند نے کھونے اور پانے کے اس تضاد اور تناظر کو وقت کے پس منظر میں متنوع معنی دیے ہیں (شہر میں شہر خموشاں، یہاں جنھیں دیکھیں دم بہ دم، گلاب پھر گلاب ہے، خود نوشت سرگزشت، ٹھیکروں یا ہو چیتا، بنجارہ، مار وغیرہ)۔ ستیہ پال آنند جہاں کہیں کچھ اب باقی ہے، سیاہ پورٹریٹ، نوجوان شاعری اور الوداع رومان میں جھلملاتی آنکھوں کے ماضی زندگی کو رقم کرتے ہوئے نظر آتے ہیں وہاں پر چند رمز وایماں لیے سفر پر جیسی نظموں میں یہ جھلملاتاری، اضمحلال اور واماندگی میں بدل جاتی ہے۔ اکثر نظموں میں ان کا کردار ایک حاوی محرک کے طور پر ابھرتا ہے مگر دوسرے غرضی کرداروں کے حوالے سے بھی انہوں نے اپنی ہی سرگزشت بیان کی ہے (سیاہ پورٹریٹ، نارسیس وطن، اعدوں کی نگری، کہیں کچھ اب بھی باقی ہے، ایک چھوٹا آدمی وغیرہ)۔ اس سلسلے کی نظموں میں شاعر اپنے آپ کے بعد قریب ہے مگر اس قربت نے اسے دوسروں سے یا کائنات سے منقطع نہیں کردیا ہے بلکہ ان نظموں میں ایک رو تو وہ ہے جس کا سرچشمہ زمان کا شدید اور شعوری احساس ہے۔ دوسری رو مکان کے اس تجربے سے خلق ہوتی ہے جس میں مرکزی حیثیت تو وہ فرد ہی رکھتا ہے جو مختلف اور متنوع اشیاء اور رشتوں کے درمیان خود کو کوئی نام دینے کے در پے ہے مگر اس کے تعلقات کا دائرہ خاصا وسیع ہے۔ اس طرح ذات کا یہ قرب نہ تو اتنا ذاتی ہے اور نہ اتنا مخصوص کہ اسے محدود ترین تناظر ہی سے کٹ کر رہ جائے۔ حتیٰ کہ ماں جیسی نظم میں جو شخص ان کی ذات ہی کا ایک عکس پیش کرتی ہے، آن کی آن میں ایک لفظ پوری ایک کائنات کی شکل اختیار کرلیتا ہے۔ ماں کی کوکھ ایک عظیم امن ہے۔ شاعر ماں کے حوالے سے اسی دامن میں دوبارہ چلا جانا چاہتا ہے۔ دھرتی جیسی عظیم ماں کی پناہ گاہ بھی بالآخر ماں کی کوکھ ہی سے مماثل ہے۔ بچپن محض یادداشت کا نام ہے اور بچہ وقت کے ایک معصوم اور بے کل ارتعاش کا۔ ماں ایک مستقل سرچشمہ حیات و تخلیق ہے، جو انسانی زندگی کے کمزور ترین لمحوں اور آزمائشی ساعتوں میں ایک بڑی ڈھارس بن جاتی ہے۔ ماں وقت کو شکست دینے کا استعارہ بھی ہے کہ اپنے وسیع تر تخلیقی عمل میں وہ ایک سلسلہ جاریہ کا حکم رکھتی ہے اور اس کا وجود پوری انسانیت کی تخلیق سے عبارت ہے۔ عورت کی انہی فعال شرکتوں کا ایک دوسرا تناظر جنس سے متعلق ہے۔ ستیہ پال آنند نے جنس کو بھی حیاتیاتی قدر اور انسانی قدر کے طور پر لفظ کیا ہے جسے بار بار مختلف معاشروں اور ادوار میں مختلف معانی پہنائے گئے ہیں۔ انھیں معانی میں جنس کی اخلاقیات کا تصور ہمیشہ تبدیلیوں سے گزرتا رہا ہے۔ سائنس اور ٹیکنالوجی کے اس ارتقائی مرحلے پر مرد اور عورت کے رشتوں کا ایک نیا سیاق و سباق ضرور سامنے آیا ہے لیکن جنس کو Moralise کرنے کی ذہن میں اسے بدستور Demoralise کرنے والے شبے آج بھی کم مگر نہیں ہیں۔ ستیہ پال آنند کی حقائق گرا نظموں کے علاوہ اکثر نظموں میں جنس کے اس خاص لمسی تصور کی جھلک بخوبی دیکھی جا سکتی ہے۔ جو المیہ ہے اور جو وسیع تر انسانی شرکتوں پر اپنی بنیاد رکھتا ہے۔

ستیہ پال آنند نے ایک طرف ماں کے حوالے سے اور دوسری طرف دیومالا اور اساطیر کو نئے معنی مہیا کر کے اپنے وجود کی سراسیمگی پر فتح حاصل کرنے کی کوشش کی ہے۔ (آواز شکستِ ذات) کرشن کے ارشادات میں صیغۂ وقت لاوقت میں ڈھل جاتا ہے۔ ستیہ پال آنند نے بھی وقت کو محض ایک مجرم کے طور پر لفظ کیا ہے اور مرن کے نصاب میں ایک داخلی تصور کا نام ہے انسانیت کے سفر ارتقاء اور اسے جیسے دیگر انسانوں کی بھیڑ میں مرن کا زوال، ہزاروں اور لاکھوں چہروں میں منقسم ہو کر عظیم تر ابدیت میں منتقل ہو جاتا ہے اس معنی میں زندگی کی ابدیت سے موت کی معنویت مغلوب ہو جاتی ہے۔

وہ اپنے چہروں کے خال وخد میں / ہزاروں چہروں کی نئی نئی ہوتی شبیہوں کو دیکھتا ہے / وہ نقش جو برسہا برس سے چھپے پڑے تھے / جو جھٹا پشت اس کا ورثہ ہے ہیں، اس کے / وجود میں جذب ہو گئے ہیں / وہ کچھ نیا ہے تو کچھ پرانا ہے
(سیاہ پورٹریٹ)

اسے بھی لگتا تو ہوگا کہ میں وہی ہوں، مگر / آخر میں گزیدہ تھا، اداس رنجیدہ / اسے بھی لگتا تو ہوگا کہ ہم وہی ہیں مگر / دل و دماغ کی باہم پرورگی کے دن / نہ جانے عمر کے کس حصے مرحلے پہ چھوٹ گئے / میں چاہتا ہوں، کبھی بات کر کے دیکھوں تو / کیوں کہ جسم تو ایک عارضی حقیقت ہے / کیوں دو دن دل و جان جو ایک عالم ہے / وہاں تو وقت کا احساس تک نہیں ہوتا / کیوں کہ مگر سے شکوہ، مگر جو ملی ہے / لبوں پہ حرفِ شکایت، دلوں میں تلخی سی / علیل جذبے ہیں ان سے ہمارا کیا رشتہ؟
(انگلا سفر طویل نہیں)

میں نے اوپر عرض کیا ہے کہ نظم کی زبان کے اعتبار سے ستیہ پال آنند کا تجربہ میرا جی مجید امجد اور اختر الایمان ہی کے سلسلے کی ایک کڑی ہے۔ اگر اس تجربے میں تکنیک کے عمل کو بھی شامل کر لیں تو ستیہ پال آنند اور اختر الایمان کے درمیان بہت سی مماثلتیں بڑی آسانی سے شمار کی جاسکتی ہیں۔ داستہ اور میں، سفر زادہ، کو کیے رشتے، تماشائی تماشائی نہیں ہوتے، زندگی واقعی بکی ہے، پر چند رمز آزمائش، پرچم طرگی اور ایلو بہا ہے، جیسی نظموں میں اختر الایمان کی گونج بہت نمایاں ہے۔ اختر الایمان جس طرح نظم شروع کرتے ہیں اور آہستہ روی کے ساتھ اسے

آگے بڑھاتے ہیں یا سوال قائم کرتے چلے جاتے ہیں اور پھر جس طریقے سے یک لخت ایک منطقی کلائمکس پر اسے ختم کر دیتے ہیں، یہی صورت ان نظموں میں بھی موجود ہے۔ اختر الایمان کے موضوعات جو بچپن، ماضی یا رشتوں سے متعلق ہیں یا جو بے حد مجرد خیال کئے جاتے ہیں (جیسے موت اور زندگی) جن کی تہہ میں فلسفیانہ تشکیک اور کرب کا پہلو نمایاں واضح ہوتا ہے۔ ستیہ پال آنند نے بھی انھیں بار بار برتنے اور آزمانے کی سعی کی ہے۔ اختر الایمان کے ناسٹلجیا میں زمان کے ہاتھ کے ساتھ کھونے کا احساس شدید ہے۔ اسی باعث ایک رومانی اور روحانی حزن اور اضمحلال ان کی نظموں کے رگ و پے میں گردش کرتا ہوا دکھائی دیتا ہے۔ جب کہ ستیہ پال آنند کے ناسٹلجیا میں زمان کی دوری محض ایک واقعے کی صورت اختیار کر لیتی ہے جسے شاعر زندگی اور فطرت کا تقاضا سمجھتا ہے۔ تقاضے کا لفظ اختر الایمان کے یہاں جبر کے لفظ میں بدل جاتا ہے۔ البتہ مکان کے بُعد کا تصور ستیہ پال آنند کے یہاں اپنے تہذیبی تفاخر اور مقامی فطرت سے دوری کے احساس سے مملو ہے۔

یہاں کون ہے جو کسی "سنگھ دوتم" سے / بارش میں بھیگے ہوئے برہا
گیتوں کے بولوں میں / بچھڑے ہوؤں کے سندیسوں کو بھیجے یہاں رہنے
والے تو بچھڑے ہوؤں کے / سندیسوں کی بھاشا سے نا آشنا ہیں / یہاں کون
ہے جن کے جو قفس میں مقید پرندوں کی گھائل صدائیں / جسے علم ہو شاہ بلوں پہ
اڑتے ہوئے زرد پتے / کبھی سبز شاخوں کی زینت تھے / بچوں کی مانند مسرور
تھے / تالیاں پیٹتے تھے! (موسموں کی نگری)

صدیاں بیتیں / عمریں گذر گئیں / جب میں سب کچھ بھول گیا تو یاد
آیا / دنیا کا اس میں پرواس / اپنے دیس کو لوٹوں گا تو کیا ہوگا؟ / میں اپنی بھاشا /
جیسے 'چکر' آلاپ / بھری ترلوری کے ڈھولک / بھاؤ سنوار / جیسے سنگل کٹھو کا
ڈمرو / ان صدا دھ / تو سب کچھ بھول چکا ہوں / لوٹوں گا تو کیا ہوگا / کیا بھولے
بھٹکے کو گنگا تیر کو / کھترت ہو کر بیٹھے کا وردان ملے گا / پھر سے گیان ملے گا؟
(گنگا تیر کی واپسی)

وقت لاوقت کی نظموں ہی کی طرح "سمے بیتا ہے" کی نظموں میں بھی شاعر نے اس دوری کے خلا اور احساس کو مذہبی فلسفیانہ فکر کے اس تصور سے زیادہ انگیز کرنے کی کوشش کی ہے جس کے تحت جسم کی مطلقیت کا تصور محض ایک واہمہ میں بدل جاتا ہے اور روح کی ابدیت تمام عارضی اشیاء اور حقائق پر حاوی ہو جاتی ہے، جو غیر مبدل ہے، دائمی ہے، ہوا ہے، مطلق ہے، وقت کا جبر جسے فنا کر سکتا ہے اور نہ وقت کی مرہون ہی ہے کیوں کہ وہ خود ایک ابدی وقت کی علامت ہے۔

آنے والی بحر بند کمزی ہے / جس سے میں گروں گا شیشے ٹوٹے
گا اور منزلوں کی بلندی کی پازیب باندھے / چھناکے کی آواز سے میں اڑوں
گا / فقط چند لمحوں کی پرواز ہوگی / فقط چند لمحے مری زیست اور موت کے درمیاں /
مجھ کو اڑنے کا احساس پوری فراہم کریں گے / میں اس بے حسی کی اسیری سے
آزاد ہو کر جیوں گا / فقط چند لمحے / کئی ایک عمروں کا حاصل!
(آنے والی بحر بند کمزی ہے)

ستیہ پال آنند نے جن نظموں کو پوسٹ لسانی نظموں کا نام دیا ہے دراصل اس نوعیت کی نظموں کے تجربے ہمارے ان جدید شعراء نے وافر تعداد میں کیے ہیں جو ۱۹۶۰ کے بعد اپنی طرف متوجہ کرتے ہیں۔ ۱۹۶۰ء سے بھی قبل منیر نیازی، اختر الایمان اور مجید امجد نے اس قسم کی نظمیں لکھی تھیں۔ منیر نیازی کے بعد عمیق حنفی، شہریار، محمد علوی اور ندا فاضلی کی اکثر نظمیں "کاش" کی صورت میں ہیں۔ یعنی یہ نظمیں مبہم اور معترضین اور اقتباسیے سے عاری، داخلی تجربوں اور مشاہدہ ہوتے ہوئے بے نیاز "مبہم اور نازک شعری وقفوں Pauses اور وزنوں سے معبر ہیں۔ شاعر محض بصارت کے ایک محسوس اور سامنے کے تجربے کو من و عن بیان بلکہ سب بلکہ نقل کرنے کی سعی کرتا ہے۔ ستیہ پال آنند کی یہ نظمیں بلاشبہ بڑی با زوم ہیں۔ شاعر کو اپنے جذبوں کا بے دریغ سنبھالے رکھنے اور زبان کی تخلیقی رو پر قدغن لگانے کا ہنر آتا ہے۔ یہ خوبی ان کی دوسری نظموں میں بھی موجود ہے گو وہ نظمیں اس ہنر سے عاری ہیں جو بیان یا اسٹیٹ منٹ کی سطح پر آ گئی ہیں، یعنی ایسی نظموں میں اکثر کسی فلسفیانہ تصور کی صراحت کی کوشش، تخلیقی تاثر پر حاوی ہو گئی ہے۔ "وقت لاوقت" کی بعض نظموں میں بھی یہ صورت نمایاں ہے۔

حاصل کلام یہ کہ ستیہ پال آنند کی نظموں میں ہر جگہ ایک فلسفیانہ رویہ برسرکار ہے۔ اسی بنیاد پر ان کے مفاہیم و موضوعات پر تعقل کی گرفت بھی مضبوط ہے۔ وہ وقت کو ماضی اور حال کے معنوں میں نہیں بانٹتے اور نہ ہی حال کی قیمت پر ماضی کو بے وقعت گردانتے ہیں بلکہ دونوں وقتوں کو ایک ہی تسلسل میں دیکھنے کے باعث آنے والے وقتوں میں انھیں لا یعنی کم امکان زیادہ نظر آتے ہیں۔ ان کی رومانیت اس فرد کی رومانیت ہے جو ہر بار ایک محسوس اور زندہ وجود کا حامل ہے اور جسے اپنے حیاتیاتی تقاضے بھی اتنے ہی محترم ہیں جتنے دیگر انسانی رشتے، اس رشتے میں فطرت بھی اپنا اہم کردار رکھتی ہے۔ اسی نسبت سے ستیہ پال آنند کے ان موضوعات پر مزید گفتگو کی گنجائش ہے جو عشق، جنس، اخلاق، عورت، پیدائش اور موت سے متعلق ہیں۔ ان موضوعات کو جہاں جہاں انھوں نے صیغۂ شعر میں باندھا ہے اپنے عہد کی زبان ہی کو ترجیح دی ہے۔ باوجود اس کے استعارہ سازی ان کے بیان کا خاص وصف ہے۔ علامت کا شعار اس نسبت سے کم ہے۔ اسی طرح ان کی نظموں کی تکنیک میں سوانحی عنصر پر بیشتر توجہ کے باعث "میں" کا صیغہ زیادہ حاوی ہے۔ اسی لئے واردات کی حیثیت بنیادی محرک کی ہے۔ جیسا کہ میں نے کہا تھا کہ ستیہ پال آنند کے موضوعات پر تعقل کی گرفت مضبوط ہے مگر جہاں تک تکنیک کا تعلق ہے نظم اپنی راہ آپ بناتی ہے۔ شاید اسی بنا پر زیادہ تر نظمیں اپنی فضا، زبان کے برتاؤ اور تکنیک میں غیر ملکی پن کا احساس دلاتی ہیں۔ نظم کے شاعر میں یہ استعداد بہت بڑی کامیابی کے مترادف ہے۔

باپ دادا کے گناہوں کی سزا

ستیہ پال آنند

"اور میں تمہارا خدا
خدائے برتر
قہار اور جبار بھی ہوں
اور ——
باپ دادا کے گناہوں کی سزا
بیٹوں اور پوتوں تک کو دیتا ہوں"

..........مقدس انجیل (Holy Bible)

....

"بیج کر دو کچھ شجر ممنوعہ
پھل ہمیشہ زہر ہوئے گا
نسل در نسل چکھا جائے گا!"

..........اِبسن (Ibsen)

....

وہ ٹخنوں کے بل اکڑوں ہو کر بیٹھ گیا۔ اس نے اپنی نظر دور جھاڑی کے پیچھے مرکوز کر دی جہاں سرخ، سبز رنگوں والی ایک چنری کبھی لہرا جاتی، کبھی پل بھر کے لیے آنکھوں سے اوجھل ہو جاتی۔ اس کا سارا جسم ایک کمان کی طرح تن گیا۔ ہلکے ہلکے ٹھنڈے سانس گرمی سے ترچھے ہو کر ہلنے لگے۔ اس نے گھبرا کر ادھر اُدھر دیکھا لیکن جہاں تک نظر جاتی تھی، بیری اور کیکر کی جھاڑیاں تھیں اور گرمی کی لہروں سے اٹھتی ہوئی بھاپ تھی جو گیلی مٹی سے سورج کی تمازت کی وجہ سے رونما ہو رہی تھی۔ گاؤں بہت پیچھے رہ گیا تھا۔ وہ بالکل اکیلا تھا۔

گرمی کی دہکتی ہوئی دوپہر میں کون تھا جو خواہ مخواہ گھر سے باہر نکل کر اس کا پیچھا کرتا اور پھر کسی کو پڑی بھی کیا تھی؟ پھر بھی گاؤں کی تنگ گلیوں کے پیچ و خم سے گزرتے ہوئے اس نے اس بات کا یقین کر لیا تھا کہ کوئی اس کی منزل کے بارے میں جان نہ جائے۔ راستے میں ایک جگہ اسے وہی شریر لڑکا خلدو ملا بھی تھا۔ بھینسوں کے ٹوکے پر چارہ کترتے ہوئے اس نے بس ایک آنکھ اٹھا کر دیکھ لیا تھا اور ہونٹوں پر ہلکی سی مسکراہٹ لاتے ہوئے اس نے پوچھ ہی لیا تھا۔

"کیوں دیجے، کہاں جا رہے ہو؟"

اور جب اس نے کوئی جواب دیے بغیر نکل جانے کی کوشش کی تھی تو خلدو نے دوسرا تیر چھوڑا تھا۔

"دیجے بھلے، کیا بیوی کی تلاش میں جا رہے ہو؟"

او میرے خدا! اس نے دل میں سوچا تھا، اسے میری بات کا علم رہتا ہے! کیوں نہ ہو گا، کانا جو ٹھہرا! کہتے ہیں کانے کے دماغ میں ایک رگ زیادہ ہوتی ہے۔ تو بھی اس نے سنبھل کر پوری چالاکی سے کام لیتے ہوئے بے خبر ایک قدم ہٹ کے جواب دیا تھا "بھلا ہو گا تیرا باپ! ارے کانے! تو نے بھنگ تو نہیں پی رکھی؟ دوپہر میں کیا میں فضول کاموں کے لیے گھر سے باہر نکلوں گا؟"

اور وہ آگے نکل آیا تھا۔ گلی کا موڑ مڑتے ہوئے اس نے گھوم کر دیکھا تھا۔ خلدو اسی طرح چارہ کاٹ رہا تھا۔ تب اسے یقین ہو گیا تھا کہ اب اس کی طرف کسی کا دھیان نہیں۔ اس نے جلدی جلدی پاؤں آگے بڑھائے اور گاؤں کے شرقی کونے میں چماروں کے گھروں کی بودی گلیاں گزرتا ہوا گاؤں سے باہر نکل آیا تھا۔ کانے نے ٹھیک ہی کہا تھا "چاچا جوگیا! بیوہ لے، باڑھ سے آگے نکلو گے، سامنے جھاڑیوں کے پیچھے جوگیوں کے اجڑے ہوئے ٹیلے کے پاس وہ بیٹھی ہوئی مل جائے گی...... بس مجھ سے پوچھو اس کی بات! اتنی خوبصورت ہے ذوالفقار جیسے عقل کی چوکی بیوی بھی اس کے مقابلے میں کچھ نہیں! ماں باپ مر گئے، صرف ایک اکیلی جان ہے۔ کہتی ہے کسی اچھے گھر کے آدمی سے شادی ہو جائے تو ساری عمر اسی کے ساتھ کاٹ دوں..... صرف بیس بائیس برس کی ہے......"

"لیکن......" وہ ہکلایا تھا اور اس کے حسرت زدہ دل کی ایک پتلی لکیر نیچے کی طرف بہہ آئی تھی..... "وہ مان بھی تو جائے گی نا؟"

"ارے دیجو بھلے! تم اب اس بات کی فکر نہ کرو۔ تمہاری عمر ہی کیا ہے! بس چالیس کے قریب ہو گے..... اور ساری عمر ضبطِ نفس بھی تو تم ہی نے کیا ہے!"

"ضبطِ نفس کیا ہوتا ہے؟" اس نے پوچھا تھا۔

"وہ جو تم کرتے رہے ہو..... یعنی عورت کے قریب نہ پھٹکنے کی عادت..... وہ ساری طاقت تو تم نے سنبھال کر رکھی ہوئی ہے۔ دو ادھار جان پورے پندرہ سو روپیہ جو تمہارے نام بڑھ گئے ہیں اب تو تم خود ہی یہ روپیہ بھابی زینت کے حوالے کر دیتے ہو اور گھر کی کچی پکی کھا لیتے ہو، لیکن جب تمہاری گھر والی آ جائے گی تو سب سنبھال لے گی!"

کانے نے ٹھیک ہی کہا تھا، اس نے اکڑوں بیٹھے ہوئے سوچا۔ وہ سامنے جوگیوں کا اجڑا ہوا ٹیلہ ہے، جھاڑیوں کے پیچھے لہراتی ہوئی چنری صاف دکھائی دے رہی ہے۔ کبھی پل بھر کے لیے نظروں سے اوجھل ہو جاتی ہے تو کبھی پھر سامنے آ جاتی ہے۔ شاید بیٹھے بیٹھے تھک گئی ہے اور کھڑی ہو کر جھاڑیوں سے پرے تو دیکھ رہی ہے۔ دائیں بائیں آگے پیچھے اور کوئی نہیں ہے۔

اس نے سوچا اب اٹھنا ہی چاہیے، کوئی نہیں دیکھ رہا۔ گھڑی بھر کے لیے رک کر تیز تیز قدموں سے آگے جانا چاہیے۔ وہ اسے دیکھ کر شرمائے گی تو

ضرور۔ شاید ویسے ہی جیسے کئی برس پہلے نئی نویلی دلہن بن کر آئی ہوئی اس کی بھابی زینت اسے دیکھ کر شرمائی تھی۔ اس وقت وہ تیس برس کا تھا۔ اسے وہ واقعہ اچھی طرح یاد تھا۔ اس کے بھائی سرور خان کا نکاح ہوا اور بہو گھر میں آئی تو سب نے اسے گھیر کر اسے اس بات پر راضی کر لیا کہ وہ چپکے سے پیچھے جا کر نئی بیوی کی آنکھوں پر ہاتھ رکھ کر پوچھے "میں کون ہوں؟" پہلے تو وہ بہت ہچکچایا۔ لیکن ہم عمر نوجوانوں نے بلکہ گھر میں چھوٹے لڑکوں نے بھی اسے گھیر لیا اور کہا کہ یہ رسم بہت پرانی ہے۔ بھائی کی بیوی کی آنکھوں پر ہاتھ رکھ کر یہ سوال کیا جانا ضروری ہوتا ہے کافی آنا کانی کے بعد وہ پہلے تو اس کی چارپائی کے سامنے پہنچا' جس پر اس کی نئی بھابی دلہن کے جوڑے میں ملبوس بچی سکڑی ہوئی بیٹھی تھی پھر دھیرے دھیرے نظریں اٹھا کے اس نے دلہن کے چہرے پر شاید ایک پل کے لیے وہی روپ رنگ دیکھا جو کبھی اس کی ماں کے چہرے پر تھا۔ اس کی ماں جو بہت مدت پہلے مر چکی تھی۔ اس سے اور تو کچھ بن نہ پڑا آگے بڑھ کر اپنی بھابی سے لپٹ گیا۔ سبھی ششدر رہ گئے۔

اس کا بھائی محمد خان پہلے تو اپنی بیوی کو اس کی گرفت سے چھڑوانے کے لیے آگے بڑھا لیکن جب اس نے دیکھا کہ وہ اس کی گود میں منہ چھپائے سسک سسک کر رو رہا ہے تو جیسے سبھی کے دل پسیج گئے۔ تب سے زینت بھابی سے اس کا وہی رشتہ قائم ہو گیا جو ماں اور بیٹے کا ہوتا ہے' حالانکہ وہ عمر میں اس سے ایک برس چھوٹی تھی۔ وہ زینت بھابی کے برتن صاف کرتا نہانے کے لیے کنوئیں سے پانی لا دیتا۔ اس کے بچوں کو کھلاتا اور وقت آنے پر تھکے ہوئے بھائی کے پاؤں دبانے کے علاوہ بھابی کے پاؤں دبانے سے بھی نہ ہچکچاتا۔ وہ منع کرتی رہتی اور وہ اس کی پائنتی بیٹھ کر پاؤں دباتا رہتا۔ جب تک کہ ساتھ کی چارپائی پر لیٹا ہوا اس کا بھائی نہ کہتا۔ "دیکھو! اب بس کرو' کافی خدمت ہو گئی بھابی جان کی!"

اور اس کی بھابی کہتی "دیکھو تم تو کوئی فرشتہ ہو۔ تمہیں بھلا کون کہتا ہے! میں تو سمجھتی ہوں۔ تمہارے بغیر میرا گھر ایک دن بھی نہیں چل سکتا۔"

اس کے گزور گھٹنے دور کرنے لگے تو وہ ایک پتھر کا سہارا لے کر اٹھ کھڑا ہوا۔ سامنے جھاڑی کے پیچھے سے لہراتی ہوئی چنری سے اسے جیسے اپنی بھابی زینت کا تیس برس پہلے کا چہرہ ابھرتا ہوا نظر آیا' کھلا ہوا تازہ شبنم سے گلاب کی طرح وہ چند قدم آگے بڑھا مگر بجری کی سے نہ ایک جوتیوں کے تل کے آس پاس بنے کنارے سے اس کا پاؤں پھسلا اور وہ گرتے گرتے بچا۔ تبھی جھاڑیوں میں کچھ سرسراہٹ سی ہوئی۔ وہ ٹھٹھک گیا کچھ لمحوں تک وہ سانس روکے ہوئے اسی طرح کھڑا رہا۔ سامنے والی جھاڑی کے پیچھے ہی وہ چنری پھڑپھڑا رہی تھی۔ بس صرف پچاس کے لگ بھگ قدم ہوں گے! اس کا جی چاہا وہ اسے آواز دے "میری رانی!" لیکن اس نے اپنا گلا تنگ محسوس کیا۔ اس کا بھائی اپنی بیوی کو "رانی" کہہ کر ہی بلاتا تھا۔ لیکن گلا تھا کر منہ کے لعاب سے تر کرنے

کے باوجود کوئی آواز نکلنے سے قاصر تھا۔ اس کے ڈھیلے ڈھالے نیم جان سے قدم آگے بڑھے۔ کیکر کے کانٹوں سے لدی ہوئی جھاڑیوں میں چھوٹے چھوٹے زرد پھندنے لٹک رہے تھے۔ تبھی دائیں طرف کی جھاڑیوں میں پھر کھٹکا ہوا۔ وہ بجلی کی سی تیزی کے ساتھ مڑا۔ لیکن کوئی نہیں تھا۔ کسی کے وہاں ہونے کا سوال ہی نہیں اٹھتا تھا۔ سب اس کے تصور کا وہم تھا۔ "دیکھو! تمہیں تو وہم ہو گیا ہے....." گاسوں نے کہا تھا۔ "تم مجھے ہو اب تمہاری شادی ہو ہی نہیں سکتی۔ ارے تم کہو تو میں ڈاکانہ سے بیرنگ لفافے میں ولایت سے میم منگوا دوں تمہیں!" اس کی آنکھیں حیرت سے چوڑی ہو گئی تھیں۔ گوری چٹی' بھورے بالوں والی' اونچی' لمبی میم' جیسے تصویروں میں ہوتی ہے۔ اس نے پوچھا تھا' "سب کے لئے آ جاتی ہے کیا؟"

لیکن اس وقت تو اس کے سب خوابوں کی تعبیر اس کے سامنے تھی۔ بس اب کچھ ہی قدموں کا فاصلہ تھا۔ بڑی جھاڑی کے پاس پہنچ کر وہ کھٹکا۔ اسے محسوس ہوا جیسے کچھ سنسناہٹ سی ہوئی ہے جیسے چوڑیاں کھنکی ہوں۔ اس کی پیشانی پسینے سے بھیگ گئی۔ آنکھوں کے سامنے کہرا سا چھانے لگا۔ اس کے دل کے ایک کونے نے جیسے صدیوں کی پیاس نے اسے پکار کر اپنے وجود کی یاد دہانی کروائی۔ دوسری طرف سے جیسے کوئی چور اس کے پاؤں میں رسی ڈال رہا تھا۔ اس نے دل کڑا کیا اور ایک بار پھر کھنکار۔ پھر چوڑیاں کھنکنے کی آواز آئی۔ اب وہ جھاڑی کے گرد گھوم کر سامنے آ گیا۔ پتھر پر اس کی طرف پشت کئے' سر نیچا کئے عورتوں کی قمیض لیکن سفید مردانہ شلوار میں ملبوس کوئی شبیہ نظر آئی۔ ایک چنری جھاڑی کے کانٹوں سے اڑی ہوئی پھڑ پھڑا رہی تھی' جیسے خشک کرنے کے لیے ڈال دی گئی ہو۔ وہ پھر کھنکارا۔ اسے کوئی جواب نہ ملا۔ دھڑکتے ہوئے دل کو قابو میں رکھنے کے لئے دونوں ہاتھوں سے دباتے ہوئے وہ وہیں زمین پر بیٹھ گیا۔

تبھی چوڑیاں پھر کھنکیں۔ نسوانی کپڑوں کی سرسراہٹ نے جیسے آگے بڑھ کر اسے اپنی لپیٹ میں لے لیا لیکن وہ تو نیم بے ہوش سا زمین پر بیٹھا تھا۔ اس کی نظر نے جیسے اٹھنے سے انکار کر دیا۔ کسی نے پیچھے سے اس کے کندھوں پر ہاتھ رکھے' پر اس کا سر ان ہاتھوں نے تھام لیا۔ اسے ان ہاتھوں کا لمس بہت اچھا لگا۔ اس نے اپنی آنکھیں بند کر لیں۔ اس کے سر پر رکھی ہوئی ململ کی سی ٹوپی کھسک کے نیچے گر پڑی تو بھی اسے پتہ نہ چلا۔ ہاتھ اس کے سر کے خشک اور چکٹے بالوں کو سہلاتے ہوئے نیچے آ گئے گردن پر پہنچ کر آ رہے تھے۔ وہ ہیں ٹھنڈے کے دبے۔ کسی کے تیز چلتے ہوئے گرم سانسوں کا احساس اسے اپنی گردن پر ہوا..... پھر انہی ہاتھوں نے پہلے آہستگی سے اور پھر ذرا مضبوطی سے اس کا گلا دبانا شروع کیا۔ احساس کی نیم بے ہوش رگ جیسے یکایک جاگ گئی۔ وہ چیخ کر اٹھ کھڑا ہوا اور غصے اور حیرت کے ملے جلے جذبے نے اس کی آنکھیں کھول دیں۔

سامنے گاسو کھڑا تھا!

نسوانی کپڑے پہنے ہوئے ہاتھوں سے کہنیوں تک کانچ کی

چٹیاں سجائے ہوئے گامو ایک بھیانک سی چڑیل کی شکل بنائے ہوئے تھا۔ دینو کے منہ سے عجیب و غریب قسم کی آوازیں نکلیں۔ اس کی آنکھیں آنسوؤں سے بھر گئیں، اور وہ یہ بھی نہ دیکھ سکا کہ دائیں بائیں کی جھاڑیوں سے گاؤں کے شرارتی لڑکوں کا ایک گروہ پلک جھپکنے کی دیر میں ہی نکل آیا ہے۔ ان میں کالا تھا، شیو تھا، یوسف تھا، شکیل احمد جسے کالا کہتے تھے، جھاڑی سے چنری اتار کر دینو کے سر پر اوڑھانے کی کوشش کر رہا تھا۔

اسے کچھ سجھائی نہ دیا تو اس نے بھاگنے کی کوشش کی لیکن اس کے کمزور پیلے گھٹنے جواب دے گئے اور وہ وہیں دھم سے بیٹھ گیا۔

"دینو چھلے کی جورو تیری میری بھابی" وہ لہک لہک کر گانے لگے۔

تبھی انہوں نے اس کا "ڈنڈا ڈولی" بنایا۔ ایک نے اس کی ٹانگیں پکڑیں اور دوسرے نے بازو پکڑ کر کندھوں سے اوپر اٹھائے ہوئے آگے بڑھنے لگے۔ پیچھے پیچھے گامو تھا اپنی نانی کے کپڑوں میں ملبوس لمبا تڑنگا سیاہ بھجنگ غلام محمد جسے سب گامو کہتے تھے، اپنی چٹیاں جھٹکاتا ہوا ٹھمک تال دے رہا تھا۔

"دینو چھلے کی جورو تیری میری بھابی!"

تبھی انہوں نے اپنی سرتال بدلی۔ ایک نے ماتم کے لہجے میں پکار دی۔

"دینو چھلا مر گیا، گامو رنڈوا ہو گیا!"

لڑکے دہاڑیں مار مار کر رو رہے تھے اور ساتھ ہی زور زور سے ہنس بھی رہے تھے۔ ذرا سی دیر میں گاؤں پہنچتے ہی دروازے کھلے اور کئی لڑکے باہر نکل آئے۔ اب یہ جلوس پوری ماتمی شکل اختیار کر گیا۔ تب کچھ منچلوں نے سینہ کوبی شروع کر دی جیسے جنازہ اٹھائے ہوئے ہوں۔ جب جلوس اس گلی کے موڑ پر پہنچا، جس میں اس کا گھر تھا، تو جیسے دینو کو یکدم ہوش آ گیا۔ وہ تڑپ کر اچھلا، ان کے ہاتھوں سے زمین پر گرتے ہی اٹھا اور پیشتر اس کے کہ وہ اسے دوبارہ پکڑ سکتے، سرپٹ بھاگنے لگا۔ اپنی ڈیوڑھی کے دروازے پر اس کے بھتیجے بھتیجیاں یہ تماشہ دیکھنے کے لیے باہر نکل آئے تھے۔ تب ہی اس کی بھابی باہر آ گئی، وہ دوڑ کر بھابی کی ٹانگوں سے لپٹ گیا۔ "دیکھ بھابی...... بھابی!" وہ ہکلانے لگا۔

لیکن شرارتی لڑکے تو اب تک ہوا ہو چکے تھے۔

......(۲)......

بہت برس پہلے دادا زندہ تھے اور دیہاتی معاملات میں اپنے مقدمہ جیتنے کے بعد گاؤں کے سب سے بڑے زمیندار گنے جانے لگے تھے۔ علاقے بھر میں ان کی دھاک تھی۔ تحصیلدار دورے پر آتا تو انہی کے مہمان خانے میں ٹھہرایا جاتا۔ دادی کب کی جنت مکین ہو چکی تھیں اور دینو کے اپنے والد تو بس دائم المریض تھے۔ کبھی جگر کی بیماری زور پکڑ جاتی تو کبھی دل کے دورے پڑنے لگتے۔ کبھی دمہ گھیر لیتا تو کبھی خون کے ساتھ پیچش بھی ہو جاتی۔ دادا جان کا تو صرف ایک بیٹا تھا اور وہ بھی نہ ہونے کے برابر لیکن بزرگوار اکثر کہا کرتے "میرا اکلا جان محمد زندہ بھی رہے تو مجھے کوئی غم نہیں ہے۔ میں سمجھتا ہوں اللہ مجھ پر مہربان ہے۔ میرے تین پوتے ہیں سب سے چھوٹا دین محمد تو میرا جگر ہے، میرا دل ہے، ابھی پانچ برس کا ہے لیکن ایک دو برس کے بچے جیسی طبیعت ہے۔ اتنا بھولا بھالا، اتنا معصوم لگتا ہے یہ بڑا ہو کر بھی ایسا ہی رہے گا۔ لیکن کوئی بڑی بات نہیں اگر سن بلوغ تک پہنچتے پہنچتے فوج میں کرنل ہی بن جائے..... میں اسے لاہور تک پڑھاؤں گا!"

تب اس کے اپنے والد بہت سخت بیمار تھے۔ حکیم کا خیال تھا کہ وہ زیادہ سے زیادہ چھ ماہ اور زندہ رہ سکیں گے۔ چارپائی پر پڑے ہوئے وہ اتنے کمزور لگتے کہ کبھی بار انہیں دیکھ کر خوف آتا۔ بڑھی ہوئی داڑھی، روکھے سوکھے بال، مرجھایا ہوا زرد چہرہ، بڑی بڑی ڈوبی ہوئی آنکھیں اور بہت ہی کمزور جسم۔ ٹانگیں سوکھ کر دو تیلیاں جیسی رہ گئی تھیں۔ اتنے کمزور ہو چکے تھے کہ اس کی ماں یعنی ان کی بیوی، نوکر کو بلائے بغیر انہیں اپنے ہاتھوں میں اٹھا کر ایک چارپائی سے دوسری تک با آسانی لے جاتی تھی۔ روگی تو وہ شاید بچپن سے ہی تھے لیکن اٹھارہ برس کی عمر میں جب دادا نے اس کی شادی کر دی تو جیسے اچانک ان کی صحت اچھی ہو گئی تھی۔ چہرے پر رنگ اور نکھار آ گیا تھا۔ بیماری شاید پیچھا چھوڑ گئی تھی۔ یہاں تک کہ وہ اپنی بیوی کو ساتھ لے کر لاہور تک سیر کے لیے ہو آئے۔ ان کی صحت بالکل ٹھیک تھی۔ دادا جان بہت خوش تھے۔ پیر لکھے شاہ کی درگاہ پر پانچ بکرے ذبح کیے اور مسکینوں بھوکوں کو کھانا کھلایا۔ زمینداری چلتی تھی۔ اور خوب چلتی تھی۔ مزارعے بے شمار تھے اور بٹائی پر دی گئی زمینوں سے سینکڑوں من غلہ آتا تھا۔ اس پر طرہ یہ کہ کئی زمینیں ان کے پاس رہن تھیں اور آہستہ آہستہ ان کی ملکیت بنتی جا رہی تھیں۔ دادا جان کو کئی برسوں کی بیماری سے نجات پانے کے بعد ہاتھ بٹانے والا ملا تو وہ بھی کام سے کچھ بے فکر ہو گئے۔ دادی کو جنت مکین ہوئے تو کئی برس ہو چکے تھے، اس لیے وہ اب اکیلے یا اپنی عمر کے دوستوں کے ساتھ رنگ رلیوں، میلوں تماشوں پر جانے لگے۔ بیلداروں کے ساتھ علاقے میں گھومنے لگے۔ کہا جانے لگا کہ انہوں نے شراب بھی پینا شروع کر دی ہے۔ تب دادا جان کا پہلا بچہ پیدا ہوا۔ خوب خوشیاں منائی گئیں۔ پھر دو برسوں کے بعد دوسرا بچہ پیدا ہوا۔ گل محمد خان اور سرور خان کی جوڑی!

دادا کہتے تھے "میرے گھر میں تو خوشیاں ہیں۔ دو لال جیسے پوتے اور ایک برخوردار بیٹا اور بہو بھی ہے تو جیسے گھر میں چاندنی چھٹک رہی ہو۔"

لیکن دوسرے بیٹے کے بعد جان محمد کی طبیعت بگڑنی شروع ہو گئی۔ وہ پھر بیمار رہنے لگے۔ آہستہ آہستہ صحت گرتی گئی۔ پہلے کھانسی شروع ہوئی۔ پھر خون کی پیچش آنے لگی۔ پھر آنتڑیوں میں درد شروع ہوا اور آخر میں حکیم نے یہ بھی کہہ دیا کہ انہیں دل کی بیماری بھی ہے۔ تین برس اسی طرح گزرے۔ دادا جان ایک بار پھر کام سنبھالنے لگے۔ ایک بار پھر ان کا زیادہ وقت گھر کے اندر گزرنے لگا۔ علاج میں کوئی کسر نہ اٹھا رکھی گئی۔ لاہور تک سے حکیم اور ادویات

منگوائی گئیں۔ خیرات کے لیے جھولیاں کھول دی گئیں، لیکن جان محمد کی حالت دن بدن خراب ہوتی چلی گئی۔ تب ہی ایک اور لڑکا پیدا ہوا۔

گاؤں میں دادا جان کا بہت رعب تھا۔ لیکن پھر بھی گاؤں والوں کی آنکھیں حیرت سے پھیل گئیں۔ دیکھیے قدرت کے رنگ! جان محمد بستر سے اٹھنے کے ناقابل زندگی کی آخری سانسیں گن رہا ہے، لیکن اللہ نے اس کی بیوی کی گود ہری کی ہے۔ کیوں نہ ہو، اللہ جس پر مہربان ہو، اس کے تو وارے نیارے ہو جائیں، تو بھی یہ قسمت کیا کم ہے۔ صحت کی خوشی نہیں ہے، جسم کا کچھ صرف نہیں ہے، لیکن روح کی بالیدگی تو ہے۔ بیٹے کے پیدا ہونے کی مسرت تو ہے۔ دادا جان تو جیسے خوشی سے پھولے نہ سمائے۔ انہی دنوں انہیں ایک بڑے مقدمے میں کامیابی ملی اور ساتھ ہی پانچ چھ لاکھ روپے کی زمین قبضے میں آ گئی۔ "میرے دین محمد کی پیشانی پر دولت ہی دولت لکھی ہے۔" انہوں نے کہا۔ "دیکھو پیدا ہوتے ہی اپنے ساتھ کیا لایا! یہ بچہ تو بہت خوش قسمت ہے!"

تب دادی نہیں تھی اور جان محمد تو بستر پر پڑے کھانستے ہی رہتے تھے، اس لیے سارا گھر دادا جان کی کوششوں سے ہی چل رہا تھا۔ اس کی ماں، دادا جان یعنی اپنے سسر کے سامنے سر پر کپڑا لیے بیٹھ کر گھر کے کام کاج میں مصروف رہتی۔ وہ ماں کے گھٹنوں کے ساتھ لگا بیٹھا رہتا۔ کبھی کبھی صبح صبح ہی منہ اندھیرے اٹھ کر ماں چکی پیسنے بیٹھ جاتی اور دادا جان کی آنکھ کھل جاتی تو وہ وہیں سے پکار کر کہتے: "بہو! تمہیں لاکھ بار کہا ہے کہ تو چکی مت پیسا کر۔ چار نوکرانیاں تو ہیں گھر میں تیرا ہاتھ بٹانے کے لیے! تجھے تو بیٹھ کر آرام سے حکم چلانا چاہیے!"

لیکن وہ خاموشی سے سر نیچا کیے چکی پیستی رہتی جیسے یہ اس کے لیے کوئی سزا ہو۔ اور کئی بار تو دادا جان اپنے نواڑی پلنگ سے اٹھ کر اس کے سر پر آ کھڑے ہوتے۔ "چل اٹھ، جا کر نہا دھو۔ بچے کو سنبھال۔ دینو بستر پر پڑا رو رہا ہے۔ چکی پھر پیسی جائے گی!" اور وہ اسے بازو سے پکڑ کر ایک جھٹکے سے اٹھا کر کھڑا کر دیتے۔ اس کی ماں چہرہ اٹھا کر ان کی طرف دیکھتی تو اس کی آنکھیں گیلی ہوتیں، جیسے چکی پیستے پیستے روتی رہی ہو۔ دادا جان ذرا غصے سے کہتے: "بہو! تمہیں دکھ کس بات کا ہے....." وہ کہنا شروع کرتے کہ اندر سے اس کے باپ جان محمد کے کھانسنے کی آواز آنے لگتی۔ وہ فوراً الٹے پاؤں لوٹ جاتے۔ اس کی ماں دھم سے پیڑھی پر بیٹھ جاتی اور دادا جان کہتے: "جا، جا کر جان محمد کو دیکھ۔ بے چارہ بری طرح کھانس رہا ہے۔"

ان دنوں دینو تو صرف پانچ برس کا ہی ہوا تھا، لیکن اس کے دونوں بڑے بھائی اسکول جاتے تھے۔ محمد خان دس برس کا تھا اور سرور خان آٹھ کا۔ گاؤں میں نیا نیا پرائمری اسکول کھلا تھا۔ مڈل اور میٹرک کرنے کے لیے لڑکوں کو تحصیل کے قصبے میں بھیجا جاتا تھا۔ اس کے دونوں بھائی اپنے قاعدے اور تختیاں لے کر جب اسکول جاتے تو ماں انہیں لسی کے ساتھ پراٹھے کھانے کو دیتی۔ وہ بھی ساتھ بیٹھ جاتا۔ اس کی ماں پہلے اسکول جانے والے بچوں کو مکھن لگے پراٹھے دیتی تھی۔ پھر ایک "گوگی" اس کے لیے بھی بناتی۔ اس کی پلیٹ میں رکھتی۔ لسی اور مکھن پینے کے لیے ایک چھوٹے سے گلاس پر دادا جان نے اس کا نام کھدوایا تھا، جو اس کے لیے مخصوص تھا۔ اگر وہ ضد کرتا کہ وہ بھی بڑے بھائیوں کی طرح بڑے گلاس میں لسی لے گا تو ماں کہتی: "نہیں، دادا جان غصے ہوں گے!" اور پراٹھے کے نوالے توڑ توڑ کر اسے اپنے ہاتھوں سے کھلانے لگتی۔ سر پر ہاتھ پھیرتی۔ پیار کرتی۔ لیکن یہ سب کچھ صرف اس وقت تک ہوتا جب تک دادا جان گھر پر رہتے۔ جونہی وہ مسواک دانتوں سے چباتے ہوئے رسی اور ڈول لے کر کنوئیں پر نہانے کے لیے ڈیوڑھی سے باہر نکلتے اور اس کے دونوں بھائی جوگی کی دھاری والی سفید شلواریں پہن کر اسکول کے لیے روانہ ہو جاتے، اس کی ماں اسے وہیں چھوڑ کر اٹھ جاتی۔ وہ چلاتا، چیختا، چلاتا۔ اس کی گندی ناک بہہ کر ہونٹوں تک پہنچ جاتی۔ اس پر مکھیاں بھنبھنانے لگتیں۔ کوے آ کر اس کی روٹی چھین کر لے جاتے۔ لیکن اس کی ماں تو جیسے اس کے لیے بہری ہو جاتی۔ وہ صحن کی دوسری طرف اس کے ابا کی چارپائی پر بیٹھ کر اس کی ٹانگیں دبانے میں یا ہاتھ منہ دھلانے میں مصروف رہتی۔ ایک دو بار اس کی طرف دیکھتی بھی تو زہریلی نظروں سے۔ اس کے ابا کہتے بھی: "دینو کی ناک پونچھ دے۔ دیکھ تو رو رو کر کیا حال کر رہا ہے۔" لیکن وہ اسی طرح ان کے پاس بیٹھی رہتی۔ تب اگر یکایک دادا جان باہر سے آ جاتے اور دینو ان کی طرف ہاتھ کر کے چلاتا: "دا.... دا.... دا.... دا" تو وہ سب کچھ پھینک کر لپک کر اس کے پاس پہنچتی، اس کی ناک صاف کرتی، اسے پچکارتی، پیار کرتی، ڈنڈا لے کر کوے اڑا اڑا کے اسے ہنسانے کی کوشش کرتی۔ پھر خود بیٹھ کر اسے کھلانا شروع کر دیتی۔ تبھی اس کے ابا اس کی ماں کے کانوں میں کچھ سرگوشی کرتے۔ ماں اٹھتی لیکن بے دلی سے۔ سر پر دوپٹے کو مضبوطی سے جماتے ہوئے وہ ان کے پاس جاتی، دینو کو اٹھا لیتی اور خود پیڑھی پر بیٹھ کر اسے گود میں بٹھاتے ہوئے کھلانے لگتی۔

پھر جب ایک دن اس نے ضد کی کہ وہ اپنے بھائیوں کے ساتھ اسکول جائے گا تو ماں نے اسے جھڑک دیا۔ لیکن دادا جان خود اسے انگلی سے پکڑے اسکول لے گئے۔ راستے میں حلوائی سے انہوں نے دس روپے کا لڈو بیدانہ لیا۔ ایک دکان سے اردو کا قاعدہ اور تختی خریدی اور راستے میں جانے والے سب بچوں کو لڈو بانٹتے ہوئے استاد منشی کرامت علی کے سامنے جا کھڑے ہوئے۔ منشی صاحب انہیں دیکھ کر کرسی چھوڑ کر اٹھ کھڑے ہوئے۔ بڑے احترام سے تکلیف فرمانے کی وجہ پوچھی۔ پھر رجسٹر میں بچے کا نام دین محمد لکھ کر ولد کے نام کے خانے میں کچھ لکھنے سے پہلے ایک لمحے کا توقف کیا۔ پھر جان محمد کا نام باپ کے طور پر لکھ کر آگے تحریر کیا: "میر خان صاحب اللہ داد۔" پیدائش کی تاریخ پوچھی۔ اس کا اندراج کیا اور دادا جان کے دستخط کروانے کے بعد انہوں نے چپڑاسی سے کہا کہ بچے کو استاد رستم خان کے پاس چھوڑ آئے۔ جب دینو نے دادا جان کو ساتھ لے کر چلنے کی ضد کی تو وہ اٹھ کھڑے ہوئے۔ "بچہ ہے۔ ایک

دونوں میں دوسروں کے ساتھ گھل مل جائے گا۔ اب میں اسے گھر لے چلتا ہوں!"

دوسری صبح وہ اپنے بھائیوں کے ساتھ گیا۔ پھر وہ لگاتار ایک ماہ تک جاتا رہا۔ اس دوران میں دس بارہ قاعدے پھٹے۔ پانچ سات تختیاں گم ہوئیں، لیکن دینو ابجد نہ سیکھ سکا۔ تین بار غصے میں آکر منشی رحیم خان نے اسے چانٹے بھی رسید کیے۔ وہ بہت رویا۔ اس کی ناک میں سے گندگی بہہ آئی تو وہ خود نہ پونچھ سکا۔ شرارتی لڑکے ازار بند کھینچ کر کھول دیتے تو وہ خود باندھ نہ سکتا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ ایک ماہ میں ہی دادا جان نے اسے اسکول بھیجنا بند کر دیا۔ اس کے بڑے بھائیوں کو جھڑکا، کہ وہ اس کا خیال نہیں رکھتے۔ پھر دادا جان نے پیر اعظم میاں کو ڈھائی سو ماہانہ پر مقرر کیا کہ وہ ایک گھنٹہ روزانہ گھر پر پڑھائیں، لیکن پیر اعظم میاں آتے رہے اور جاتے رہے۔ دینو پڑھائی میں تو کورا ہی رہا لیکن ان سے کچھ گالیاں ضرور سیکھ گیا جو وہ کبھی کبھار دہراتا رہتا اور کئی برس مالش کرنے کے بعد اپنا نام لکھنا بھی سیکھ گیا۔ "دین محمد" اب اکثر اوقات کوئلے یا چاک سے گھر کی دیواروں پر اپنا نام لکھتا رہتا اور منع کرنے کے باوجود اپنے ہاتھوں، بانہوں یہاں تک کہ کپڑوں پر بھی اپنا نام لکھ کر انہیں کالا کرتا رہتا۔ نو برس کی عمر میں جب اس نے دادا جان کے صندوق سے دو سو روپے کی چوری کر کے فضلو مراثی کو جا دیے تو انہیں پہلی بار احساس ہوا کہ لڑکا دماغی طور پر تندرست نہیں ہے۔

"تو نے روپے کیوں اٹھائے؟" انہوں نے جھڑکتے ہوئے پوچھا تھا۔

"فضلو نے کہا تھا!" ہونٹوں سے بہتی ہوئی رال کو زور سے واپس کھینچتے ہوئے اس نے جواب دیا تھا۔

"اسے کیوں دیے، مجھے کیوں نہیں دیے؟" دادا جان نے پوچھا۔

"فضلو مجھے اچھا لگتا ہے..... "جواب ملا "مجھے ڈھول بجانے دیتا ہے"

دادا جان نے سر پیٹ لیا۔ ایک دو برس تک یہی چکر چلتا رہا۔ کبھی گھر سے بستر کی چادر گم تو کبھی جوتے اور برتن گم۔ صوبے نے کہا کہ گھر سے ایک اچھا ریشم سے کڑھا ہوا ماں کا دوپٹہ لا دو تو میں تمہیں گدھے کی پیٹھ پر بٹھا کر سواری کرواؤں گا تو اسی وقت ماں اور بھائیوں سے چھپ چھپا کر ماں کا ریشمی دوپٹہ صوبے کو دے آیا۔ خان محمد نے کہا کہ دادا کی چھڑی کی ہرنوں والی موٹھ اٹھا لاؤ تو ایک دن وہ بھی گھر سے غائب۔ دادا جان نے جی توڑ کوشش کی لیکن دینو کچھ نہ سیکھ سکا۔ اوپر سے شرارتی لڑکوں کی پڑھائی ہوئی پٹی کو گھر آ کر یوں دہراتا کہ سبھی سر پیٹ کر رہ جاتے۔ بڑے بھائی اسے پیٹتے۔ ماں اور سے دھتکارتی۔ بیمار باپ کی چارپائی کے پاس تو کبھی وہ بھول کر بھی جانا پسند نہ کرتا۔ ایک دادا جان تھے جو اسے بیٹھک میں اپنے پاس بٹھا کر اس کی رال پونچھتے، گندی آنکھیں صاف کرتے، کپڑے بھی بدلتے اور چوری چھپے گڑ، مٹھائی اور جلیبیاں بھی کھانے کے لیے منگوا دیتے۔

دینو سے دینو جھلا مشہور ہونے میں تین چار برس لگے لیکن اس عرصے میں تو دادا جان کے گھر کی حالت خراب ہو گئی۔

وہ دس برس کا تھا جب پورے تیرہ سال کی لمبی علالت کے بعد، اسے ایک صبح بتایا گیا کہ اس کے ابا کی موت واقع ہو گئی ہے۔ جان محمد ایک رات روز کے معمول کی طرح دودھ کا ایک پیالہ پی کر سویا اور صبح نہ جاگا۔ جب چکی چلتی ہوئی دینو کی ماں دادا جان کے قدموں کی آواز قریب آنے سے پہلے اٹھ کر اپنے دائم المرض خاوند کی چارپائی کے پاس آئی تو اس نے سمجھا کہ گہری نیند میں سویا ہوا ہے لیکن جب ہاتھ ہلانے کے بعد بھی وہ نہ جاگا تو اس کا ماتھا ٹھنکا۔ تب اس کا ہاتھ چھوتے ہی وہ چیخ کر پیچھے ہٹ گئی۔ گھر میں ماتم شروع ہوا۔ لوگ اکٹھے ہوئے۔ دادا جان کا اکلوتا بیٹا تھا، اس لیے دور دور سے برادری اور قبیلے کے لوگ ماتم پرسی کے لیے آئے۔ دینو اور اس کے دونوں بھائی جنازے کے بعد سفید چادر پر بیٹھے لوگوں کے آنے جانے کا تماشہ دیکھتے رہے۔ پھر قبیلے کے رسم و رواج کے مطابق دستار بندی کی رسم ہوئی۔ دینو کے دونوں بھائیوں کو باپ کی ذمہ داریاں لینے پر انہیں پگڑیاں باندھی گئیں۔ جب دینو کی باری آئی تو وہ چیخ کر پرے ہٹ گیا۔ "میں نہیں باندھوں گا پگڑی وگڑی!" اس نے چیخ کر کہا۔

دادا جان نے "کوئی بات نہیں، مولوی صاحب! اگر اس کی دستار بندی نہ بھی ہوئی تو کوئی حرج نہیں ہے۔ ویسے ہی بے چارہ سیدھا سادا بچہ ہے" اور انہوں نے اس کی ماں کی طرف دیکھا جو عورتوں کے جھرمٹ میں گھری ہوئی بیٹھی تھی۔ آنسو تو ایک مدت سے ہی بہا رہی تھی لیکن اب رو رو کر اور سر پیٹ پیٹ کر اس نے اپنا برا حال کر لیا تھا۔

کسی بزرگ نے آہستہ سے کہا بھی "والد کی وفات کے بعد دستار بندی تو سب بیٹوں کی ہونی چاہیے!" لیکن جب دادا جان نے اس کی طرف گھور کر دیکھا تو وہ بھی خاموش ہو گیا۔

..................(۳).............

دین محمد سے دینو اور دینو سے دینو جھلا!

وقت گزرتا رہا۔ دینو میں کچھ تبدیلیاں رونما ہوتی گئیں۔ پہلے تو بچہ سمجھ کر اس کی نادانیوں اور اس کی نیم پاگل حرکتوں کو بھی برداشت کیا جاتا رہا تھا، لیکن ایک وقت ایسا بھی آیا جب کوئی غلط کام کرنے کے عوض میں یا کسی بڑے نقصان کے بعد دادا جان اسے کمرے میں بند کر کے خوب پیٹتے۔ بھوکا پیاسا رکھتے۔ بارہ برس کی عمر میں جب دادا جان نے اس کے لیے ماں کے کمرے سے دور آنگن میں ہٹ کر ایک نیا کمرہ بنوایا اور کہا کہ اب دینو اپنی ماں کے ساتھ ایک بستر پر تو کیا، ایک کمرے میں بھی نہیں سو سکے گا تو اس نے بغاوت کر دی۔ آدھی آدھی رات کو اٹھ کر ماں کے کمرے میں جانے لگا۔ دروازہ بند ہوتا تو زور زور سے پیٹتا اور جب تک ماں اسے دروازہ کھول کر اندر نہ آنے دیتی، وہ چیں

دروازے کی چوکھٹ کے پاس بیٹھا رہتا۔ کبھی کبھی وہیں زمین پر سو جاتا۔ دادا جان کا رویہ دیکھا تو ماں کی ممتا نے کروٹ لی۔ اب ماں اس کی ہر ضرورت کا خیال رکھنے لگی۔ لیکن دادا جان کی مرضی کے بغیر تو گھر میں ایک پتہ بھی نہیں ہل سکتا تھا۔ اس لئے جب ایک رات دادا جان کی آنکھ کھل گئی اور کڑاکے کی سردی میں انہوں نے دینو کو ماں کے کمرے کے دروازے پر کھڑا دیکھا تو اپنا جوتا اٹھا کر وہیں اسی وقت اس پر ٹوٹ پڑے۔ مارنے لگے۔ اس کی ماں دینو کے چیخنے اور جوتے کی چوٹوں کی آوازیں سن کر ہڑبڑا کر اٹھی اور باہر آئی۔ اس نے آگے بڑھ کر دادا جان کا ہاتھ پکڑ لیا تو دینو نے اپنی زندگی میں پہلی بار ماں کی غصے سے لرزتی ہوئی آواز سنی۔ ہمیشہ خاموش رہنے والی عورت نے جلتی ہوئی آنکھوں سے اپنے سسر کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ "کیا کر رہے ہو جی!؟ یہ بھی تو کسی کا بچہ ہے!"

دادا جان اسے چھوڑ کر چلے گئے لیکن وہ کافی دیر تک ماں کے سینے سے لپٹا ہوا سسکتا رہا تھا۔ اس کی ماں بھی روتی رہی تھی۔ اس واقعے کے بعد سے دادا جان سے مار تو نہ پڑی لیکن یہ اجازت بھی نہ ملی کہ وہ ماں کے کمرے میں سوئے۔

اس کے دونوں بھائی اب پانچویں جماعت پاس کر کے مڈل اسکول کے لیے تحصیل کے قصبے میں چلے گئے تھے۔ کبھی کبھی چھٹیوں میں آتے تو گھر میں رونق ہو جاتی۔ ان کے لیے کھیر حلوہ بنتا۔ مرغے کاٹے جاتے اور بڑا گوشت منگوایا جاتا۔ دینو کو بھی اس کا حصہ ملتا۔ لیکن اس کے دونوں بھائی اس سے کتراتے۔ اگر کبھی وہ ان کے پاس بیٹھنے کی کوشش بھی کرتا تو اسے دھکوں، لاتوں اور مکوں سے بھگا دیتے۔ لیکن جب اس نے انہیں خوش رکھنے کا ڈھنگ سیکھ لیا تو وہ اسے پیٹنے سے پرہیز کرنے لگے۔ وہ دادا جان کی صندوقچی سے دس پندرہ روپے اٹھا لاتا اور بڑے احترام کے ساتھ اپنے بڑے بھائیوں کو پیش کرتا۔ وہ روپے لے لیتے تو اسے شاباش دیتے لیکن اب اس بات کا کیا علاج کہ انہیں اس کے کپڑوں سے بدبو آتی۔ اس کی ناک کا بہنا اور اس پر مکھیوں کا بھنبھنانا تو ایک عام بات تھی۔ ابھی تک وہ اپنے کپڑے خود نہیں پہن سکتا تھا۔ سب سے بڑے بھائی محمد خان کی نسبت منجھلے بھائی سرور خان کا پیار اس سے کچھ کچھ ضرور تھا۔ وہ اکثر کہا کرتا۔

"کیا کریں ہم لوگ! آدھا انسان جو ٹھہرا۔ اس کا حساب کتاب تو ہم دونوں کو ہی ساری عمر رکھنا پڑے گا۔"

اور بڑا بھائی کہتا "تم رکھنا اس کا حساب کتاب! مجھے تو ایک آنکھ نہیں بھاتا۔ میرا بس چلے تو کنوئیں میں دھکیل دوں۔ زہر دے دوں اس کو!"

سرور خان مسکراتا "ہاں ضرور! ٹھیک کام میں دیر کس بات کی؟ دادا جان تمہیں جائیداد سے فارغ خطی دے دیں گے اور پھر میں اکیلا ہی رہوں گا لاکھوں کی جائیداد کا مالک اور وارث!"

دادا جان کی حالت بھی اب آہستہ آہستہ بگڑتی ہوتی جا رہی تھی۔ نئے قانون کے مطابق بہت سی زمینیں ان کے ہاتھوں سے نکل جا رہی تھیں۔ مزارعوں میں اب بھی اتنی ہی ساکھ تھی، سرکار دربار میں اتنی ہی عزت تھی، احترام تھا۔ خان بہادری قائم تھی لیکن مالی حالت کمزور ہو چکی تھی۔ ان کا مزاج بھی اب چڑچڑا رہنے لگا تھا۔ یوں بھی وہ اب ساٹھ کے پیٹے میں تھے۔ دادی کی موت ہوئے اب بائیس برس ہو چکے تھے۔ جان محمد زندہ ہوتا تو اب پینتیس برس کا ہوتا۔ گھر کا سب کام کاج سنبھال لیتا اور دادا جان مونڈھے پر بیٹھ کر حقہ گڑگڑاتے ہوئے مزارعوں اور کسانوں کا دبا رکھنے پر اکتفا کرتے۔ لیکن خدا کی مرضی یہ نہیں تھی۔ دونوں بڑے پوتے ایک دو برسوں میں اس قابل تو ہو ہی جاتے کہ وہ دادا جان کا ہاتھ بٹا سکیں مگر جو بات بیٹے کر سکتے ہیں پوتے کہاں کر سکتے ہیں۔

تبھی ایک دن ماں سخت بیمار پڑ گئی۔ دادا جان اس دن تحصیلدار کی کچہری میں کوئی تاریخ بھگتانے گاؤں سے چند میلوں دور قصبے میں گئے ہوئے تھے۔ وہیں پر انہیں خبر ملی۔ انہی کی گھوڑی پر سوار ذیلدار فضل خان انہیں یہ خبر پہنچانے گیا تھا۔ فضل خان انہیں کچہری میں ہی ایک طرف لے جا کر بولا "طبیعت بہت خراب ہے جی کوئی عورتوں والی بیماری لگ گئی ہے اور خون بہت آ رہا ہے۔ فوراً نائن اس کے پاس ہے آپ جلدی چلیں جی!"

دادا جان سب کام چھوڑ کر الٹے قدموں گھر لوٹ آئے۔ گھر میں سوائے دینو کے اور تھا ہی کون! حکیم جی اس دن شہر گئے ہوئے تھے۔ دادا جان نے خود ہی جو کچھ بھی بن پڑا کیا لیکن کچھ نہ بن سکا۔ رات پڑتے پڑتے دینو کی ماں کی موت ہو گئی۔ بچوں کی طرف آدمی دوڑایا گیا۔ وہ دوسری صبح جنازہ اٹھنے سے پہلے ہی پہنچ گئے۔ کہتے ہیں دادا جان رات بھر لاش کے سرہانے بیٹھ کر قرآن خوانی کرتے رہے۔ صبح جنازہ اٹھا اور کفن دفن کے بعد جب لوگ گھر لوٹے تو انہوں نے دیکھا کہ دینو کہیں نظر نہیں آ رہا تھا۔ ماں کے کمرے میں اسی کے بستر پر کمبل اوڑھے سو رہا ہے۔

.....................(۴)...............

دین محمد سے دینو اور دینو سے دینو جھلا!

اس کی داڑھی مونچھ اپنے دونوں بڑے بھائیوں سے پہلے پھوٹ پڑی تھی اور وہ اپنی بغلوں کے پسینے سے بھیگے ہوئے بال لوگوں کو دکھا دکھا کر خوش ہونے لگا تھا تو ایک دن دادا جان کو دینو کے بارے میں پہلی شکایت پہنچی جو حیران کن بھی تھی، افسوسناک بھی اور مضحکہ انگیز بھی۔ کریم خان نے آ کر دادا جان کو بتایا کہ اس کی بیوی جوہڑ پر کپڑے دھو رہی تھی کہ دینو پانی میں نہاتے ہوئے باہر نکل آیا اور سب بچوں کے سامنے جو وہاں کھیل رہے تھے، اس سے پوچھنے لگا "ماسی کیا تمہارا نکاح ہو چکا ہے؟" جب اس کی بیوی نے ڈانٹا تو اور بے شرمی سے کہنے لگا "نہیں ہوا تو میرے ساتھ کر لو! پھر ہم بچے پیدا کریں گے۔ بہت سارے بچے پیدا کریں گے۔ شادی ہو جائے تو بچے پیدا ہوتے ہیں نا؟" کریم خان کا خیال تھا کہ دینو صرف اوپر سے پاگل نظر آتا ہے اور اسے ان

سب باتوں کا علم ہے اور اب گاؤں کی بہو بیٹیوں کی عزت خطرے میں ہے لیکن دادا جان کا خیال تھا کہ یہ سب باتیں غلط ہیں۔ گاؤں کے شرارتی لڑکے اسے بہکاتے ہیں اور ایسی باتیں سکھاتے ہیں جو اس کی سمجھ سے باہر ہیں پھر بھی انہوں نے وعدہ کیا کہ وہ دینو کو سمجھائیں گے آئندہ وہ ایسی حرکت کبھی نہیں کرے گا لیکن ہوا یہ کہ ادھر دادا جان نے اس سے اس بارے میں پوچھا ادھر اس نے الٹا دادا جان پر ہی اپنے جسم میں رونما ہوتی تبدیلیوں کے بارے میں سوالات کی بوچھاڑ شروع کر دی۔ دادا جان کو خاموش ہو جانا پڑا۔

تب اس کے سب سے بڑے بھائی کی شادی ہوئی۔ گھر میں خوب رونق رہی۔ دور دور سے رشتہ دار آئے۔ ان میں بڑی بوڑھیاں بھی تھیں، جوان عورتیں بھی اور بچے بچیاں بھی۔ دینو کو تو جیسے منہ مانگی مراد مل گئی، وہ منہ کھولے کبھی کبھی رال ٹپکائے، زبان باہر نکالے، ناک میں انگلی دیے، بڑے بوڑھوں، اپنے ہم عمر، خورد، چھوٹے سب کے آگے پیچھے گھومتا رہا اور ان کی باتیں سنتا رہا۔ ایک بار جب اس کی ممانی نے ہنس کے کہا "بہنوں کی شادیاں تو اب ہو ہی گئی سمجھو لیکن اس پگلے کو اپنی لڑکی کون دے گا!" اور سبھی ہنس پڑے تو دادا جان نے سنجیدہ لہجے میں کہا "ایک یہی کیا کم ہے گھر بھر میں! ہمارا تو نصیب پھوٹ گیا ہے اس کی شادی کر دی تو پاگلوں کی فوج کھڑی ہو جائے گی..... مجھے تو فکر کھائے جا رہی ہے کہ میرے بعد اس کا کیا ہوگا! میں تو قبر میں پاؤں لٹکائے بیٹھا ہوں، آج نہیں تو کل، کل نہیں تو پرسوں!"

تبھی اس نے ٹھنک کر کہا تھا "ہم تو شادی کریں گے ممانی! سرور کے بعد تو ہماری ہی شادی ہوتی ہے..... ہاں، ہاں!"

"اسے کتنی سمجھ ہے اس بات کی!" اس کی ممانی نے پھر کہا تھا۔

"اسے پتہ ہے کہ بڑے کی شادی کے بعد منجھلے کی شادی ہوتی ہے اور پھر چھوٹے کی باری آتی ہے۔"

"اور اسے شادی کا کتنا شوق بھی ہے!" کسی اور نے رائے پیش کی۔

بڑے بھائی کی شادی ہو گئی۔ بہو گھر میں آ گئی۔ دینو کو گھیر گھار کر اس کے سامنے لایا گیا مگر وہ آنکھ نہ اٹھا سکا۔ شرم سے دوہرا ہونے لگا۔ اس کے گھٹنے جواب دے گئے اور وہ دھم سے وہیں بیٹھ گیا۔ پھر موقع ملتے ہی ہاتھ چھڑا کر بھاگ گیا اور اپنی کوٹھری کے اندر جا کر دروازہ بند کر لیا۔ شام کو جب اس نے دروازہ کھولا تو مہمان رخصت ہو رہے تھے۔ اس کے بارے میں لوگ بھول چکے تھے۔ وہ اکیلا پھرتا رہا، لیکن بھائی یا بھابھی کے سامنے نہ آیا۔ دوسرے دن سب کے پکارنے، بلانے پر دلہن کے قریب گیا بھی تو زمین کی طرف دیکھتا رہا۔ پھر چپکے سے ایک پیڑھی پر بیٹھ گیا۔ بھابھی نواڑی پلنگ پر سر نیوڑھائے بیٹھی تھی۔ اس کے پاؤں پر مہندی سے گل بوٹے بنے ہوئے تھے۔ وہ کچھ دیر انہیں دیکھتا رہا۔ پھر نہ جانے اسے کیا سوجھی، اس نے آگے بڑھ کر چارپائی سے سرکتے ہوئے بھابھی کے مہندی کے نقش و نگار سے سجے ہوئے دونوں پاؤں کو اپنے ہاتھوں میں تھام لیا۔ پہلے تو سب نے سمجھا کہ وہ بھابھی کے پاؤں چھو رہا ہے لیکن جب اس نے اپنے رال بھرے منہ سے انہیں چومنا شروع کر دیا تو بھابھی نے "ہوئی اللہ" کہہ کر پاؤں اوپر کھینچ لیے۔ اس کے بڑے بھائی نے ایک زور کا تھپڑ اس کے منہ پر رسید کیا۔ اور پھر لاتوں سے ایک دو ٹھوکریں بھی جما دیں۔ سبھی دیکھتے رہے۔ دینو نے تکلیف سے کراہتے ہوئے آنسو بھری آنکھوں سے بڑے بھائی کی طرف دیکھا۔ پھر اپنی چوٹوں کو سہلاتے ہوئے اٹھا اور آہستہ قدموں سے چلتا ہوا آنگن کے پار اپنی کوٹھری میں چلا گیا۔

اس دن کے بعد اسے اپنے بڑے بھائی اور بھابھی سے نفرت سی ہو گئی۔ وہ ہمیشہ کوشش کرتا کہ ان کے قریب نہ جائے۔ کبھی بھابھی باورچی خانے میں ہوتی تو پاس بھی نہ پھٹکتا۔ نوراں مائی، جو اس کی ماں کی وفات کے بعد اس کے لیے نوکرانی رکھی گئی تھی، اب اس کا خیال رکھتی تھی۔ وہی اس کے لیے لسی کا کٹورا، مسی روٹی اور مکھن لے کر اسے دے آتی۔ لیکن اگر بھابھی باورچی خانے میں نہ ہوتی تو وہ چپکے سے گھس جاتا اور جو اس کے دل میں آتا، کھا لیتا۔ دادا جان کا حکم تھا کہ اسے کھانے سے نہ روکا جائے۔ اور دادا جان کے حکم کو اب بھی گھر بھر میں کوئی نہیں ٹال سکتا تھا۔

پھر تین چار برسوں کے بعد اس کے منجھلے بھائی کی شادی بھی ہو گئی اور زینت ان کے گھر میں بہو بن کر آ گئی۔ گورا گورا ابھرا ابھرا چہرہ، سرخ سیبوں جیسے گال اور لمبے لمبے شانوں پر پڑے ہوئے ریشم کی باریک تاروں جیسے بال، ہاتھوں اور پاؤں پر مہندی کے نقش و نگار، بیر بہوٹی سی، سرخ ریشم سے کاڑھے ہوئے 'باغ' کپڑے میں لپٹی لپٹائی جیسے کوئی گڑیا ہو۔ اپنی نئی بھابھی کے آتے ہی دینو نے اپنا سب رکا ہوا دبا ہوا پیار اس پر نچھاور کر دیا۔ سرور خان خود بھی اچھی طبیعت کا مالک تھا اور اپنے پاگل بھائی کی بے وقوفانہ حرکتوں کو اکثر و بیشتر ہنس کر ٹال دیا کرتا تھا۔ اپنی بیوی کے آنے پر اس نے اسے بھی یہی کہا "بے چارے کا دماغ کمزور ہے۔ اب ماں نہیں ہے تو کون اس کا خیال رکھے۔"

زینت کی عمر دینو کے برابر ہی تھی لیکن اپنے میکے میں اس نے چھ چھوٹے بہن بھائیوں کو پالا پوسا تھا۔ اس کے پاس ممتا سے بھرپور دل تھا، جس کا کچھ حصہ دینو کو بھی ملا تو وہ اسی کا ہو کر رہ گیا۔ نوراں مائی کی ضرورت نہ دینو کو رہی اور نہ ہی دلہن کو۔ ہر کام میں دینو اس کا ہاتھ بٹانے لگا۔ حتیٰ کہ وہ سارے کام جو نوراں مائی کرتی تھی، اب دینو خود خوش اسلوبی اور صفائی سے کرنے لگا۔ وہ اس چابکدستی سے اپنی بھابھی کا سر گوندھتا، چوٹی بناتا کہ دیکھنے والے حیران رہ جاتے۔ زینت بھی وقت پر اسے چھاچھ روٹی دے دیا کرتی۔ اپنے میاں کے ساتھ بٹھا کر کھانا کھلاتی۔ کبھی کبھی پانی بھی گرم کر دیتی کہ وہ نہا دھو کر صاف ہو

جائے اس کے میلے کپڑے تو نوراں مائی آ کر دھو ہی جاتی تھی کبھی کبھار دھیا ہوا کر وہ خوب نہا دھو کر صاف کپڑے پہن کر بھابھی زینت کے پیچھے پلنگ پر ہی بیٹھ کر اس کے بالوں میں تیل چپڑ رہا ہوتا کہ اوپر سے دادا جان گھر میں وارد ہوتے۔ انہیں آتا دیکھ کر بھابھی نے جلدی سے سر پر کپڑا اور منہ پر گھونگھٹ کھینچ لیا۔ دادا جان کھنکارے۔ دینو کی طرف انہوں نے عجیب سی نظروں سے دیکھا، پھر کہا

"ہاں خوب خدمت کرا اپنی بھابھی جان کی! اسی کا ثمر ملے گا تجھے! یہ بھی تیرا اتنا خیال رکھتی ہے بیٹا تیری ماں رکھتی تھی۔ خدا اس کو کروٹ کروٹ جنت نصیب کرے۔ مجھ گنہگار کی دعا قبول ہو!"

ایک بار دادا جان باہر چلے گئے تو زینت نے کہا "دینو! تمہاری ماں بھی دادا جان کی اتنی خدمت کرتی تھی کہ سسر ہونے کے ناطے سے اور وہ بھی اس کا خیال رکھتے تھے لیکن تم تو میرے سسر نہیں ہو۔ دیور بھائی ہو نا؟"

اور پھر جب اس کی بھابھی کے ہاں بچہ ہوا تو بھی دادا جان زندہ تھے لیکن اب ان کی صحت جواب دے چکی تھی اور وہ اپنی بیٹھک میں موڑھے پر بیٹھے ہوئے کھانستے رہتے تھے کاروبار میں، زمینوں کے رہن بیع میں اور قرضوں کی وصولی میں اب بھی اسی طرح دلچسپی لیتے۔ محمد خان اور سرور خان کی کسی غلطی پر اب بھی اسی طرح تنبیہہ کرتے جیسے پہلے کرتے تھے۔ یہاں تک کہ ان کی بیویوں کو گھر کے اندر خبر ہو جاتی کہ آج ان کے خاوندوں کو دادا جان نے جھاڑ پلائی ہے۔

بھابھی کا بچہ ہوا۔ گول مٹول سا، چندھی چندھی آنکھوں والا۔ جونہی زچگی کا بندوبست ہوا، گڑ اور کھوپا ہر آئی اور نوراں مائی نے بچے کو دادا جان کے پاؤں پر ایک لمحے کے لیے رکھنے کے بجائے دینو کے ہاتھوں میں دیا، کہ دینو نے اسے چوما اور بھاگ کر اپنی کوٹھڑی میں لے گیا۔ دادا جان اور سرور خان گھبرا گئے لیکن پانچ منٹوں میں ہی دینو اسے واپس لے آیا۔ تو بچے کی پیشانی پر سوئی قلم اور سیاہی سے لکھا تھا "دین محمد" یہی ایک لفظ تھا جو اپنے اسکول کے دنوں میں وہ استاد سے لکھنا سیکھ سکا تھا۔

دادا جان ہنس پڑے "کہتا ہے یہ بچہ میرا ہے!"

"تم لے لو!" سرور خان نے ہنس کر کہا "دینو چاچا تو سب بچوں کا چاچا ہے؟" لیکن دینو نے کبھی بھول کر بھی بڑے بھائی کے بچوں سے پیار نہیں کیا تھا۔ اسے ان کی طرف دیکھنا تک اچھا نہیں لگتا تھا۔ اب زینت بھابھی کے بچے کو وہ سارا دن کندھے پر اٹھائے رکھتا، چومتا، پیار کرتا۔ اس کے پھول جیسے گالوں کے ساتھ اپنی کھردری داڑھی رگڑتا۔ اس کی ماں بچے کو نہلا دھلا کر صاف کپڑے پہنا کر آلوں میں کنگھی کر کے آنکھوں میں سرمہ ڈال کر دینو کو پکڑاتی وہ تھوڑی دیر میں اپنے گندے ہاتھوں، تھوک اور سیاہی کے نقش و نگار سے گندا کر ڈالتا۔ لیکن زینت فرشتہ خاتون تھی۔ وہ کبھی برا نہ مناتی۔

ایک دن وہ دادا جان کے پاس گیا۔ "دادا جان! مجھے ہزار روپے دو

گےنا؟"

دادا جان بھی کھانا کھولے بیٹھے تھے اور کوئی قرض مانگنے والا کسان زمین پر بیٹھا گڑگڑا رہا تھا انہیں اپنے خون سے بنے ہوئے اس گوشت پوست کے پتلے پر بہت ترس آیا۔ بولے "ایک ہزار روپے کیا میں تو تمہیں دو ہزار روپے بھی دے سکتا ہوں دینو لیکن اپنے مرنے کے بعد!"

"تو آپ مریں گے کب دادا جان؟" اس نے پوچھا تھا۔

گڑگڑاتا ہوا کسان چلنے لگا تو دادا جان نے اسے گھور کر دیکھا۔ وہ دینو کی ایسی باتوں کو اکثر سن کر نظر انداز کر دیا کرتے تھے۔ انہوں نے اس کے سنجیدہ چہرے کی طرف دیکھا اور پوچھا "لیکن تم اتنے روپوں کا کرو گے کیا؟"

"گھر والی منگواؤں گا نئی آرڈر سے!"

دادا جان نے پھر پوچھا تھا۔ "کس نے کہا ہے تم سے کہ گھر والی بھی آرڈر سے آ جاتی ہے؟"

"ڈاکیا بولے..." دینو نے جھجکتے ہوئے بتایا "ڈاکیا بولے کہا تھا کہ دادا جان کو نہیں بتانا نہیں تو مجھے نوکری سے نکلوا دیں گے..... آپ مجھے ہزار روپے دیں گے تو میں گھر والی منگواؤں گا"

پھر تو یہ جیسے ایک معمول ہو گیا۔ دینو چاچے کی بہو ولایت سے ہوائی جہاز کے ذریعے پارسل سے منگوائی جا رہی ہے۔ دینو جھلے کی بیوی پنڈی کیمپ سے بیرنگ لفافے میں آئی ہے اور ڈاکخانے میں پہنچی ہے کہ اس کا خاوند اسے آ کر لے جائے۔ دینو اب تو شادی کر ہی لے گا کہ دادا جان نے لڑکی کو پانچ ہزار روپے میں راولپنڈی کے ہسپتال سے منگوایا ہے جہاں وہ انہی دنوں پیدا ہوئی ہے۔ دینو اب گھر بسا کر بیٹھ ہی جائے گا آخر اس کا بھی تو حق ہے کہ بھائیوں کی طرح گھر بسائے۔ وہ یہ باتیں سن سن کے ہلکان ہو جاتا۔ ساری ساری رات اپنے بستر پر پڑے ہوئے اس تصور میں کاٹ دیتا کہ اس کی بیوی کیسی ہو گی، خد و خال کیسے ہوں گے، کانوں میں کانٹے پہنے گی یا بندے، گلے میں ہار ہو گا یا لاکٹ، جھومر پہنے گی یا نہیں۔ خوب مزا آئے گا۔ جب وہ دہی بلوئے گی تو چھاچھ کے بڑے گلاس میں مکھن کی ڈلی ڈال کر اسے دے گی۔ جب اس کا سر دکھے گا تو وہ اس کے سر میں تیل کی مالش کرے گی۔ اس کے کپڑے دھوئے گی۔ سر کی جوئیں نکالے گی۔ ہاتھ منہ دھلائے گی اور کبھی کبھی صابن مل کر گرم پانی سے نہلائے گی۔ جیسے اس کی ماں نہلاتی تھی اور..... اور کیا کرے گی وہ؟

اور اسے کچھ نہ سوجھتا۔ سوائے اس کے کہ بچے پیدا کرے گی۔ لیکن کیسے؟ جیسے زینت بھابھی کے بچے پیدا ہوئے ہیں۔ ہر سال ایک ننھا منا، گول مٹول، نرم نرم بچہ جو نوراں مائی اٹھا کر لاتی تھی۔ پہلے دادا جان کے پاؤں پر رکھتی اور پھر اسے تھما دیتی۔ وہ کتنا پیار کرتا تھا اور بچوں سے! بڑا تو اب چھ برس کا ہو چکا تھا۔ اس کے بعد ایک لڑکی تھی اور پھر دو لڑکے اور چھوٹے تو کئی

باتیں کرتے ہوئے ننھے منے کھلونے۔

"دینو نانا! دینو نانا!" بڑا کہتا۔

"دینو چاچا! دینو چاچا!" اس سے چھوٹی تتلاتی۔

چھوٹی تو بہت ہی اچھی لگتی تھی۔ ننھی منی گول مٹول سی۔ وہ اس کے گلے میں جھول جاتی۔ اس کی ناک پکڑ کر مروڑ دیتی۔ پھر تالی بجا بجا کر کہتی "آ... آ... دینو چاچے کی ناک ٹیڑھی!"

وہ اپنی ناک پونچھنے کے لیے کرتے کا دامن اوپر کھینچ لیتا۔ ابھی ناک کے پاس لے جانے بھی نہ پاتا کہ وہ اس کا ازار بند کھینچنے کے لیے ہاتھ بڑھاتی لیکن اب وہ اس کے بارے میں محتاط ہو چکا تھا۔ "سوئی پٹی.....ٹھہ گئی!" وہ کہتا "بے شرمی کی بات ہے تمہاری اماں سے کہہ دوں گا!"

لیکن وہ اسے اتنی اچھی لگتی تھی کہ فوراً بعد ہی سب کچھ بھول کر وہ اسے پھر گود میں اٹھا لیتا۔ "جانو میری بٹی ہے نا؟"

"ہاں ہوں!" وہ اس کی مونچھ کھینچتے ہوئے کہتی۔

اس کی رال ٹپک آتی لیکن وہ بچی کو چوم ہی لیتا۔ کرتے کے بازو سے اپنا گال پونچھتے ہوئے وہ کہتی۔ "چاچا گندا.... چاچا گندا!"

ہاں وہ سوچتا، اس کی گھر والی بھی بچے پیدا کرے گی۔ کیوں نہیں کرے گی؟ کیا محمد خان کے بچے نہیں ہیں؟ سرور خان کے نہیں ہیں؟ اس کی اپنی عمر کے سب لڑکوں کی شادیاں ہو چکی ہیں۔ کئی بچوں کے باپ بن چکے ہیں۔ جب وہ اس سے اس کی شادی کے بارے میں بات کرتے تو اسے بہت اچھا لگتا۔ اب اس کی باری جو تھی۔ سرور خان کے بعد اسی کی باری تھی۔ کیا نہیں تھی؟

لیکن ایک دن دادا جان وفات پا گئے۔

وہ گھوڑی پر سوار ہو کر ساتھ کے گاؤں کے مزارعوں سے اناج کی وصولی کے لیے گئے تھے واپس آ رہے تھے کہ سوکھا نالے کے کنارے بھربھری زمین میں گھوڑی کا پاؤں پھسلا اور وہ گر پڑے۔ بس گرتے ہی مر گئے۔ ساری رات ان کی لاش وہیں پڑی رہی۔ صبح کے وقت جب خبر گاؤں پہنچی تو دونوں بھائیوں نے سر پیٹ لیا۔ گاؤں کے لوگ جوق در جوق وہاں پہنچے۔ وہاں سے لاش کو گھر لایا گیا اور پھر دفنانے کے لیے قبرستان کی طرف۔ ماتم پرسی کے لیے تحصیل اور ضلع سے بڑے بڑے افسر پہنچے۔ ڈپٹی کمشنر نے خان بہادر کے پوتوں کو افسوس کا خط لکھا۔ گاؤں میں ماتمی جلسہ بھی ہوا جس میں دیگر لوگوں کے علاوہ تحصیلدار صاحب کے سارے عملے، گرداور، پٹواری اور محکمہ مال کے افسران نے شرکت کی۔ تھانے کا عملہ بھی حاضر تھا۔

کام کاج تو دونوں بھائی پہلے ہی سنبھال چکے تھے۔ حساب کتاب کے بارے میں انہیں بخوبی علم تھا۔ زمین، جائیداد، رہن، گروی، بیع، قرض، مقدموں اور ان سارے معاملات سے متعلقہ کاغذات ان کے پاس ہی تھے۔ پڑھے لکھے تھے اور منشی قائم دین کی مدد کے بغیر بھی سارے معاملات سمجھ سکتے تھے۔ اس لیے انہیں کوئی مشکل پیش نہ آئی۔ چالیسویں کے دن جب قبیلے کے سبھی لوگ اکٹھے ہوئے تو صوبیدار بحال خان نے اٹھ کر کہا "خان بہادر کے ڈیڑھ لاکھ روپے امانت کے طور پر میری معرفت سابق فوجیوں کی کوآپریٹو سوسائٹی کے بانڈ اکاؤنٹ میں جمع ہیں۔ اس روپے کے سود کے طور پر پندرہ سو روپے ماہانہ حیات دین محمد عرف دینو کو دیے جانے کی ذمہ داری میری ہے۔ خان بہادر کی وصیت کے مطابق اصل روپیہ ان کے دونوں بھائیوں کا ہے یعنی اس کی موت کی شکل میں یہ اصل روپیہ دونوں بھائیوں یا ان کی اولاد کا ہے۔" پھر انہوں نے وصیت کا تصدیق شدہ کاغذ پڑھ کر سب کو سنا دیا۔ دونوں بھائیوں نے خود اسے پڑھ کر دیکھا۔ پھر کاغذ صوبیدار صاحب کو واپس کرتے ہوئے سرور خان بولا "دادا جان کا فیصلہ کون رد کر سکتا ہے۔ وہ تو عظیم انسان تھے۔ انہیں سب کا خیال تھا لیکن دینو خود تو اکیلا رہنے کے قابل نہیں ہے۔ میرے خیال میں اسی سے پوچھ لینا چاہیے کہ وہ ہم دونوں میں سے کس کے پاس رہنا چاہتا ہے۔ اگر وہ اکیلا بھی رہنا چاہے تو یہ اس کی مرضی۔"

اس نے مڑ کر دیکھا جدھر دینو کھڑا تھا۔ اس نے سب کی توجہ اپنی طرف مڑتی پا کر بسورتی ہوئی آواز میں کہا "اب میری شادی کون کرے گا؟"

کچھ لوگ ہنسے، کچھ مسکرائے، کچھ ایک نے رنج اور افسردگی سے آہ کی۔ پھر ایک بڑے بوڑھے نے کہا "دینو تو پہلے شادی کے قابل تو ہو لے۔ پھر تیری شادی بھی ہو جائے گی! کمانے والا تو بن! پندرہ سو روپے تو ساری عمر کے لیے کافی نہیں ہوتے!"

......................(۵)................

دینو پگلے کی جورو تیری میری بھابھی!

دادا جان کی موت کے دس برس بعد بھی یہ آواز گاؤں کے گلی کوچوں میں رہ رہ کر گونج اٹھتی۔ چھ سات برس کے بچوں سے لے کر اپنی عمر کے آدمیوں تک بھی اسے چھیڑتے۔ اب وہ چالیس کے قریب ہو چکا تھا تو بھی شادی کرنے اور بچے پیدا کرنے کی حرص اسی طرح قائم تھی۔ سر کے بال جھڑ کر باریک ہو گئے تھے۔ کبھی کبھی ان میں جوئیں پڑ جاتیں تو وہ نائی کے گھر جا کر سر پر مشین پھروا کر بالوں سے ہی فارغ ہو جاتا۔ چہرے پر تازگی تو پہلے بھی نہیں تھی لیکن جو کچھ شروع میں نکھار آیا تھا وہ بھی اب کب کا ختم ہو چکا تھا۔ رال اب بھی بہتی تھی۔ ازار بند اب بھی کھل کھل جاتا تھا۔ اگر کوئی لڑکا شرارت سے کھینچ کر کھول دیتا تو باعث میں سخت تکلیف پیش آتی تھی۔ پاؤں ننگے رہنے سے مڑ تڑ گئے تھے۔ پتلی ٹانگوں پر رگیں ابھر آئی تھیں اور گھٹنے کے ذرا نیچے تو ان کا ایک گچھا سا نکل آیا تھا۔ میلا کرتا اور تنگ شلوار پہنے وہ اب بھی گاؤں کی گلیوں میں بے کار گھومتا تھا۔ داڑھی میں کافی بال سفید ہو چکے تھے۔ لیکن کبھی کبھی اپنے بڑے بھائی سرور خان کا وہم

جہندی جو ہر چڑا کر لگانے کی کوشش کرتا تا کہ سیاہ نظر آئیں اور کئی بار تو واقعی وہ داڑھی سیاہ کرنے میں کامیاب بھی ہو جاتا۔

لڑکے تو چھیڑتے ہی تھے۔ کبھی کبھار بوڑھے لوگ بھی ٹھٹھا مخول کرنے سے باز نہ آتے۔ میاں یار خان کہتا ”بھئی دینو، اب تم اپنے بھائی سے کیوں نہیں کہتے کہ وہ اپنی جورو کی شادی تم سے کر دے اور سے کافی برسوں تک بیوی بنا چکا ہے۔“ اس کے جواب میں تو اس کے پاس صرف ایک فقرہ تھا جو اس کی بھابھی نے اسے سکھلایا ہوا تھا کہ جب بھی کوئی یہ بات کہے تم یہ فقرہ بول دیا کرو۔ ”تم اپنے باپ سے کیوں نہیں کہتے کہ اپنی جورو کی شادی مجھ سے کر دے۔“

لیکن نشانہ چوک جاتا۔ میاں یار خان پھر کہتا ”ارے میرے ماں باپ کو تو جنت مکین ہوئے چالیس برس ہو چکے ہیں!“

عبدل کہتا ”شادی تو تیری کروا دیں دینو..... لیکن جب لڑکی والے تمہارے گھر میں بارات لے کر آئیں گے تو تم انہیں جہیز میں کیا دو گے؟“

وہ سوچ میں پڑ جاتا۔ سب چیزیں تو بڑے بھائی کی ہیں۔ اس کا کیا ہے؟ کچھ بھی تو نہیں ہے۔ وہ کیا دے سکتا ہے لڑکی والوں کو جہیز میں؟ پھر دادا جان کی وصیت تو ہے پندرہ سو روپیہ ہی تو ہیں!

ایک دن اس نے بھابھی سے پوچھ ہی لیا۔ ”زینت بھابھی! عبدل کہتا ہے لڑکی تو اس کی نظر میں ہے پر جب لڑکی والے بارات لے کر آئیں گے تو میں انہیں جہیز میں کیا دوں گا؟“

جانو، جو اب چودہ برس کی تھی، شادی کے بارے میں سب کچھ جانتی تھی، اچھل کر کہنے لگی ”دینو چاچا! تم تو کاٹھ کے الو ہو، کیا لڑکی والے بارات لے کر آتے ہیں یا لڑکے والے بارات لے کر جاتے ہیں؟“

”وہ تو ٹھیک ہے..... پر عبدل نے پوچھا تھا..... اس نے کہا۔

ایک بار کلیم نے رائے دی ”اب تیری بھتیجی جانو کی شادی ہو گی تو صاف کہہ دینا کہ بدلے میں تجھے اس کی ساس چاہئے۔ اگر دیں گے تو شادی ہو گی نہیں تو نہیں ہو گی!“

”تو کیا وہ مان جائیں گے؟“ وہ انتہائی سنجیدگی سے پوچھتا۔

”کیوں نہیں! تم کہہ کر دیکھنا تو سہی!“

وہ جھجکا۔ کہتا ”پہلے میں زینت بھابھی سے پوچھ لوں!“

”ہاں ہاں، بے شک! وہ اسے بڑا مولا دیتا، پوچھنے میں حرج ہی کیا ہے؟“ اور جب ایسی ہی کوئی بات پوچھنے پر صرف اس کی بھابھی نے بلکہ بھائی نے بھی اسے سخت برا بھلا کہا تھا تو اس نے ایک دن بیٹھ کر یہ تہیہ کیا کہ اب وہ ایسی کوئی بات ان سے نہیں پوچھے گا۔

لڑکوں میں فضلو، خانو، مقبول، شوکت اور کئی دوسرے ایسے تھے جو شرارت سوچتے اور اس مخلوق سے اس کے ساتھ عملی مذاق کرتے کہ بھی گاؤں والے ہنس ہنس کر لوٹ پوٹ ہو جاتے۔ خلدو نے ایک بار حد کر دی۔ وہ بج سجا کر نئے نئے کپڑے پہن کر اور گلی میں اسے اشارے سے اپنے پاس بلا کر رازدارانہ طریقے سے ایک طرف لے گیا ”تانا کسی سے نہیں..... “ وہ پھسپھسا کر بولا ”بڑی گہری بات ہے۔ وہ تمہارے کام کی ہے۔ ڈھوک کے میلے پر جو جٹیاں آتی ہیں وہ کچھ روپے لے کر ساتھ آنے کو اور بیوی بن کر رہنے کو تیار ہو جاتی ہیں۔ ایک تو میں خود اپنے لیے لینے کو چلا ہوں..... یہ دیکھو روپے..... “ اور اس نے جیب میں سے کچھ روپے اسے نکال کر دکھائے ”ساتھ لاؤں گا اور بڑے دھوم دھڑکے سے اس کے ساتھ شادی کر کے اسے گھر میں ڈال لوں گا۔“

دینو کی رال ٹپک آئی ”پر میرے پاس تو روپے نہیں ہیں!“ وہ بولا اور پر امید نظروں سے خلدو کانے کی طرف دیکھا۔

”ارے صرف ایک سو روپے کی ہی تو بات ہے..... بھابھی کی پوٹلی سے نکال لا اور عیش کر! موقع چوک گیا تو ساری عمر افسوس کرو گے۔ میں تمہارا ٹیلے پر انتظار کروں گا۔ جلدی آنا!“

اس نے ذرا سا سوچا اور پھر خلدو کے کان کے پاس منہ لے جا کر پوچھا۔

”بچے بھی پیدا کر سکے گی نا؟“

”ہاں ہاں، کیوں نہیں!“ اس نے کہا ”بچے پیدا نہیں کرے گی تو جائے گی کہاں!“

حرت نہیں کا تماشا دیکھتے ہوئے خلدو نے اس سے سو روپے کا نوٹ لے لیا اور بوری کے سائبان کے پیچھے گیا تو دینو آنے والی خوشی کے انتظار میں دھڑکتے ہوئے دل کے ساتھ انتظار کرنے لگا۔ جب شام ہو گئی اور میلہ اجڑنے لگا تو اس خیال سے کہ خلدو تی ٹولے کر گاؤں نہ چلا گیا ہو، وہ بھی واپس ہو لیا۔ گھر پہنچا تو زینت بھابھی نے گھر میں اودھم مچا رکھا تھا۔ اس نے جب یہ ساری بات بتائی تو اس کا بھائی خلدو کے گھر پہنچا، لیکن خلدو صاف مکر گیا، وہ تو میلے پر گیا ہی نہ تھا، وہ بولا ”دینو جھوٹ بکتا ہے، اس نے روپے کہیں اور گنوا دیے ہوں گے۔“

شوکت، جسے سب شوکو کہتے تھے، ایک ہی کائیاں تھا۔ ایک دن کہنے لگا ”ڈاصلیاں مسجد کے پچھواڑے ایک اچنبھے کی بات ہوئی ہے۔ کنواں کھودا جا رہا تھا کہ چھم چھم کرتی ہوئی پندرہ بیس لڑکیاں اندر سے نکل آئیں، بولیں کہ وہ آسمان کی حوریں ہیں اور دنیا میں آ کر پھنسے آئی ہیں۔ کوئی اچھے مرد مل جائیں تو ان سے شادی کر لیں!“

جانگھو جاٹگی نے کہا ”دینو تم کیوں نہیں چلے جاتے ڈاصلیاں؟“

”پر پر..... “ وہ بولا ”میرے ساتھ مان جائے گی کوئی شادی

کر لیے؟"

"کیوں نہیں؟" اس نے کہا "تم میں کیا کمی ہے؟"

وہ پھر کسی سوچ میں پڑ گیا۔ پھر رک رک کر اس نے پوچھ ہی لیا

"کیا وہ بھی بچے جنتی ہیں؟"

"ارے یہ بھی کوئی پوچھنے کی بات ہے!" سب نے بیک زبان ہو کر کہا "ہر عورت شادی کے بعد بچے پیدا کرتی ہے!"

اور دوسرے دن جب وہ پیدل چند میل چل کر ڈسلیاں پہنچا اور مسجد کے پچھواڑے گیا تو سب نے پاگل سمجھ کر یہ کہہ کر واپس بھیج دیا کہ جو حوریں کنوئیں سے برآمد ہوئی تھیں واپس چلی گئی ہیں۔

مٹی آرزار سے بنی ہوئی' بیرنگ لفافے میں آئی ہوئی بیوی! پارسل اور ریل سے آئی ہوئی بیوی' کنوئیں سے برآمد ہوئی بیوی..... یا میلے سے خرید کر لائی ہوئی بیوی!

کوئی بیوی' کیسی بھی بیوی' زینت بھابھی کی طرح گول گول چہرے اور بھرے بھرے گالوں والی بیوی..... اور بچے پیدا کرنے والی بیوی!

دینو جھلے کی جورو! تیری میری بھابھی!

جنت مکین خان بہادر اللہ داد خان صاحب کا ایک ہی نام لیوا دین محمد..... دینو جھلا!

اور میری دادی! تو جوانی میں ہی کیوں مر گئی!!

.....................(۶).................

جانو نے کہا "ہوں ہوں ہم نہیں کھیلتے۔ دینو چاچا تمہاری آنکھوں پر سے انگلیاں ہٹا کر تمہیں دکھا دیتا ہے کہ ہم کہیں پلنگ کے نیچے تو نہیں چھپے ہوئے ہیں!" اور وہ منہ پھلائے چارپائی کے پائنتی پر جا کر بیٹھ گئی۔ چودہ برس کی گول مٹول سی جانو اپنے بھائی بہنوں کے ساتھ "ٹکن ٹی" کھیلتے ہوئے ناراض ہو کر الگ بیٹھ گئی اور دینو چاچا کو اس پر بہت پیار آیا۔

"آجا میری مٹھی سی گڑیا۔ کھیل لے۔ لو میں اب نہیں دکھاؤں گا ان کو کہ تم کہاں چھپی ہو!"

"نہیں کھیلتی ہو تو نہ کھیلو!" ایک بچے نے کہا۔

"تم سے کٹی تم سے کٹی اور تم سے بھی کٹی!" جانو نے سب کے ساتھ کٹی کر دی۔ تب دینو نے بھی انگلی کے ناخن کو سامنے والے دانت کے نیچے پھنسا کر کٹکٹاتے ہوئے اپنی بھتیجی کے ساتھ کٹی کر دی۔ وہ چارپائی پر آلتی پالتی مارے بیٹھا تھا اور پکڑے جانے والے بچے کی آنکھیں بند کر کے انہیں کھلا رہا تھا۔ رانی' بے بی' گڈی اور پپو نے جب اپنی بڑی بہن جانو کے ساتھ کٹی کر دی تو وہ نتھنے پھلاتی' شوں شوں کرتی ہوئی' ہاتھوں سے شلوار کے پائنچے گھٹنوں تک اٹھائے پیچھے مڑ مڑ کر دیکھتی ہوئی اندر چلی گئی جہاں اس کی ماں کھڑی لیمپ جلا رہی تھی۔

"دو وقت مل رہے ہیں جانو تو اب بچوں کے ساتھ مت کھیل! اتنی بڑی ہو گئی ہے۔ اب اندر جا کر منے کو سلا!" اس کی ماں نے کہا۔

لیکن اندھیرا خوب گہرا پڑنے پر اور کھانا کھانے کے بعد جب دن بھر کے تھکے ہارے زینت اور سرور خان اندر سونے کے لیے چلے گئے تو شام کی گئی کو بلا کر بھی بچے طوفان کی طرح پھر دینو چاچا کے کمرے میں آ گھسے۔

"چاچا ٹکن ٹی.... ٹکن ٹی!" وہ سب چلا رہے تھے۔ "پہلی باری جانو کی!" جانو پھوں پھوں کرتی' نتھنے پھلاتی' شلوار کے پائنچے دونوں ہاتھوں سے اوپر اٹھائے اس کی چارپائی پر چڑھ کر بیٹھ گئی اور جوں ہی دینو نے اس کی آنکھیں بند کیں سب بچے بھاگ کر آنگن کے اندھیرے میں گھل مل گئے۔

"ٹک چھپ جانا! ٹکی کا دانا! راجہ کی بیٹی آئی ہے!" دینو نے زور سے کہا۔

"آجائے!" آنگن کے ایک کونے سے آواز آئی۔

"آجائے آجائے!" کی آوازیں ایک ساتھ آئیں۔

دینو نے اس کی آنکھیں کھول دیں۔ جانو نے جلدی جلدی آنکھیں جھپکیں۔ آنکھوں پر ہاتھوں کا دباؤ پڑنے سے اس کی آنکھوں کے سامنے سبز پیلے طوطے ناچ رہے تھے۔ اس نے اندھیرے میں آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دیکھا۔ پھر کہا "چاچا تم تو اتنے زور سے دباتے ہو کہ درد کر دیتے ہو...." پھر اس نے آہستہ سے پوچھا "پپو کہاں گیا' چاچا؟"

"ڈھونڈ لے جا کر!" اس نے کہا۔

"سونی ٹھیٹی! سونی لنگڑی سونی!" اس نے جواباً اس کے نام گنوائے۔

سونی لنگڑی کہنے سے جانو بہت چڑتی تھی اور جب سے اس کی منگنی ہوئی تھی اسے اس بات کا شدت سے احساس ہو چلا تھا کہ وہ دیگر بچوں سے بڑی ہے اور انہیں اس کا احترام کرنا چاہیئے۔

"سور بیا..... دینو جھلا مر گیا!" کہہ کر جانو سیدھی ایندھن کی لکڑیوں کی کوٹھری میں پہنچی اور وہاں چھپے ہوئے پپو کو نکال لائی۔

"پکڑا گیا..... پکڑا گیا!" اس نے کہا "چور پکڑا گیا!"

"ٹک چھپ جانا' ٹکی کا دانا' راجہ کا بیٹا آیا ہے"

"آجائے!"

"چاچا تا دا' اچھا ایک پپی لے لینا!"

وہ کان کے پاس منہ لے جا کر کہتا ہے "گڈو ڈیوڑھی میں سیڑھیوں کے پاس بڑے دروازے کے پیچھے گڑیا ہے"

"اچھا جان گئی! خسارہ نوں کھائی" اور وہ اپنا گال پپی دینے کے لئے آگے کر دیتی۔ جسے اپنی رال اور تھوک بھرے منہ سے دینو چوم لیتا، وہ اپنی چنری سے گال رگڑتی ہوئی چھڑانے کے لئے بھاگ جاتی۔ لیکن اگر دینو کہتا میں نہیں بتاتا دھوکا دینا تو گناہ ہوتا ہے"

"گناہ ہوتا ہے" وہ منہ چڑاتی نقل کرتی "جب گڑیا کو بتا دیتے ہو تو؟"

"دھوکا لے جا کر....." جانو نے زبان نکال کر اسے چڑایا "دینو جلا!"

"میری مرضی! اچھا کرتا ہوں" وہ غصے میں آ جاتا۔

"دینو جلا!"

"سوئی چھنی! سوئی لنگڑی سوئی!" وہ کہتا۔

"سوئی ہوگی تیری ساس!"

"تیری ساس"

"تیری ساس"

جھگڑا بڑھ جاتا اور کھیل بند ہو جاتا تو سب بچے اپنے اپنے پوشیدہ کونوں سے نکل کر باہر آ جاتے "بھئی کھیلتے کیوں نہیں؟ جانو تو ہر وقت لڑتی ہی رہتی ہے۔ لڑاکو کہیں کی!" اس سے چھوٹی گڑیا کہتی "چاچا! تم اسکے دولھے سے بولنا تک نہیں!"

دولھا کا نام آتے ہی جانو شرما جاتی۔ "چپ رہو گڑیا" کیا شرم نہیں آتی؟"

"مجھے کیوں شرم آئے!" گیارہ برس کی گڑیا کہتی "میں تو اس کا نام بھی لوں گی تو مجھے شرم نہیں آئے گی۔ میرا اچھا جو ٹھہرا!" اور وہ منہ بنا کر کہتی "شکیل خان، شکیل خان!"

جانو کا منہ سرخ ہو جاتا۔ وہ سیانی لڑکیوں کی طرح سر پہ چنری لپیٹ کر سرک کر چاچا کے قریب بیٹھ جاتی۔

"کھیل بند بھائی.... اب پہیلیاں بجھائیں گے!"

پہیلیوں کا نام آتے ہی پپو خوش ہو جاتا۔ "ہاں پہلے جانو کی باری!"

وہ نئی نئی پہیلیوں سے ان کا دماغ خراب کر دیتی۔ نہ جانے کہاں کہاں سے پڑھ کر آتی تھی۔ جب سب زچ ہو جاتے تو بتا بھی دیتی۔

"اب دینو چاچا کی باری!" سب ہی کہتے۔

"ہری ڈال سوکھی ڈال..."

ابھی وہ پہیلی پوری بھی نہ کر چکتا کہ سبھی کہتے "ہری مرچ!"

جانو کہتی "چاچا تم تو بڑے بدھو ہو۔ تمہیں کوئی اپنی لڑکی کیسے دے گا! روز ہی تو تم یہی بجھاتے ہو۔ سب کو آتی ہے یہ!"

.....................(۷)...............

"لک چھپ جانا، مکئی کا دانا، راجہ کی بیٹی آئی ہے"

"آ جائے"

راجہ کی بیٹی، جانو!

"تمہیں سہاگ کے گیت آتے ہیں گڑیا؟ آؤ گاؤ وہی جس میں بابل سے کہا جاتا ہے کہ بیٹی کو اجنبی لوگوں کے ساتھ پردیس میں مت بھیجو"

اور جب سب بچے بڑی بوڑھیوں کی نقل کرتے ہوئے آدھے دائرے میں بیٹھ کر گلا پھاڑ پھاڑ کر سہاگ گیت گاتے اور دینو بھی ان کے ساتھ مل جاتا تو تھک کے جا گھر کے اندر سے زینت طرارے ہی پکار کر کہتی "دینو اب بند کرو یہ شور شرابا! اذان کی صفید ہونے کو آئی ہے پو پھٹی ہے"

"بچپن میں بچہ ہے" گڑیا چاچا کو چڑاتے ہوئے کہتی "دینو جلا ہے!"

"تیرا چاچا ہے مرجانی! زندہ گئی لڑکی! اور تیرے دولھا کا چچا سسر لگا!"

"اور تیرے دولھے کا؟" گڑیا پوچھتی۔

جانو کی شادی میں صرف تین ماہ باقی رہ گئے۔ ابھی لڑکے کو شہر سے چھٹی نہیں ملی تھی۔ چھٹی اپریل میں ملے گی۔ اور ابھی تو جنوری کا مہینہ تھا۔ اس بات کا جانو کو بھی علم تھا۔ ایک رات جب سب بچے پیر خیرانی کی درگاہ کا مشعلوں والا جلوس دیکھنے کے لیے بھاگ کر گلی میں چلے گئے تو جانو نے پوچھا "چاچا تمہیں پتا ہے شادی کے بعد کیا ہوتا ہے؟"

"ہاں پتا ہے" دینو نے سینہ پھلا کر کہا "شادی کے بعد دولھا دلہن کو اپنے گھر لے جاتا ہے"

"اسے نہیں چاچا وہ تو مجھے بھی پتا ہے۔ مگر بتاؤ شادی کے بعد لڑکی کو کیا ہوتا ہے؟" جانو نے اپنی بڑی بڑی پلکیں جھپکا کر اپنی چنری کے پلے کو کس کر لپیٹتے ہوئے پوچھا "تم تو بدھو ہو۔ میری تو کوئی سکھی بھی نہیں۔ کس سے پوچھوں!"

دینو نے کچھ دیر سوچا پھر کہا "اچھا تو چپ رہ، پپی دوگی نا؟ کل تمہیں بتاؤں گا۔ مجھے سب پتا ہے" اور جب وہ سرک گئی تو دینو نے اس کے گول مٹول گالوں کو سہلایا۔ "سوئی لنگڑی سوئی! تم تو نری پری اپنی ماں ہو!" اس نے زینت بھابی کو اس کی بیٹی میں دیکھتے ہوئے کہا۔

آج جانو نے برا نہ مانا۔ "مجھے ڈر لگتا ہے چاچا!" وہ اور سرک گئی۔

دینو کو اس پر بہت پیار آیا۔ اس نے اسے اپنی گود میں لے کر پیار کیا اور پچکار کر کہا "اب جا چاچا کر سو جا، ڈرنے کی کوئی بات ہے؟ کوئی پیٹتا تو نہیں سسرال میں! اور پھر تیری تو ساس بھی نہیں ہے جو پیٹے گی!"

"تم تو بھلے ہو چاچا" اس نے کھینچ کر کہا "مجھے کیوں نہیں۔ مار پیٹ کا تو کوئی ڈر نہیں ہوتا۔ بس مجھے یہیں پتا کر دو لہا میرے ساتھ کیا...." اور وہ شرما گئی.... پھر سسک سسک کر رونے لگی۔ اس نے چاچا کے سینے میں اپنا منہ چھپا لیا۔

تبھی دینو کو کوئی بات یاد آ گئی۔ اس نے کہا "تیری ماں یہاں شادی کے بعد آئی تھی تو کیا ہوا تھا؟ بس بچے پیدا کرتی گئی.... آٹھ برس ایک بچہ..... ایک، دو، تین، چار، پانچ، چھ بچے! تمہیں وہاں کیا ہو سکتا ہے؟"

وہ روتے روتے ہنس پڑی "تم تو خود ہی بچے ہو چاچا! نرے پرے بھلے ہو!"

"سوئی منگڑی سوئی!" اس نے پیار سے کہا۔

وہ خلو کی ڈیوڑھی سے نکلا تو اس کی آنکھیں چمک رہی تھیں۔ خلو نے جو پٹی پڑھائی تھی وہ ابھی اس کے دماغ میں بنا نہ تھی۔ جن باتوں کا نقشہ کھینچ کر اس نے دکھایا تھا۔ انہیں ٹھیک ڈھنگ سے پوری تفصیل کے ساتھ وہ پہلے نہیں جانتا تھا لیکن اب انہیں خلو جیسے باتونی سے سن کر تو ایسے لگتا تھا جیسے وہ ان باتوں کو برسوں سے جانتا ہو بلکہ خود بھی ان تجربوں سے گزر چکا ہو۔ اس نے گلی کو پار کیا۔ مڑ کر دیکھا تو خلو اپنے دروازے کی اوٹ سے دیکھ رہا تھا۔

وہ مسکرایا۔

"خلو کوئی برا آدمی نہیں" اس نے سوچا۔ اب جتنی باتیں اس نے بتائی تھیں وہ شاید سرور خان بھی نہ جانتا ہو جو چھ بچوں کا باپ تھا اور جس کی شادی ہوئے سولہ برس ہو چکے تھے۔ اسے افسوس ہوا کہ یہ باتیں وہ پہلے سے کیوں نہیں جان پایا۔ اپنی بے نام خواہشات کو نام دینے کا شعور اس میں نہیں تھا وہ ان خواہشات کو سمجھنے کی کوشش بھی نہ کر پایا تھا۔ اور اب چالیس برس کی عمر میں اسے پتا چلا بھی تو کس سے؟ خلو کانے سے جسے وہ اپنا دشمن ہی سمجھتا رہا تھا۔ اور جو کئی بار اسے پہلے دھوکا دے چکا تھا۔

"لک چھپ جانا" "گلی کا دانا" "راجے کی بیٹی آئی ہے"

"آ جانے دو"

"تمہیں اب ڈر تو نہیں لگے گا جانو میری بیٹی؟"

"نہیں چاچا.... پر...."

"لک چھپ جانا" "گلی کا دانا" "راجے کی بیٹی آئی ہے"

"آ جانے دو"

"چاچا! تم تو کہتے ہو میرا دولہا بڑا اکھڑ جوان ہے، تم تو بوڑھے ہو چاچا؟"

"ہاں جانو!"

"چاچا! کیا میرے دولہا کو ان سب باتوں کا پتا ہوگا؟"

"ہاں جانو"

اپنی جگہوں سے نکل کر باہر آتے ہوئے بچے بولے "چاچا تم اب جانو کی آنکھیں چھوڑ دو ہماری تو ٹانگیں تھک گئیں.... نہیں تو کھیل ختم"

"لک چھپ جانا" "گلی کا دانا" "راجے کی بیٹی آئی ہے"

"آ جانے دو!" صرف ایک آواز۔ باقی سب بچے سونے کے لیے چلے گئے تھے۔

"صرف گڑیا رہ گئی ہے"

"چلو ختم کھیل ختم"

"ختم تو ختم سہی.... میں چلی سونے کو!" گڑیا بولی۔

"لک چھپ جانا" "گلی کا دانا" "راجے کی بیٹی آئی ہے"

"کوئی جواب نہیں"

"سب چلے گئے چاچا......"

"ہاں میری بیٹی!"

زینت بھابھی نے اندر سے آواز دی "جانو غضب خدا کا بارہ بجنے کو آئے۔ اب اندر آ کر سو جاؤ"

آدھ گھنٹے کے بعد زینت باہر نکلی تو دھک سے رہ گئی۔ "ارے غضب خدا کا! چاچے سے جڑ کر سو گئی! جوئیں چڑھ جائیں گی تجھے چڑیل!" اور وہ جانو کو نیند سے اٹھا کر کھینچتی ہوئی اندر لے گئی۔

چپ چاپ خاموشی.... دور سے چوکیدار کی آواز.... خبردار جاگتے رہو!

......................(۸)................

"نہیں!" زور سے دھاڑ کر سرور خان اچھل کھڑا ہوا "میں مار ڈالوں گا حرام زادے کو! اپنی بھتیجی کے ساتھ!"

"مار دو...." اس کی بیوی زینت نے برف کی سی سرد آواز میں کہا "تمہارا چاچا بھی ہے اور بھائی بھی.... اور اب.... اب اور بھی کچھ.... تم نے تو اپنے دادا جان سے کچھ بھی نہیں سیکھا۔ خاموش رہو اور بچی کی شادی ہو جانے دو! پھر کوئی بات ہوئی تو سنبھال لیں گے۔ اب چار دنوں کی ہی تو بات ہے..... شادی ہو جائے گی تو کسی کو کیا پتا چلے گا کہ کتنے دن۔"

سرور خان سر پکڑے ہوئے دکھ سے چارپائی پر بیٹھ گیا۔ پھر نہ جانے اس کے دل میں کیا آیا۔ وہ اٹھا اور دینو کی کوٹھڑی کے پاس گیا۔ دروازہ اندر سے بند تھا اس نے دروازے میں سے جھانک کر دیکھا۔

ننھے کے لیے کپڑے کی کترنیں لپیٹ لپیٹ کر جو گڈا دینو نے کئی دنوں کی محنت سے بنایا تھا وہ اس کی پیشانی پر کالے چاک سے صرف ایک لفظ لکھ رہا تھا..... یعنی اپنا نام............

تقدیر کے محرر

جمع و ترتیب و تدوین
شعیب حیدر زیدی

کرشن چندر (۱۹ اگست ۱۹۷۵ء)

تقریباً ۱۹۶۲ء میں آپ نے اپنی کتاب ''جینے کے لئے'' مجھے دی تھی۔ تب میں نے سرلا اور دیوتی سرن سے کہا تھا یہ نوجوان بہت خوب صورت لکھتا ہے۔ تم اس کی ہندی کی کتابیں ضرور پڑھو۔ اب آپ کی چاروں کتابیں مجھے مل گئی ہیں اور تم پالا ئے تم یہ ہے کہ جو اسے میں نے سرلا اور دیوتی سرن کو دی تھی اس پر غور کیوں نہیں کیا تا۔ ہندی بہت خوبصورت زبان ہے۔ اس میں محبت سے پیار کی بات تو ہو سکتی ہے لیکن نثر میں لکھی ہوئی کوئی کہانی پڑھتا ہے سے بس کا روگ نہیں ہے۔ پڑھتا ہوں تو آنکھوں پر بوجھ پڑتا ہے۔ شام سندر آپ کے چاہنے والوں میں سے ہے۔ کل اور پرسوں دو دن اس نے چھ کہانیاں پڑھ کر سنائیں۔ بیشتر یا دوں کی پڑھتے پڑھتے رونے لگا' کہنے لگا مرینہ در پرکاش نے ایک بار کہا تھا۔ لدھیانہ والا یہ ستیہ پال آنند اگر اردو میں لکھتا رہتا تو کرشن چندر کو پیچھے چھوڑ جاتا' کم بخت پروفیسر بن گیا اور اردو کو چھوڑ گیا۔ اب جب شام سندر نے یہ افسانے پڑھ کر سنائے تو محسوس ہوا کہ اکثر جھوٹ بولنے والا اور اکثر وبیشتر گالی بکنے والا مرینہ در پرکاش بھی کبھی کبھی سچ بول لیتا ہے۔''

جوگندر پال

ستیہ پال آنند ہونہ افسانے لکھا کرتے تھے اور شاید ہونہ افسانہ نگار ہی ہیں۔ اس لیے جب گزشتہ چند سال میں وہ اپنی تمام تر توجہ شاعری پر مرکوز کر کے اپنی اس نئی محبوبہ کے پیچھے لگ گئے تو کہانی پہلے تو بہت سٹپٹائی اور پھر ٹھنڈے دل سے حالات کا جائزہ لے کر آپ ہی آپ مسکراتے ہوئے اس نے اپنی ہی ٹھان لی۔ اس نے کیا کیا کہ دبے پاؤں اپنے ہرجائی کا پیچھا کرنے لگی اور موقع ملتے ہی اس کی شاعری میں کچھ ایسے رچ بس گئی کہ وہ اپنی دفت میں اس کے گلے میں بانہیں حمائل کرتے ہوئے تقریباً اسی پر اپنی جان چھڑکنے لگتا۔

''لہو بولتا ہے'' کی اسی خوبی نے مجھے بے اختیار اپنی طرف متوجہ کیا ہے کہ کہانی ہی ہر نظم میں فوری طور پر گھٹ گھٹ کر اپنی شعری اور معنی سے اپنا سر دھانپتی چلی جاتی ہے ایسی نظموں میں۔۔۔۔۔ جیسا کہ ستیہ پال آنند کے ہاں بھی نمایاں ہے۔ تجربے کی واردات اپنے معنی خصائص کے باعث جھٹ ہی اپنی شناخت قائم کر کے قاری کے دل میں گھر کر لیتی ہیں' جس پر اس کے فنی علاوہ وں کا تحرک لے آنند شعری تجربہ میں فطرتاً اور بڑی ہمدردانہ فہم سے لا رہے جاتا ہے۔

ڈاکٹر وزیر آغا

جدید اردو نظم میں ایک خاص بات یہ ہے کہ اس نے اپنے گھر درے کناروں کو سلامت رکھا ہے اور معنویت کو اوڑھ لینے سے ہمیشہ اجتناب کیا ہے۔ ایک لمحہ پر خود کو مرتکز کر کے اس نے نہ صرف انسان کے ''گومگو'' کے عالم اور ''ہونے نہ ہونے'' کے کرب کو پہچانا اور ''فیصلہ نہ کر سکنے'' کی بے بسی کا ادراک حاصل کیا ہے بلکہ اندر کے اس سدا بہار بچپن سے تعارف حاصل کیا ہے جو حیرت و استعجاب سے لیس موجودگی کو اس کے ننگے عالم میں دیکھنے پر مصر ہے۔ اندر کے ٹھہرے ہوئے لمحے پر خود کو مرتکز کرنے کے باعث جدید اردو نظم میں اس خود کلامی کا بھی آغاز ہوا ہے جو شاعری کی جان ہے۔ جدید اردو نظم باہر کے پیش پا افتادہ مسائل کی نشان دہی کرنے کے بجائے ایک لمحہ لمحہ ٹھٹھکتے اندر چھپے ہوئے جہان ''حق'' کو کھولنے پر زیادہ مائل ہے۔ اس لیے وہ عام وہ اور کھردرے محفوظ بھوت اس گہری وادی کے کنارے پر ایستادہ ہے جو اسے ''خودی'' سے نجات دلا کر دیکھنے پر مائل دکھتا ہے۔ ستیہ پال آنند کی نظموں میں یہ موجودی رویہ اپنی تمام تر گہرائی' شدت اور تنوع کے ساتھ اس طور سامنے آتا ہے کہ شاعر کے شعری امیج' حتیٰ کہ اس کی نظموں میں برتے جانے والے الفاظ بھی جیسے جاگ اٹھے ہوں۔ آزادی کا یہی ستیہ پال آنند کی نظموں میں زیریں فکری سطحوں کو متحرک کرنے کا باعث ہے۔ جدید اردو نظم کے کرداروں کو دیکھنے تر خود سے باہر نکل کر خود کا نظارہ کرنے کی جو روش اختیار کی ہے وہ اردو نظم کو ایک انوکھی قوت عطا کر رہی ہے۔ مجھے توقع ہے کہ ستیہ پال آنند کی نظموں میں یہ تازگی اور انفرادیت آخری دم تک قائم رہے گی۔

کنہیا لال کپور (۱۳ دسمبر ۱۹۲۲ء)

''کم بخت اردو میں اپنی کون سی بری تھی کہ تم ہندی سے پریم جتا بیٹھے۔ اچھی بھلی تھا' کہ تمہیں شربتی' ہندی مستی والی محبوبہ بھی تھی' عشق کے قابل تھی' ابھی ماشاءاللہ جوان تھی' اب تم مانو گے تو نہیں' کہوں کہ یہی بات تم نے اس دن موہن راکیش اور کلیشور کے سامنے کرشن بلدیو وید کے گھر میں بھی کہی تھی' لیکن اردو مرے گی نہیں' زبان کے طور پر ہمیشہ زندہ رہے گی۔ تم نے ''جینے کے لئے'' میں وہ افسانے شائع کیے تھے' وہ بھولے نہیں ہیں' تمہارے کون سون اور سیڈم ظلیس اور مسیح کا بھولا سائنس دان اور وہ افسانہ جو اختر رضوانی کو جدید مشق بنا کر لکھا تھا۔ یہ بھولنے والی چیزیں ہیں' اب بھی وقت ہے' اردو میں پھر سے لکھنا شروع کر دو تا کہ زندہ رہو اور بوقتِ ضرورت کام آئے۔۔۔۔۔۔''

اختر الایمان

ستیہ پال آنند کی نظمیں مجھے پسند ہیں کیونکہ یہ اسی خمیر سے اٹھی ہیں جو میری نظموں کا عنصر بھی ہے۔ ان کے مجموعوں میں اس بچے کے بارے میں نظمیں بھی ہیں جو اختر الایمان یا ستیہ پال آنند کے اندر چھپا ہوا ہے اور بار بار اپنے تو تلے لفظوں کی بازگشت میں شاعر سے مخاطب ہوتا ہے' جو عمر زادہ ہے' جو پاؤں کا باغی ہوتا ہے اور آج تک ناراض رہ کر اپنی مٹی میں دبائے پھرتا ہے۔ وہ نظمیں بھی ہیں جن میں خود احتسابی شاعر کا اعمال نامہ بنتی ہے اور پھر خود نوشت سرگزشت میں تبدیل ہوتی چلی جاتی ہے۔ وہ نظمیں بھی ہیں جن میں گوتم ساگری ہے اور مہاتما بدھ جیسے چپلے کشو آنند کے ساتھ بیٹھے گفتگو کرتے ہوئے ذات اور کائنات کی گرہیں کھولتے چلے جاتے ہیں۔ وہ نظمیں بھی ہیں جن میں مشرقی اور مغربی فلسفیوں اور اہل دانش کے اقوال کو شاعری کے فریم میں جڑ کر تصویر کی

طرح آویزاں کیا گیا ہے۔ وہ نظمیں بھی ہیں جو وقتی ذاتی اور تاثراتی نوعیت کی ہوتے ہوئے بھی اس سے اوپر اُٹھ کر پوری زندگی کا احاطہ کرتی ہیں۔ اور وہ نظمیں بھی ہیں جن میں زبان و بیان کا کھردرا پن کانٹوں کی سی چبھن اور لذت دیتا ہے۔ ان نظموں کے بارے میں میری رائے وہی ہے جو میرا جی نے میری "نارس" کی نظموں کے بارے میں دی تھی یعنی ان کو دیکھنے کے بعد ایک چلتی پھرتی بلکہ بعض اوقات بولتی ہوئی حیات ذہنی کا نقشہ ابھر آتا ہے۔ لیکن زبان و بیان کی سطح پر ان سب نظموں میں ایک قدر مشترک واضح طور پر ابھر کر سامنے آتی ہے۔ یہ نظمیں اس غزل کی لفظیات، استعارات اور زبان سے چپک جانے والی مٹھاس سے یکسر پاک ہیں۔ جس کی تفسیر یہ دی گئی تھی۔ "بازی کردن محبوب و حکایت کردن از جوانی و حدیث محبت و عشق زنان"۔ اور جو آج بھی نہ صرف شاعروں میں پڑھی جاتی ہے بلکہ شعراء اپنے مجموعوں کی زینت بناتے ہیں اور نقاد حضرات اس کے بارے میں مضامین لکھتے ہیں۔

خواجہ احمد عباس (۴ اپریل ۱۹۸۵ء)

آپ کے افسانے 'انسان دوستی' اخوت اور زندگی کی بہترین قدروں سے عبارت ہیں۔ "من بہادر" اور "گھڑ" کو پڑھ کر یوں محسوس ہوا جیسے یہ کردار ہماری روزمرہ کی زندگی کا جزو ہوتے ہوئے بھی ہماری آنکھوں سے پوشیدہ رہ جاتے ہیں اور ہم ان کا کرب 'ان کی زندگی کا درد اس لئے نہیں دیکھ کر وہ چپڑاسی یا چوکیدار ہونے کی وجہ سے ہمارے بہت قریب ہوتے ہیں۔ ہماری نظر دور بیں اور دوربین تو ہوتی ہے مگر قریب کی چیزوں کو دیکھنے کی عینک ہمارے پاس نہیں ہوتی...... میرا نہ کی سرکاری تقریب کے بعد آپ سے جو طویل تر ملاقات چندی گڑھ میں ہوئی برسوں گزرنے پر بھی اس کے نقوش دل پر باقی ہیں۔ 'سانپ اور سانپ' آپ ترتیب دے رہے ہیں۔ دیر آید درست آید۔ اُردو کا سرمایہ ہندی اور انگریزی لوٹ کر لے گئی وہ واپس بصورت سود ملنا چاہیے۔"

راجندر سنگھ بیدی (فروری ۱۹۷۰ء)

"اب رہی کہانیوں کی بات"..... میں تو آپ کی کہانیوں سے پوری طرح واقف نہیں تھا لیکن بلونت گارگی کو اپنی فکر زیادہ رہتی ہے اس لئے جب میں نے کہا تھا کہ لال بادشاہ جیسی کہانی پر ایک شارٹ فلم بنائی جا سکتی ہے جس میں بارش کا شور اور چھما چھم بارش میں سڑکوں پر ہوتے لاؤنے اور پودے لگانے کے بھرپور شارٹ ہوں تو بلونت کو اپنی کہانیوں کی بابت خیال آ گیا۔ اب آپ کی چنڈال چوکڑی والی کہانی کی ہی بات لیں۔ سنا ہے ٹی بی کی ایک کہانی 'کھیری' کا روڈ پر ایک شارٹ فلم بنی تھی جس میں چھ سات لطیفے کردار ہوتے ہیں۔ آپ کی یہ کہانی ایک شارٹ فلم کے لئے اتنی موزوں ہے کہ اگر اپنی مصروفیات سے وقت ملا اور ایک چاند مکلی بی کا پراجیکٹ وقت پر ختم ہو گیا تو میں خود کوشش کروں گا کہ اس کو ہاتھ ڈالوں۔ فیاض رعدی ایسے موضوع پایا کرتے تھے......"

ملک راج آنند (دسمبر ۱۹۸۵ء)

"شیڈوز بہت ٹون" کی کہانیاں اسی نامور افسانہ نگار کے قلم سے لکھی ہوئی ہیں جس نے اُردو اور ہندی میں بڑا نام پیدا کیا ہے' ملک اور بیرون ملک کے معتبر رسائل اور اخبارات میں چھپی یہ کہانیاں اب کتابی شکل میں ہمارے سامنے ہیں۔ ستیہ پال آنند کی خصوصیت یہ ہے کہ وہ واقعہ اور کردار دونوں کو ایک دوسرے سے منسلک کر کے کردار کو پہلے ہمارے سامنے رکھتا ہے اور پھر اُسے واقعے کے تانے بانے میں اُلجھا دیتا ہے۔ ایسا کرتے ہوئے وہ زندگی کی قیمتی قدروں کو ہاتھ سے نہیں جانے دیتا۔ مثال کے طور پر چیتر باؤری کی کہانی ہے جو ہم سب کے دیرینہ آنجہانی دوست ساحر لدھیانوی کا بچپن کا رفیق تھا۔ آنند نے اس کردار کو صرف ایک پلڑے میں تولا ہے۔ یعنی ساحر لدھیانوی کے ساتھ اس کی رفاقت کے پلڑے میں' جب کہ ساحر بمبئی آ کر اُسے بھول گیا۔ گورکھے چوکیدار کی کہانی "من بہادر" نہایت طاقتور کہانی ہے۔ اپنی شاٹ گن سے جانوروں کا شکار کرنے والا گورکھا' جو ایک گورے اور اپنی لڑکی دونوں کا قاتل بھی تھا اپنے والد کا قیمہ کر کے کتوں کو کھلانا چاہتا ہے لیکن اپنی ماں کے پیار کی وجہ سے اُسے معاف کر دیتا ہے... لہٰذا انگلش افسانوی ادب میں آنند کا داخلہ نیا نہیں ہے تو بھی میں یہ ضرور کہوں گا کہ وہ ایک نئی سمت منفرد آواز لے کر آیا ہے اور یہ آواز یورشی نسل کے ہم سب ہندوستانی ادیبوں کے جو انگریزی میں لکھتے ہیں' جانے کے بعد قوتوں تک زندہ رہے گی۔"

افتخار امام صدیقی (مدیر "شاعر" بمبئی)

آنند نے لفظوں سے تصویر سازی کی ہے۔ وہ فوٹو گرافر بھی ہیں اور مصور بھی۔ ان کے پیکر متحرک اور غیر متحرک دونوں صورتوں میں قاری اور سامع کو اس کی شخصیت میں اترنے اور دور بہت دور نکل لے جانے میں کامیاب رہتے ہیں۔ جن حساس منظروں کو شاعر نے اپنی نظموں میں خلق کیا ہے اس کی باز آفرینی کا عمل سامع اور قاری پر اس کے اپنے تجربات و مشاہدات نہ ہوتے ہوئے بھی اس کے اپنے معلوم ہوتے ہیں۔ منظروں کی تجسیم ادھوری نہیں۔ یہ نظمیں نہیں منظوم تخلیقی کہانیاں ہیں' خوب سیرت منظرنامے ہیں۔

بلراج کومل

ستیہ پال آنند کی نظمیں معنی و مفہوم کے معیار پر یا پھر شعری انسلاکات کا جہان صد رنگ آباد کرنے کے معیار پر بھی اسی تناسب میں زندہ و تابندہ ہیں۔ جس حد تک وہ طریق کار کے بعض پہلوؤں کے تعلق سے فنکارانہ تا زہ کاری کا ثبوت فراہم کرتی ہیں۔ ہر شاعر کے ہاں زندگی کے تجربات کا ایک ترجیحی دائرہ انتخاب ہوتا ہے اور اس کے تئیں ردعمل اور ترجیحی دائروں میں سفر کرنا ہے۔ انسانی زندگی کی عصری صورت حال اور اس کے تعلق سے فنکارانہ ردعمل اور اس کا اظہار..... ستیہ پال کی بہت سی اہم نظموں میں بطور محرک اور بطور نقطۂ تکمیل کارفرما ہیں۔ پہلی سطح پر ستیہ پال آنند تصویر کشی اور بیانیہ کی مدد سے ایک بصری منظرنامہ تیار کرتے ہیں۔ بعض اوقات معروضی انداز سے بعض اوقات ذہنی طور پر تخیل تماشائی کے انداز میں لیکن بہرحال یہ منظرنامہ محض منظرنامہ ہو کر

نہیں رہ جاتا۔ غزل سفر پر شاعری بصیرت اسے ایسی غیر جسمانی جہتیں عطا کر دیتی ہے جو کسی انداز میں مابعد الطبیعاتی نہ ہوتے ہوئے بھی متنوع معیاتی کیفیات کی تشکیل ثابت ہوتی ہیں۔

پچھلے کچھ برسوں میں جدید اردو نظم منتشر تجربات وتفصیلات میں گھر کر رہ گئی ہے نظم کی اساسی وحدت اور مربوط اکائی کی جانب بہت کم لوگوں نے توجہ دینے کی کوشش کی ہے۔ کچھ لوگ اپنے آپ کو دہرانے لگے ہیں۔ جب کہ دوسرے دوسری زبانوں کی اصناف سخن میں طبع آزمائی کے چکر میں پھنس گئے ہیں۔ ستیہ پال آنند کا طرۂ امتیاز یہ ہے کہ انہوں نے حشو وزوائد کو فراخدلانہ طریقے سے گریز کرتے ہوئے نظم کی اساسی وحدت اور مربوط اکائی پر نہ صرف اصرار کیا ہے بلکہ اپنی تخلیقات میں کلی طور پر ان شعری کاسن کے اقرار و اثبات کے شواہد بھی پیش کیے ہیں۔ استعارہ، تمیج، علامت، پیکر تو بہر حال شعری عمل کا ہمیشہ سے جزو لاینفک تھے لیکن بیانیہ، مکالمہ، آہنگ کی آمیزشوں اور لفظوں اور جملوں میں بظاہر خاموش لیکن تکلم وقفوں کا جس باز ہ کارانہ فنکاری سے ستیہ پال آنند نے استعمال کیا ہے وہ واقعتاً قابل داد ہے۔

جوہر میر

ستیہ پال آنند شاعری نہیں، اردو نظم کی ہیت اور افادیت کے بہت محرک سطح بھی ہیں۔ غزل کی تنگ دامنی پر انگشت نمائی بھی کرتے ہیں اور ترقی پسند تحریک کے مخالف بھی مانے جاتے ہیں۔ زوبیہ کے صفحات پر یہ بحث تفصیل کے ساتھ موجود ہے۔ ظاہر ہے اختلاف رائے کی گنجائش ہر بحث میں ہوتی ہے اس لئے جہاں غزل کے دفاع میں یہ کہا جا سکتا ہے کہ غزل کا دامن بہت کشادہ ہے، غزل کی ہیت اور افادیت کبھی کم نہیں ہوتی وہاں یہ بھی کہا جا سکتا ہے کہ ہندوستان پر نوآبادیاتی تسلط کے خلاف اس عہد کے عصری مزاحمتی تقاضوں کے مطابق ترقی پسند تحریک تاریخ کا ایک ایسا خوشگوار جبر تھی جس نے اردو شعر وادب کی کایا پلٹ کر رکھ دی تھی۔ یہ ترقی پسند تحریک ہی تھی جس نے جدید شعر وادب کی راہیں کھولی تھیں، تجربات اور موضوعات کی راہیں کھولی، نئے تجربات اور موضوعات کے راستے ہموار کیے تھے۔ حقیقت تو یہ ہے کہ ترقی پسند تحریک غالب اور غالب سے قبل نظیر اکبرآبادی کے عہد سے شروع ہو گئی تھی۔ اقبال نے غزل کی ہیئت میں موضوعاتی تجربے کر کے بہت پہلے جدید اور ترقی پسند لب ولہجہ متعین کر دیا تھا۔ شاعری میں ہیئتی اور موضوعاتی تجربات کو محض سیاسی نقطہ نظر سے مسترد کر دینا بہر حال ایک اختلافی معاملہ ہے۔ خوشی کی بات یہ ہے کہ ستیہ پال آنند کی شاعری میں غزل کے وجدان کے ساتھ ساتھ نظم کا وہ دبدبہ (طمطراق بازی نہیں) بھی موجود ہے جو اردو شاعری کے ارتقا کا حامل ہے۔

نصیر احمد ناصر

ہندآریائی کلاسیکی روایت میں برصغیر کی مختلف علاقائی زبانوں کے شعری "لوک ادب" کے ورثے میں، اور میلوں ٹھیلوں میں سوانگ، تماشا وغیرہ لوک ناٹک کی اصناف میں، انہی کرداروں کی رنگ منچ پر بار بار عکاسی سے یہ امر مکمل کر سامنے آتا ہے کہ "کتھا ساگر" میں بازیافت کرداروں کو عہد حاضر میں ایک بار پھر اپنا کردار نبھانے کے لئے معرض وجود میں لانا "ناٹک" اور "کاویہ" کی ایک ایسی روایت ہے، جو کئی ہزار سال بھی ہے اور تازہ بتازہ نو بہ نو بھی ہے۔ سنسکرت شعریات میں اسے ایک صفت "گن" مانا گیا ہے۔ ستیہ پال آنند نے اس روایت سے استفادہ کرتے ہوئے کئی کرداروں کی بازیافت کی ہے، جو ہندی، یونانی، رومن اور اطالوی اساطیری ادب، ڈرامے، ایپک (مہاکاویہ) یا لوک ادب، خصوصی طور پر قصص سے انہیں ملے ہیں۔

"آنند نے نظموں میں تصویر سازی کی ہے وہ فوٹو گرافر بھی ہیں اور مصور بھی۔ ان کے پیکر متحرک اور غیر متحرک دونوں صورتوں میں قاری اور سامع کو اس کی شخصیت میں اترنے اور دور، بہت دور تک لے جانے میں کامیاب رہتے ہیں۔ جن حساس منظروں کو شاعر نے اپنی نظموں میں خلق کیا ہے، ان کی بازآفرینی کا عمل سامع اور قاری پر، اس کے اپنے تجربات و مشاہدات نہ ہوتے ہوئے بھی اس کا اپنا محسوس ہوتا......

پروفیسر ریاض صدیقی

ستیہ پال آنند کی شاعری کو خود کلامی یا ایک لمحے یا ایک نقطے کے اندر چھپے ہوئے جہان معنی کو کھولنے تک محدود کرنا صحیح نہیں ہے۔ ایک لمحے یا نقطے کے اندر چھپے جہان معنی کو کھولنے کے معنی یہ نہیں کہ تخلیق کار پر جدیدیت یا مابعد الطبیعاتی حسیت یا پھر علامت نگاری کا اطلاق کر دیا جائے۔ ان کی ایک نظم "لوٹ جائیں" سے اندازہ ہوتا ہے کہ ڈبلیو ایچ آڈن W.H.Auden کی طرح انسانیت کو درپیش مسائل کے کسی ماورائی Beyond رشتے کو وہ تسلیم نہیں کرتے ہیں یہی وجہ ہے کہ ان نظموں پر فرار آمادہ نفسیات کی چھاپ نہیں ہے۔ اس سے یہ مراد بھی نہیں لینا چاہئے کہ وہ ترقی پسند یا اس کے حوالے سے نظریاتی قبیل کے شاعر ہیں۔ تاہم ان کی جدیدیت میں تعقل پسندی، خرد افروزی اور سماجی حقیقت نگاری کی کارفرمائی ہے۔ ان کی جدیدیت اردو میں رائج جدیدیت کے مقابلے میں اصل مغربی جدیدیت سے زیادہ قریب ہے یعنی فارم ساخت اور اسلوب کی جدیدیت ہے جیسا کہ بعد از جنگ اول برطانوی شاعری میں دکھائی دیتی ہے۔ جس نے امریکہ و فرانس کے اعلیٰ جدیدیت High Modernism کے تعمیری و تجرباتی کو دکھ دھندلکے کو ہمیشہ شک کی نگاہ سے دیکھا۔

احمد سہیل

مجھے ذاتی طور پر ان کے قریب رہ کر ان کے "گیان ساگر" سے مستفید ہونے کا موقع ملا ہے۔ جس شخص کے سونے کے بستر کے دونوں طرف ادب عالیہ کے بہترین نسخوں کے علاوہ بھگوت گیتا، مقدس انجیل، قرآن مجید، توریت، گرو گرنتھ صاحب اور جاتک کتھائیں جیسی کتابیں پڑی ہوں اور جو آدھی آدھی رات تک جاگ کر ان کا مطالعہ کرتا ہو اور نوٹس لیتا ہو وہ شخص یقیناً ماضی کو حال میں سمونے اور پھر دونوں کو مستقبل میں ضم کرنے کا اہل ہے۔

حمدِ باریٰ تعالیٰ

منظر ایوبی

جب تک کہ تو زباں کو نہ طاقت عطا کرے
بندے کی کیا مجال کسی کی ثنا کرے

مانندِ خوں رگوں میں مری موجزن ہے تُو
رہتا ہو تجھ سے دور وہ تیرا پتا کرے

تو کارساز بھی ہے رحیم و کریم بھی
تیرے علاوہ کس سے کوئی التجا کرے

تجھ کو خیال آئے نہ بخشش پہ تیری حرف
بندے کا حال یہ کہ خطا پر خطا کرے

آقائے خشک و تر ہے تو مختارِ بحر و بر
کیونکر نہ اس پہ فخر یہ ارض و سما کرے

اک بار جس کو دولتِ بیدار بخش دے
تاعمر وہ دراز نہ دستِ دعا کرے

اسباب روزگار نہ پیدا اگر
دنیا میں کون فرضِ محبت ادا کرے

1شعر درستیٔ قافیہ کے تحت "تُو" موزوں کی۔

نعتِ رسولِ مقبولؐ

غالب عرفان

ملتی نہ حشر میں بھی شفاعت رسول کی
ہوتی نہ جو نصیب قیادت رسول کی

معراج کی وہ شب کہ تھی نبیوں کو بھی نصیب
اللہ کے حضور امامت رسول کی!

نورِ ازل کا سلسلہ پھیلا تو تا ابد
پھیلی ہے کائنات میں رحمت رسول کی

خیرالبشرؐ کے روپ میں آیا کوئی کہاں
کب کس کو مل سکی بھلا سیرت رسول کی

تاریخ بن کے زندہ ہے تہذیب کے لئے
بے مثل و بے پناہ صداقت رسول کی

دشمن یہودیوں کو بھی تھا جس پہ اعتماد
تھی ایسی بے مثال دیانت رسول کی

دونوں جہاں میں صرف وہی کامیاب ہے
حاصل رہی ہو جس کو ہدایت رسول کی

عرفانؔ زندگی بھی میسر ہوا تو کیا؟
تحریر کر نہ پاؤں گا مدحت رسول کی

احمد فراز

دوست بھی ملتے ہیں محفل بھی جمی رہتی ہے
پھر بھی ہر شے میں کسی شے کی کمی رہتی ہے

اب کے جانے کا نہیں موسم گریہ شاید
مسکرائیں بھی تو آنکھوں میں نمی رہتی ہے

عشق عمروں کی مسافت ہے کسے کیا معلوم
کب تلک ہم سفری ہمقدمی رہتی ہے

کچھ دلوں میں نہیں کھلتے کبھی چاہت کے گلاب
کچھ جزیروں پہ سدا دھند جمی رہتی ہے

دور ہے ایک بھی ہو جائے تو اس کے باعث
دیر تک گردش حالات تھمی رہتی ہے

تم بھی پاگل ہو کہ اس شخص پہ مرتے ہو فرازؔ
ایک دنیا کی نظر جس پہ جمی رہتی ہے

شوکت واسطی

(رشید بٹ والا (میرے علاوہ) کی بحر میں)

ہر غزل اک یار طرحدار چاہئے
پھر جدت سعد و طرۂ طرار چاہئے

تاب نہیں جو عشق میں بے صبر بھی نہ ہوں
واضح تری طرف سے کچھ انکار چاہئے

ماضی کے ساتھ لازماً پیوستگی سہی
حسب زمانہ حال بھی درکار چاہئے

منطق ہے یہ بوقت خموشی خموش رہ
ہو جائے ناگزیر اگر اظہار چاہئے

تم ایک انقلاب کے نعرے پہ سرگراں
سو بار ہم کہیں گے یہ سو بار چاہئے

منزل پہ آن کر بھی جرس یہ دہائی دے
رخت سفر اے راہرو تیار چاہئے

شوکت عدو سے لاکھ بے پروا سہی کوئی
موقع پرست دوست سے ہشیار چاہئے

ظفر اقبال

چلتا ہوا رُکے ہوئے پانی میں آسماں
کیسا رواں ہے اپنی روانی میں آسماں

اس پر نہیں گزرتے ہوئے وقت کا اثر
ایسا ہی تھا یہ اپنی جوانی میں آسماں

اس نے سروں پہ ٹوٹ کے گرنا ہے ایک دن
آیا جو ایک بار گرانی میں آسماں

پتوں کی طرح جھڑتے ہیں تارے تمام رات
ٹھہرے گا کیا ہوائے خزانی میں آسماں

آواز دے رہے ہیں ستارے مجھے کہیں
جھلکا ہے میری ہستیِ فانی میں آسماں

ہے اک خلا کے بعد کوئی دوسرا خلا
رہتا ہے روز نقلِ مکانی میں آسماں

شکلیں بدلتا رہتا ہے رنگت کے ساتھ ساتھ
ہوتا ہے روز اور کہانی میں آسماں

کیسا مزا ہو کوئی جھٹک دے اسے اگر
اٹکا ہوا یہ زُلفِ زمانی میں آسماں

الفاظ کھینچتے ہیں زمیں کی طرف، ظفر
اوڑ پھیلتا ہے موجِ معانی میں آسماں

نامی انصاری (کانپور بھارت)

ہمارے شہر میں جب کچھ نہ تھا، اجالا تھا
پھر اس کے بعد کا منظر سبھی نے دیکھا تھا

قریب و دُور کہیں فصلِ آگہی نہ ملی
نظر کے سامنے بس اک سیاہ صحرا تھا

کسی کے لب پہ کوئی حرفِ احتجاج نہیں
جہاں میں اب وہی سب ہے، جسے نہ ہونا تھا

نہ کوئی سروِ تمنا، نہ کوئی نخلِ مراد
ہمارے نام فقط ماری کا چہرا تھا

ہمیں پسند نہ تھی غیر کی تنک بخشی
وگرنہ سامنے اپنے خزانہ پھیلا تھا

تمام عمر تعاقب میں جس کے گزری ہے
وہ زندگی تو نہ تھی، زندگی کا سایا تھا

ہمارا نام و نسب کون پوچھتا نامی
وہاں تو کرسی و عہدے کا رنگ چھایا تھا

سید مشکور حسین یاد

تجھ میں اے جانِ انا اتنی توانائی تو ہو
کچھ نہ ہو کم سے کم انسان کی رُسوائی تو ہو

نا منزل ہی نہیں سعیِ مسافر کا کمال
نارسائی میں مگر شوخیِ دانائی تو ہو

آئینہ سامنے رکھنا بھی تو آسان نہیں
کچھ سنورنے کے لئے ظرفِ شناسائی تو ہو

چلتے رہنا تو نہ چلنے سے کہیں بہتر ہے
فکر پیمائی نہ ہو بادیہ پیمائی تو ہو

خاکساری میں تو کہساری کی سب وسعتیں ہیں
خواہ ذرّہ ہی سہی صاحبِ پہنائی تو ہو

خود کو مٹی میں ملاتے ہو ملاؤ مشکور
خاک آرائی میں شانِ فلک آرائی تو ہو

ندا فاضلی

کوئی کسی سے خوش ہو اور وہ بھی بارہا ہو یہ بات تو غلط ہے
رشتہ لباس بن کر میلا نہیں ہوا ہو یہ بات تو غلط ہے

وہ چاند رہگذر کا ساتھی جو تھا سفر کا تھا معجزہ نظر کا
ہر بار کی نظر سے روشن وہ معجزہ ہو یہ بات تو غلط ہے

ہے بات اس کی سچی، لگتی ہے دل کو اچھی پھر بھی ہے تھوڑی کچی
جو اس کا حادثہ ہے میرا بھی تجربہ ہو یہ بات تو غلط ہے

دریا ہے بہتا پانی، ہر موج ہے روانی، رکتی نہیں کہانی
جتنا لکھا گیا ہے اُتنا ہی واقعہ ہو یہ بات تو غلط ہے

یہ یُگ ہے کاروباری ہر شے ہے اشتہاری راجہ ہو یا بھکاری
شہرت ہے جس کی جتنی اتنا ہی مرتبہ ہو یہ بات تو غلط ہے

سرور انبالوی

حضورِ دوست بھی اب التجا اچھی نہیں لگتی
ملے یوں خاک میں اپنی انا اچھی نہیں لگتی

مرا کمرہ معطر ہو تو جاتا ہے پر کیا کیجیے
دبی چوٹیں اُبھارے جو صبا اچھی نہیں لگتی

ہزاروں بچیوں کے سر پہ تار آئے ہیں چاندی کے
ترے ہاتھوں پہ ایسے میں حنا اچھی نہیں لگتی

نہ جانے کیوں پرندے اب کچھے رہتے ہیں بستی میں
نہ جانے کیوں پرندوں کی صدا اچھی نہیں لگتی

خدا معلوم کس آسیب کا سایہ ہے بستی پر
خدا معلوم کیوں گھر کی فضا اچھی نہیں لگتی

حیا اب برسرِ بازار بیٹھی بین کرتی ہے
کہ ماں کو بیٹیوں پر اب ردا اچھی نہیں لگتی

حفاظت کے لئے دیوار کا ہونا ضروری ہے
بڑھا دے جو دلوں کا فاصلہ اچھی نہیں لگتی

سرور انبالوی ہم تو برہنہ تن ہی اچھے ہیں
لہو کے جس پہ دھبے ہوں قبا اچھی نہیں لگتی

محشر زیدی

صبحِ اُمید کا تذکرہ چھیڑ کر، صبر کے تازیانے نہ مارو ہمیں
دل کو جس جا سکون و قرار آ سکے اُس چمن کا پتہ تو بتادو ہمیں

آنکھوں دیکھے مناظر تو ویسے نہیں جیسا ہم کو دلاتے رہے تم یقیں
ظاہری وضع تو اِک مقتل سی ہے تم کہاں لائے ہو غمگسارو ہمیں

انقلابات سے عہدہ بر آ ہو سکے پے بہ پے وحشتِ قربت کے صدمے سہے
سر بکف زندگی کے مسافر ہیں ہم خوب پہچان لو رہگزارو ہمیں

سچ ہے اے رہبرو یہ کسی نے کہا راس تم کو نہیں ہے مرا طورِ وفا
صرف دشنام یابی نہیں ہے سزا لا کے میدان میں سنگسارو ہمیں

بے سبب دوستی کی دہائی نہ دو جو حقیقت ہے بس وہ کہو دوستو
ہم غلامِ شہِ ذی حشم ہی تو ہیں بااذیت نہ کہہ کر پکارو ہمیں

کل تو یہ جرم بھی ہم سے سرزد ہوا جان کا ہم جیسوں کی سودا کیا
اپنا گھر اب تمہارے حوالے کریں آج یہ حکم دو شہریارو ہمیں

تم پہ قہر و غضب ٹوٹتا دیکھ کر بے ضمیری نے کچھ بھی نہ کرنے دیا
ہم تو اک جنسِ بے فیض ہیں دہر میں یاد رکھنا ہی کیا سوگوارو ہمیں

شاہد واسطی

یہ دل کی کیفیت کیا ہو رہی ہے
تمنا چپکے چپکے رو رہی ہے

بڑی ہے کام کی جھوٹی تسلی
ابھی تک گردِ غم کی دھو رہی ہے

کچھ ایسا پُرسکوں پاتا ہوں دل کو
کہ جیسے یاد اُس کی سو رہی ہے

ستارہ یاد کا جھوکا ہے ایسے
یہ کالی رات رخصت ہو رہی ہے

بہا لائی ہے ندی گدلا پانی
حسینہ کوئی کپڑے دھو رہی ہے

نہیں ہے کچھ تعلق غیر سے اب
کہا اس نے وہ میری ہو رہی ہے

زمانہ راکھ ہو جائے گا شاہدؔ
یہ دنیا آگ ایسی ہو رہی ہے

بھگوان داس اعجاز

دوستو کی بات لے
دشمنوں کو ساتھ لے

دل نہ اپنا ساتھ دے
کیا ہو کائنات لے

تیغ اپنے ساتھ لے
سب کو آڑے ہاتھ لے

چل رہا ہے قافلہ
گم شدہ لمحات لے

سج گیا چھکڑا کوئی
چل پڑا بارات لے

قاصدوں کے ہاتھ سے
ہجر کی سوغات لے

لے تو دنیا کی خبر
ہاتھ اخبارات لے

قدر کر انسان کی
ذات لے نہ پات لے

ہر بشر نورِ خدا
بس اُسی کی ذات لے

گھر بنا نیلام گھر
تنگیٔ حالات لے

آسماں ہے سنتری
اوٹ تو دن رات لے

گردشِ اعجاز دیکھ
دوست بیٹھا گھات لے

شبنم شکیل

اُس نے کب میری سنی ہیں غزلیں
رائیگاں ساری گئی ہیں غزلیں

خونِ دل صرف ہوا ہے میرا
دلہنوں جیسی سجی ہیں غزلیں

میں نے جو پھول چُنے لفظوں کے
ان کی خوشبو میں بسی ہیں غزلیں

مال و زر اس کے نصیبوں میں ہے سب
میری قسمت میں لکھی ہیں غزلیں

تذکرہ جن میں نہیں ہے اس کا
میں نے ایسی بھی کہی ہیں غزلیں

کچھ نہیں اور اثاثہ اپنا
حاصلِ عمر یہی ہیں غزلیں

ایک طوفان سا محفل میں اٹھا
میں نے یہ کیسی پڑھی ہیں غزلیں

ڈاکٹر سیفی سرونجی (سرونج بھارت)

قافلہ جاتا رہا بیٹھا رہا میں چھاؤں میں
اور میں کرتا بھی کیا چھالے بہت تھے پاؤں میں

شہر کی رنگینیوں میں کیا رکھا ہے آجکل
دوستو آؤ چلیں ڈھونڈیں سکوں صحراؤں میں

میں نے مانا ہے سہانا اور حسیں موسم مگر
تو نہیں تو دلربا پھر کیا مزا ہے گاؤں میں

جن کو میرے نام سے نفرت بہت تھی کل تلک
آجکل شامل ہیں وہ میرے کرم فرماؤں میں

گردشیں ہی گردشیں ہیں ٹھوکریں ہی ٹھوکریں
صاف لکھا ہے یہی اب ہاتھ کی ریکھاؤں میں

ایک دن وہ آئیں گے خود حال سیفی دیکھنے
عمر ساری کاٹ دی ہم نے یونہی آشاؤں میں

ڈاکٹر پنہاں

تتلیاں آزاد ہیں
آندھیاں آزاد ہیں

قیدِ گردش میں زمیں
آسماں آزاد ہیں

گر پڑیں چاہیں جہاں
بجلیاں آزاد ہیں

جو ستم چاہیں کریں
مہرباں آزاد ہیں

جی میں جو آئے کہیں
ہم زباں آزاد ہیں

وہم آزادی ہمیں
ہم کہاں آزاد ہیں

حلقۂ زنجیر تک
جسم و جاں آزاد ہیں

فکرِ پنہاںؔ کے طیور
پر فشاں آزاد ہیں

قیصر نجفی

زندگی کا نصاب لکھتا رہا
زخم کو میں گلاب لکھتا رہا

ایک ایسا بھی خط ملا جس کو
عمر بھر میں جواب لکھتا رہا

رزق تو تھا نپا تُلا یارب
میں اسے بے حساب لکھتا رہا

کتنے کم ظرف تھے یہ مت پوچھو
جن کو عزت مآب لکھتا رہا

ایک بے مہر کی رفاقت تھی
خود کو زیرِ عتاب لکھتا رہا

جانے چہرہ وہ کس کا تھا قیصرؔ
میں جسے آفتاب لکھتا رہا

غالب عرفان

کوئی مجھ سے کچھ دور سفر میں رہتا ہے
اک شاعر کا شعور سفر میں رہتا ہے

آنکھوں میں سچائی کا منظر لے کر
تازہ دم منصور سفر میں رہتا ہے

زندہ آج کلیم نہیں کوئی ورنہ
روشن جلوۂ طور سفر میں رہتا ہے

تہذیبیں، تاریخ جہاں چاہیں موڑیں
ازل کا اک دستور سفر میں رہتا ہے

اپنی مٹی کو سونا کرنے کے لئے
محنت کش مزدور سفر میں رہتا ہے

عہد بہ عہد حقوق بدلتے جاتے ہیں
فرض کا اک منشور سفر میں رہتا ہے

فکر و نظر کی منزل کچھ ہو لیکن دل
جذبوں سے معمور سفر میں رہتا ہے

خود پہ اوڑھ کے موسم کی ہر تبدیلی
ایک ہجوم طیور سفر میں رہتا ہے

تنہائی کی راہ میں عنبرؔ عرفاںؔ تک
شعر کا لطف و سرور سفر میں رہتا ہے

پروفیسر صدیق شاہد

شعلہ دیکھوں تو شرر لگتا ہے
دیکھوں دیوار تو در لگتا ہے!

جا بسے سبز جزیروں میں طیور
کتنا ویران شجر لگتا ہے!

طبع میں جاگ اٹھی بے تابی
نئے امکاں کا گزر لگتا ہے

ایک مدت سے ورذِ دل کو
نامرادی کا ثمر لگتا ہے!

ایک دوگام ہوس کی منزل
عشق صدیوں کا سفر لگتا ہے

دخلِ آسیب ہوا ہے جب سے
گھر تو اپنا ہے پہ ڈر لگتا ہے!

سر جھکانے کی بھی حد ہے کوئی
اب تو دہلیز کو سر لگتا ہے!

ہے ذرا سعیِ تقرب درکار
اب بھی سرخاب کا پَر لگتا ہے

شعرِ تر ہے وہی شاہدؔ جس میں
تول کر حرفِ ہنر لگتا ہے!

خیال آفاقی

نہ حرف و صوت، نہ صورت نہ بزم آرائی
کہ اہلِ دل کے لئے زندگی ہے تنہائی

میں آپ اپنا عصا ہوں رہِ محبت میں
مجھے خیالِ تجلی نہ عذرِ بینائی

متاعِ ہوش کہ جس کو ہوس نے لوٹ لیا
نہ میرے کام کی نکلی نہ تیرے کام آئی

بھٹک کے دیکھے کوئی بے خودی کے صحرا میں
مزہ کچھ اور ہی دیتی ہے آبلہ پائی

بہارِ گلشنِ ہستی بھی اِک لطیفہ ہے
میں جب بھی رویا اسے دیکھ کر ہنسی آئی

ابھی نہیں ہے مری چشمِ تر شرر افشاں
اے مشتِ خاک نہ کر عزمِ بادِ پیمائی

تری نگاہ نیا درد دے گئی مجھ کو
مجھے تو راس نہ آئی تری مسیحائی

ہے تیرے ہاتھ میں پتھر تو سوچتا کیا
مجھے نواز کہ میں بھی ہوں تیرا سودائی

خیال آہِ جگر سوز کا نظارا کر
نہ دیکھ عالمِ بالا سے کیا خبر لائی

سہیلؔ غازی پوری

روکا تھا' مت سوالِ یقیں درمیاں اُٹھا
نادیر اب خسارۂ وہم و گماں اُٹھا

مجھ کو تو کانوں کان خبر تک نہ ہو سکی
سُنتا ہوں رات شورِ قیامت یہاں اُٹھا

پتّے تو اُڑ گئے ہیں ہواؤں کے دوش پر
کاٹے ہوئے درختوں کی اب لکڑیاں اُٹھا

تجھ سے تو کوئی شے بھی نہ شیشے کی بن سکی
تُو بے ہنر ہے تہمتِ شیشہ گراں اُٹھا

آتے نہیں جب اُس کے سلام و پیام تک
اک ہجر کی فصیل بھی اب درمیاں اُٹھا

کہنے کی بات اور ہے کرنے کی بات اور
اُٹھ جائے جب زمین تو پھر آسماں اُٹھا

مانا کہ شہرِ عشق میں رُسوا ہوئے سہیلؔ
طوفان جیسے اُٹھنا تھا ویسے کہاں اُٹھا

غفار بابر

دِل پہ کیا بیتے گی یہ ہم پر کھلے
اِک ذرا سی دیر کو پیہر کھلے

اُس گلی سے جب میں گزرا دوستو!
پاؤں کی آہٹ پہ کِتنے در کھلے

دیکھ کر زُلفِ پریشاں آپ کی
راز کِتنے آپ کے ہم پر کھلے

اپنی نظروں میں وہ خود انمول ہیں
چھوڑ جاتے ہیں جو اپنے گھر کھلے

کتنے موتی ہیں نگاہِ یار میں
ہاں مگر پہلے وہ چشمِ تر کھلے

پوچھنے اُس سے کہ آزادی ہے کیا
اُڑ رہا ہے جو پرندہ "پَر کھلے"

اُس بُتِ کافر نے جب اُلٹی نقاب
حُسنِ فطرت کے کئی منظر کھلے

وہ ٹھہر سکتے ہیں اتنی دیر کب
جب تلک "غالب" ترا بستر کھلے

سر کھلے دیکھا جو اُس کو بام پر
دیکھنے والوں کے بابرؔ "سر کھلے"

سلطان صبروانی

آ آ کے لہر ساحلِ غم تک پلٹ گئی
دریا کی ساری عمر روانی میں کٹ گئی

کیا گنتا میں ستارے کہ خالی تھا آسماں
لیکن اِسی بہانے مری رات کٹ گئی

کیا جانے اُن میں کون سی تصویرِ درد تھی
آ آ کے نیند آنکھوں کے دَر سے پلٹ گئی

زیرِ مطالعہ تھی مرے بھی کتابِ عمر
کیا بھید تھا ہوا کئی صفحے الٹ گئی

اک نُور میرے دل میں اُترتا چلا گیا
ظلمت زمانے بھر کی نگاہوں سے ہٹ گئی

صحرائے درد میں کئی شیریں سُخن بھی ہیں
لہجے میں جن کے پیار کی خوشبو سمٹ گئی

سُورج کا تاج پہنے چلا ہوں تمام عُمر
چھاؤں نہیں تو کیا مری توقیر گھٹ گئی

کردار اپنا مجھکو سمجھ میں نہ آ سکا
اے صبرؔ عمر کیسی کہانی میں کٹ گئی

ذکیہ غزل

وہ جنکو خوب تھا اپنے ہنر کا اندازہ
ہے اپنی مات کی ان کو خبر کا اندازہ

نہ ہو فریق کوئی سامنے تو ہو کیسے
کسی حریف کو اپنے ہنر کا اندازہ

انہیں ہے زعم کہ ہم کو اسیر کر دیں گے
مگر غلط ہے کسی بے خبر کا اندازہ

ہمیں ڈرائے گا کیسے سفر سمندر کا
کہ ہم تو کر بھی چکے ہیں بھنور کا اندازہ

وہ جن کو خوف ہے منزل سے دور ہونے کا
ستارہ دیکھ کے کر لیں سفر کا اندازہ

عیاں ہے جان کا نسب ان کی گفتگو سے ہی
ہمیں کہاں تھا غزل ان کے شر کا اندازہ

پروفیسر زُبیر کُنجاہی

عِلم کی باتوں سے بارآور دِل کا شعرستان ہُوا
بانٹ دیا جب سب کُچھ مَیں نے اَور فزوں سامان ہُوا

اچھی سچّی باتیں کرنا سیکھا مُخلص لوگوں سے
جو کُچھ چاہا پایا مَیں نے پورا ہر ارمان ہُوا

وقتِ سفر جب غسل دیا مُجھ کو بجتاور لوگوں نے
وہ مری پہچان بنے اَور مَیں اُن کی پہچان ہُوا

عشق سمندر میں جب ڈوبا بھول گیا سب اپنی اُڑان
دِل کا پنچھی قید میں آ کر کیوں اتنا حیران ہُوا

مَیں نے پیار محبت کو تو ایک عبادت جانا تھا
مَیں ہی پیار کی سولی چڑھ کر یاروں پر قُربان ہُوا

آج کی شاہی اَور سُلطانی ہیچ ہیں میری نظروں میں
عشق کی دولت جِس نے پائی وقت کا وہ سُلطان ہُوا

سرمَدؔ اَور منصور نے چوما دار پہ چڑھ کر سولی کو
دُنیا کے عشّاق پہ اُن کا ایک بڑا احسان ہُوا

پیچھے رہ جائے گی ہر اِک خوبی اتنا یاد رکھو
اجر ملے گا اُس کو اچھا، جو اچھا اِنسان ہُوا

یار زُبیرؔ جو پتھر تھا وہ سطحِ زمیں تک پتھر تھا
وقت سمندر میں جب پہنچا گوہر اور مرجان ہُوا

رب نواز مائل

جہاں بھی فن سے یہ ٹھہرا کہاں میں
وہاں پھر آپ تھا اپنا سماں میں

بشکلِ خُوش کہ ہُوں مطلوب ہے تُو
تُجھے اے زندگی ڈھونڈوں کہاں میں

سنو وہ دُنیا میں نادِل ہیں کہ جس سے
یہ کیسے شوق کا ہوں ہم عناں میں

اسے دیکھا کہاں ہے تھوڑا بھی تو
سو دیکھوں گا ابھی اپنا جہاں میں

جسے خالی اجَل بھی کر سکے کیا
خیالِ یار کا ہوں وہ مکاں میں

وہ جیسا خُوش نوا ہے بولنے میں
اُسے دوں بولنے کو اور زباں میں

اسلم راہی

تنہا ہے مری شامِ سفر تُو بھی نہیں ہے
جنگل ہیں گھنے راہ میں جگنو بھی نہیں ہے

جی چاہے ہے جی کھول کے رولوں تجھے لیکن
رونے کے لیے آنکھ میں آنسو بھی نہیں ہے

کچھ ایسا یہاں کال پڑا کچے گھڑوں کا
کہتے ہیں کسی کا کوئی محبو بھی نہیں ہے

بُلبُل کو کہا کرتے تھے پھولوں کا پیامی
اب اُس کی صداؤں میں وہ جادو بھی نہیں ہے

ہم قصۂ آشفتہ سری کس کو سنائیں
غمخوار زمانہ بھی نہیں تُو بھی نہیں ہے

سیماب طبیعت جو اِدھر میں ہوں اُدھر وہ
پہلے کی طرح دل کسی پہلو بھی نہیں ہے

تھا جشن بہاروں کا ترے دم سے مگر اب
وہ رنگِ چمن اور وہ خوشبو بھی نہیں ہے

جائیں تو کہاں جائیں تھکن اوڑھ کے راہی
اِس وادیٔ صحرا میں کہیں لُو بھی نہیں ہے

شگفتہ نازلی

رہوں میں ناؤ میں، ساحل پہ شام کرتی ہوں
میں انتساب سمندر کے نام کرتی ہوں

ہوا ہوا کی اُڑا لے دلوں سے گرد و غبار
اِک ایسی شام کا ہی اہتمام کرتی ہوں

رہے نہ کوئی مسافر اکیلا ساحل پہ
اُسی کے پار اُترنے کا کام کرتی ہوں

جو حرف دیئے پانیوں پہ بُجھنے لگے
تو اپنی آج کی سطریں تمام کرتی ہوں

ہو خواب خواب جزیرہ مگر رسائی میں
کچھ ایسے پہلو سے ہی انصرام کرتی ہوں!

علی آذر

بُلبُل کی طرح کانوں میں چہکی چلی گئی
پھر اک گلاب کی طرح مہکی چلی گئی

جس کو میں دُور دُور سے تکتا تھا ہر گھڑی
سر پہ میرے وہ ایک تھی بدلی چلی گئی

زلفوں کو وہ بکھیرتی ہے روز شام کو
اور لوگ یہ سمجھتے ہیں بجلی چلی گئی

آئی تھی لوٹنے اُسے اور لوٹ جب چکی
رسوائی اس کے چہرے پہ ملدی چلی گئی

اک روز میں نے کر ہی دیا پیار کا اظہار
وہ ہنس کے میری بات کو ہنس دی چل گئی

اک عرصہ جب دکھا چکی مجھ کو وہ سبز باغ!
جھولی وہی پھٹی ہوئی بھر دی چلی گئی

لہجے میں اب مٹھاس ہے اس کے علی آذر
جس پہ تھا ناز آج وہ کڑی چلی گئی

اجیت سنگھ حسرت (لدھیانہ بھارت)

گھونسلے راکھ ہو گئے جل کے
مٹ گئے سب نشان جنگل کے

آگ برسا کے اُڑ گیا پل میں
پر نکل آئے آج بادل کے

چیتھڑے اوڑھ کر ہوں سو جاتا
خواب آتے ہیں مجھکو مخمل کے

سانپ اُن سے لپٹ گئے کیا کیا
ہم نے جو بوئے پیڑ صندل کے

آؤ بچوں کا احترام کریں
یہ تو وارث ہیں صاحبو، کل کے

جس میں انسانیت نہیں رہتی
ہم درندے ہیں ایسے جنگل کے

اپنا حق بڑھ کے چھین لو یارو
یوں دکھاؤ نہ ہاتھ مل مل کے

جو ہوا پر سوار ہو حسرت
کب وہ چلتا ہے ساتھ پیدل کے

ملک زادہ جاوید (نوئڈا بھارت)

خشک پتے زمیں پہ بکھرے ہیں
موسموں کے عجیب رشتے ہیں

شہر میں سانپ اب نہیں ہوتے
آدمی آدمی کو ڈستے ہیں

کھل گیا راز پہلی بارش میں
اُس کی عظمت کے رنگ کچے ہیں

اپنے غم اور خوشی میں، میں تنہا
میرے ہمسائے تو تجوبے ہیں

جو بھی چاہے خرید لے جاویؔد
ہم کھلونے بہت ہی سستے ہیں

حمیر نوری

اثر کس کا ہے میرے ذہن پر میں کہہ نہیں سکتا
میں اندر سے ہوں ٹوٹا کسقدر میں کہہ نہیں سکتا

صدائیں خوف کی آنے لگی ہیں چاروں جانب سے
نہ جانے ختم کب ہو گا سفر، میں کہہ نہیں سکتا

شناساؤں کے چہروں پر نظر مرکوز بس رکھنا
یہاں اب کس کا ہے کس پر اثر میں کہہ نہیں سکتا

نہ منزل ہے نہ جادہ ہے نہ جگنو ہے نہ تارا ہے
چلا وہ اس قدر کیوں تیز تر میں کہہ نہیں سکتا

شکستہ خواب کا جگنو لئے پھرتا ہوں پلکوں پر
ہوا ہے جسم کیوں اشکوں سے تر میں کہہ نہیں سکتا

بس اتنا یاد ہے گھر سے چلا ہوں دشت کی جانب
بنی کیوں آخری وجہ سفر میں کہہ نہیں سکتا

زبوں حالی کا دیکھو دور پھر سے لوٹ آیا ہے
تلاشِ رزق میں نکلوں کدھر میں کہہ نہیں سکتا

تمہیں گر پوچھنا ہے تو حمیؔر اس سے ہی تم پوچھو
وہ اتنا کیوں ہے مجھ سے بے خبر میں کہہ نہیں سکتا

فیصل عظیم

رنگ ہے آنکھوں میں بادہ پیمائی کا
زعم ہے پھر بھی باتوں کی گہرائی کا

روشنی میں آ کر تو آنکھیں جلتی ہیں
اندھے سودا کرتے ہیں بینائی کا

حرف کو پوجا تو سب کو پوجا
بوجھ اٹھائے پھرتا ہوں گویائی کا

اپنے اپنے نقادوں میں گم ہیں سب
ساز ثنائی کیسے دے یکتائی کا!

دور خلا میں دیکھ رہے ہو صدیوں سے
کیا اندازہ ذرّے کی گہرائی کا!

صدیوں کے انکار سے کچھ تو ثابت ہو
بھید ہے کچھ تو اس عالم آرائی کا

اہلِ علم کو دیکھا تو شرمایا ہوں
سب سامان ہے آدم کی رسوائی کا

سجاد مرزا

زندگی پھر نئے انداز میں ڈھالی جائے
گر روایات کی یہ قید اٹھا لی جائے

مصلحت کا یہ تقاضا ہے بپئے صبر و شکیب
آنکھ حالات کے چہرے سے ہٹالی جائے

کوئی تو نقشِ جلی مقتلِ جاں کا رکھیے!
خون کی بوند ہی دامن پہ لگا لی جائے

جس کی قسمت میں گہر بننا لکھا ہوا ہے ابر
بوند ایسی ہی کسی سیپ میں ڈالی جائے

اب تو بازار میں ہر در ہے دکانِ تاجر
کس کی چوکھٹ پہ محبت کا سوالی جائے

خشک پتا ہی عطا کر شجرِ صحنِ بہار
دامنِ موجِ ہوا در سے نہ خالی جائے

رات میں ہوگی اجالے کی ضرورت سجاد
شام سے پہلے کوئی شمع جلا لی جائے

امتیاز دانش (مئو بھارت)

کسے خبر تھی کہ ایسی بہار دیکھیں گے
رخِ حیات کو ہم داغدار دیکھیں گے

ابھی بھی زندہ ہیں پلکوں پہ اپنے خواب لئے
کبھی تو گھر کی فضا خوشگوار دیکھیں گے

تمہیں نے زرم گلوں کا بدن کھرونچا ہے
کھلی سڑک پہ یہی اشتہار دیکھیں گے

اسی گمان پہ بیٹھے ہیں بیچ رستے میں
چلے گا کس کا یہاں اختیار دیکھیں گے

قرار کیسے ملے اپنی جلتی آنکھوں کو
تھی آرزو کہ چمن سبزہ زار دیکھیں گے

ہمارے ذہن میں یہ بات تھی کہاں دانشؔ
لہو میں اپنے کبھی انتشار دیکھیں گے

محمد آصف مرزا

غم کا دفتر کھلا رہا مجھ میں
اک تماشا لگا رہا مجھ میں

رات تاریک تھی اگرچہ بہت
اک دیا سا جلا رہا مجھ میں

میں بظاہر خموش تھا لیکن
ہر کوئی چیختا رہا مجھ میں

ایک عالم سا گیا اندر
پھر بھی باقی خلا رہا مجھ میں

جو بھی چاہا سو کر دیا میں نے
اور کوئی سوچتا رہا مجھ میں

میں کہیں اور تھا قیام پذیر
وہ مجھے ڈھونڈتا رہا مجھ میں

تجھ ترے تھی کیسے مجالِ قیام
تو ہی جب تک رہا رہا مجھ میں

محیط اسمٰعیل

محبت ایک سچائی ہے! کیا ہے!
نتیجہ اس کا رسوائی ہے! کیا ہے!

مرے چاروں طرف یادیں ہی یادیں
یہ محفل ہے کہ تنہائی ہے! کیا ہے!

مبارک عشق کی تمہید سب کو
فقط اک کوہ پیمائی ہے، کیا ہے!

ہے نازاں آئینہ ہر زاویے سے
کوئی تصویر کھنچوائی ہے، کیا ہے!

سمجھنے ہم لگے ہیں پھول جس کو
کلی کی ایک انگڑائی ہے، کیا ہے!

سنبھلتی اور سمٹتی دور نکلی
گھٹا کھیتوں سے شرمائی ہے، کیا ہے!

نظر آتی ہے تہ دریا کی مجھ کو
یہ اک آنسو کی گہرائی ہے، کیا ہے!

ہے سناٹوں کا استفسار مجھ سے
کہیں آہٹ سی اک آئی ہے! کیا ہے!

محیطؔ اُس سے بہت کم مل رہا ہوں
تکلف ہے کہ دانائی ہے، کیا ہے!

شہاب صفدر

جتنے بھی لمحے ترے بعد گزارے ہم نے
چادرِ ہجر پہ ٹانکے ہیں ستارے ہم نے

وقت کس آنکھ سے دیکھے گا ہمیں کیا معلوم
داغ دل کے سرِ قرطاس اتارے ہم نے

غمِ ایام کی اِس پھیلتی شب میں، سورج
ڈھالنا ہے تری یادوں کے سہارے ہم نے

دن کی رخصت پہ خدا جانے کس اُمید کے ساتھ
اک سیہ شام کو سونپے تھے نظارے ہم نے

اُس کے خوابوں نے عذابوں کا لیا راستہ روک
ایک فنکار کہ پتھر جسے مارے ہم نے

اپنے ہاتھوں انہیں اب کیسے کریں نذرِ خزاں
موجۂ خوں سے جو گلزار نکھارے ہم نے

پھول کھلے ہیں ابھی

سلطان جمیل نسیم

مطلوب یہ طے کیے بغیر گھر سے نکل کھڑا ہوا کہ کہاں جانا ہے۔ اپنے دماغ کو ٹھنڈا کرنے کے لیے اپنے جذبات کو خیال کا تابع رکھنے کے لئے اُسے یہی ایک راستہ سوجھا کہ وہ گھر کی چار دیواری سے نکل جائے۔

دوپہر ابھی فاصلے پر تھی۔ رات کی خنکی کو دھوپ آہستہ آہستہ جذب کر رہی تھی۔ لوگ اپنے کام کاج کے لئے جا رہے تھے۔ اگر مطلوب کو چھانٹی میں برطرف نہ کیا گیا ہوتا تو وہ ابھی کم از کم چار برس اور ملازمت پر رہ سکتا تھا اور اس وقت وہ بھی شہر کا رخ کیے تیز تیز قدم اٹھاتا اپنی بس پکڑنے کے لئے مین روڈ کی طرف جا رہا ہوتا........ لیکن حکومت کو قرضہ فراہم کرنے والے مالیاتی اداروں کی یہی شرط تھی کہ حکومت کے زیر انتظام بہت سے اداروں سے کام کرنے والوں کی چھانٹی کر دی جائے۔ (برطرف کیے جانے والوں کی اکثریت سے مطلوب نے یہی سنا تھا) لاکھوں آدمیوں کے بے روزگار کر دیے سے پورے ملک میں ہاہاکار مچ سکتی تھی اس لئے یہ بھی طے کیا گیا کہ ملازمت سے فارغ ہونے والوں کو کم سے کم اتنی رقم دے دی جائے جو ریٹائرمنٹ کے وقت ملتی...... اسی لئے دو چار دن اخباروں میں چھوٹی موٹی خبریں اور دس پانچ مراسلے تو شائع ہوئے مگر ایسی ہلچل پیدا نہیں ہوئی جو حکومت کے لئے پریشانی یا دردِ سر بنی ہوتی.......

صبح سے شام تک فضاؤں میں اُڑنے والے پرندے اپنے گھونسلوں کے حالات سے جتنے باخبر ہوتے ہیں اپنی ملازمت کے دوران مطلوب بھی اپنے گھر والوں کی عادات و مصروفیات سے اتنا ہی واقف تھا...... لیکن جب سے گھر بیٹھا تھا سب کے معمولات اور خصائل پوری طرح سامنے آتے جا رہے تھے۔

بڑا بیٹا صبح ہی ساڑھے سات بجے اپنے کام پر چلا جاتا تھا جب تک مطلوب روزگار سے لگا رہا بیٹا پڑھتا رہا اور تعلیم پوری کرنے کے بعد مختلف محکموں کے لئے درخواستیں لکھتا رہا...... محض اتفاق کی بات ہے جس روز مطلوب کی ملازمت چھوٹی..... اُسی دن بڑے بیٹے کو ایک نجی ادارے میں اچھی تنخواہ والی نوکری مل گئی۔ دوسرا بیٹا یونیورسٹی میں پڑھ رہا تھا۔ دونوں بھائی ایک ساتھ ناشتہ کرتے تھے لیکن یونیورسٹی جانے والے کو تیار ہونے میں ذرا دیر ہو جاتی تھی اس لئے وہ آٹھ سوا آٹھ بجے تک گھر میں ہی رہتا تھا۔ تیسرا بیٹا اپنے کمرے میں بند رات بھر کیبل پر انگریزی فلمیں دیکھتا یا کمپیوٹر کے ذریعے ڈسکس پر گانے سنتا رہتا تھا۔ دوپہر سے پہلے سو کر نہیں اُٹھتا تھا۔ مطلوب کو یہ عادت سخت ناپسند تھی وہ ڈانٹ ڈپٹ کرنا چاہتا تھا مگر بیوی نے روک دیا۔

”امتحان سے فارغ ہو چکا ہے۔ نتیجہ چار چھ مہینے سے پہلے نہیں آئے گا۔ اِدھر اُدھر بھٹکنے کی بجائے گھر میں ہی تو رہتا ہے اور فی زمانہ جوان بچوں کا گھر میں وقت گزارنا ماں باپ کی خوش قسمتی ہے باہر ہتھیار بند سیاسی اور مذہبی تنظیموں کے ہتھے چڑھ جانے سے بہتر ہے کہ گھر میں رات بھر جاگے اور دن بھر سوئے.....“

مطلوب نے ہمیشہ کی طرح بیوی کی یہ بات بھی سُن لی پر اتنا ضرور سوچا کہ ہمارے ملک میں امتحان کا نتیجہ آنے میں اتنی دیر کیوں لگتی ہے؟ اور پڑھے لکھوں کو روزگار کیوں نہیں ملتا؟

آج بھی گھر میں روز کی طرح اکیلے پن کا احساس دُھندلا پھر رہا تھا۔ مطلوب اپنے بستر پر لیٹا اخبار پڑھ رہا تھا اور بیوی باورچی خانے میں کام سمیٹ رہی تھی۔

مطلوب نے جب خبروں کا صفحہ ختم کر کے فلمی ایڈیشن اٹھایا تو پورے صفحے پر چھپی ہوئی ایک ایکٹرلیس کی رنگین تصویر نے نظروں کو اپنے جال میں جکڑ لیا۔ چہرے کے خدوخال کو تو میک اپ کے کمال نے پُرکشش بنا ہی دیا تھا لیکن بدن کے نقوش پر لباس کو اس طرح منڈھا گیا تھا کہ تصویر کے پردے میں بھی سارے پردے اٹھتے دکھائی دے رہے تھے۔ مطلوب نے اخبار کے اس صفحے کو آڑھا ترچھا کر کے مختلف زاویوں سے دیکھا۔

”چائے اور پیئں گے؟“

اس آواز پر پہلے تو وہ یوں چونک اٹھا جیسے چوری پکڑی گئی ہو......

پھر خجالت آمیز نگاہوں سے بیوی کی طرف دیکھا......

صبح سے وہ مصروفیت کی چادر اوڑھے سارے کام نمٹا رہی تھی۔

سوئے جانے والوں کے لئے اس نے صرف ناشتہ ہی تیار نہیں کیا تھا بلکہ بڑے بیٹے کے لئے دوپہر کے کھانے کا ٹفن بالکل اسی طرح ساتھ کیا تھا جس اہتمام سے مطلوب کے لئے تیار کر کے ساتھ کر دیتی تھی...... لیکن اس وقت وہ عجیب انداز میں سامنے کھڑی تھی۔ سر پر دوپٹہ ڈھیلے صافے کی طرح لپٹا تھا۔ آستینیں کہنیوں تک چڑھی ہوئی تھیں اور پنچوں تک ہاتھ گیلے تھے۔ مطلوب نے بیرنگ انداز میں بار بار دیکھا...... اس وقت دیکھا تو اخبار بستر پر ایک طرف ڈالا اور سوال کے جواب میں اس کا گیلا ہاتھ پکڑ کے اپنی طرف کھینچا......

اس وقت کی کھینچا تانی کے لئے وہ بالکل تیار نہ تھی اس لیے ذرا سا ڈگمگائی پھر سنبھل کر اپنی کلائی مطلوب کی گرفت سے آزاد کرانے کے لیے زور آزمائی کرنے لگی۔

”نہیں..... یہ بھی کوئی وقت ہے“

”وقت! ارے جب تم ہاتھ آ جاؤ وہی تو وقت اپنا ہے“

”نہیں چھوڑو... سارا کام پڑا رکھا ہے“

"اِتنے دن بعد بھی نہیں....."

وہ اپنا ہاتھ چھڑانے کی بھرپور کوشش کرتی رہی تو مطلوب نے بدکی ہوئی گھوڑی کو چمکارتے ہوئے کہا۔

"میری جان....."

"کوئی جان وان نہیں... ہاتھ چھوڑو......"

مطلوب نے اس مسلسل مزاحمت سے یہ اندازہ تو لگا لیا کہ فی الوقت قابو میں آنے والی نہیں ہے۔ چھبیس سال ایک ساتھ رہنے سے اتنا تو وہ جان گیا تھا کہ انکار کب اقرار میں بدلتا ہے اور کب انکار ہی رہتا ہے۔ پھر بھی اس وقت اپنی طرف کھینچ رہا تھا۔ جب مطلوب نے دوسرا ہاتھ بھی پکڑ لیا تو وہ بھی پوری طرح مقابلے کے لیے ڈٹ گئی..... اِس انکار کو ذہن نے قبول کیا تو جھنجلاہٹ مطلوب کے سارے بدن پر کپکپی کی صورت پھیل گئی۔ پھر بھی آخری کوشش کے طور پر کہا۔

"ہم کوئی گناہ تھوڑی کر رہے ہیں جو تم......"

"گناہ کا بھی ایک کام نہیں رہ گیا ہے۔ چھوڑیں میرے ہاتھ....."

گرفت ڈھیلی پڑ گئی تھی یا ہاتھ چھڑانے کے لیے بیوی نے اپنی ساری طاقت لگا دی تھی۔ ایک چوڑی کے ٹوٹتے ہی مطلوب نے جھٹکے سے دونوں ہاتھ چھوڑ دیے۔

"جاؤ جہنم میں......"

وہ کوئی جواب دیے اور مڑ کر دیکھے بغیر کمرے سے نکل گئی۔

انکار...... زور آزمائی...... پھر نہایت بے رخی کے ساتھ کمرے سے چلے جانا......

اچانک بھڑک اُٹھنے والے جذبات پر ناامیدی کا پانی پڑا تو غصے کا دھواں چھا گیا...... اِس دھوئیں کی لپیٹ میں آنے کے بعد اِس کے سوا کچھ نہ سوجھا کہ وہ فی الفور گھر کی فضا اور ماحول سے نکل بھاگے...... اٹھا...... جلدی جلدی کپڑے بدلے...... الماری میں رکھا ہوا والٹ جیب میں ڈالا اور پھر الماری کا پٹ زور سے بند کیا...... کمرے سے باہر نکل کر پوری قوت سے بھیڑا...... لوہے کے مین گیٹ کا چھوٹا دروازہ بھی خاصی بے رخی کے ساتھ بند کیا...... جس کے دو مقصد تھے...... معلوم ہو جائے کہ وہ ناراض ہو کر باہر چلا گیا ہے اور گیٹ کھلا ہے اسے بند کر لیا جائے......

گھر سے باہر نکلتے ہی مزاج کی کیفیت میں تبدیلی آئی...... دیکھنے والے غصے کی پرچھائیاں چہرے پر نہ دیکھ سکیں...... چند قدم ہی آگے بڑھا تو یہ سوال سامنے آیا کہ اب کہاں جائے......؟ کلائی پر بندھی گھڑی دیکھی...... نو بجنے والے تھے...... دوست احباب سب ہی اپنے کام پر جا چکے ہوں گے...... اب لے دے کے حبیب خان کا جنرل سٹور ہے یا ننھے قصائی کی دکان...... سٹور کے سامنے بیٹھ کر دوبارہ اخبار پڑھنا یا پھر سودا سلف لینے کے لیے آنے والوں کا منہ تکنا...... نہایت فضول بات...... اُس زمانے کے قصے سننا جب گائے پندرہ روپے کی اور بکرا تین روپے میں مل جاتا تھا...... یا پھر ننھے قصائی کا دکان سنبھالے ہوئے اپنے بیٹوں کو غلیظ گالیوں کے ساتھ صاف ستھرا گوشت بنانے کی تلقین کرنا...... یہ اور زیادہ واہیات بات معلوم ہوئی...... اپنی بدذات بیوی کے ہاتھوں جذبات کا خون کرا کے قصاب کی دکان پر جا بیٹھنا...... اونہہ...... ارادہ کیا کہ حبیب خان کے سٹور کی طرف ہی چلنا چاہیے...... نہیں اس وقت تو حبیب خان کو دم لینے کی فرصت نہ ہوگی...... شوہروں کے کام پر جاتے ہی روزمرہ کی چیزیں خریدنے کے لئے بیبیاں گھروں سے نکل پڑتی ہیں...... میں نے تو یہ تکلیف بھی نہیں دی، ضرورت کی ہر چیز وقت سے پہلے مہیا کر دی اور میرے ساتھ یہ سلوک......! چلو آج دفتر میں اپنے پرانے ساتھیوں کی خیر خبر لیں...... مگر وہ بھی اب کہاں...... چھانٹی کے بعد سب ہی تتر بتر ہو گئے...... جو دو چار باقی ہیں وہ بڑی سرد مہری سے ملتے ہیں یا دیکھ کے نظریں چرا لیتے ہیں۔ اس لیے وہاں جانا بھی بے کار...... پھر ویگن میں دھکے الگ کھانے کو ملیں...... نہیں...... جو گھر پر لگا ہے وہی ایک جھٹکا بہت ہے۔

مطلوب نے چلتے چلتے رخ بدلا...... سڑک پار کرنے کے بجائے وہ مسجد والی گلی کی طرف مڑ گیا...... مسجد کے پچھواڑے بنے ہوئے پارک کا خیال آ گیا...... مگر اس وقت تو ویران ہوگا...... اللہ جانے یہ ڈیڑھ ایکڑ کا ٹکڑا ادارۂ بلدیات کی نظر سے کس طرح بچ گیا...... ورنہ پارک کے نام سے شہر میں جتنی کھلی جگہیں تھیں...... وہ کسی نہ کسی تجارتی مرکز کے لئے اونے پونے داموں پر اپنے منظورِ نظر لوگوں کو الاٹ کر دیں...... جو بھی حکومت آئی ہے وہ پارک کے لیے چھوڑی ہوئی زمین کسی نہ کسی بہانے ٹکڑوں میں تقسیم کر کے بیچ ڈالتی ہے...... کیسے عجیب ہیں یہ فرزندِ زمین بھی......

مطلوب جب پارک میں پہنچا تو وہاں کتے لوٹ رہے تھے...... بنجر پن اُگ رہا تھا۔ صبح سویرے چہل قدمی کرنے والوں کے لیے بنی ہوئی روشوں پر دھوپ میں لیٹی ہوئی ہوا کے ساتھ ایک سرے سے دوسرے سرے تک ویرانی سرگوشیاں کرتی پھر رہی تھی اور سیمنٹ کی بنی ہوئی بنچوں کے نیچے زبان لٹکائے کتے بیٹھے ہوئے تھے۔

اِسی پارک کے احاطے کے باہر ایک نرسری تھی...... جہاں دو چار درخت ایسے بھی تھے جن کے سائے میں آدمی بیٹھ سکتا تھا...... پیڑوں کے گھنے سایوں نے مطلوب کو اپنی طرف کھینچ لیا۔ ایک چھپر کے نیچے کچھ پودے ایک جھلنگا چارپائی ایک ٹوٹا ہوا مونڈھا اور بکھرا ہوا حقہ پڑا تھا اور ذرا فاصلے پر کھلی دھوپ میں ایک شخص بیٹھا گھاس لگا رہا تھا۔

مطلوب نے آگے قدم بڑھانے سے پہلے سوچا شہر میں بڑھتی ہوئی کثافت، دُنیا بھر میں ہونے والے لرزہ خیز ایٹمی تجربات، اوزون کی تہہ میں روز بروز ہونے والی کمی کی وجہ سے موسم بھی قریبی عزیزوں کی طرح نظریں بدلنے لگے ہیں بھلا اس وقت اتنی گرمی کہیں ہوا کرتی تھی......؟ یہ سب سوچتا ہوا وہ سر جھکا کر چھپر کے نیچے رکھے ہوئے مونڈھے کی طرف بڑھا۔ مطلوب کی موجودگی کو محسوس کر کے مالی نے مڑ کر دیکھا اور اُٹھنے کا ارادہ ظاہر کیا تو مطلوب نے ذرا اونچی آواز میں کہا......

"تم اپنا کام کرتے رہو میں تو ایسے ہی ذرا سستانے کے لیے آ گیا ہوں۔"

یہ سُن کر مالی نے نظروں ہی نظروں میں مطلوب کو جانچا...... پھر یہ اطمینان کرنے کے بعد کہ مسجد میں آتے جاتے وہ اکثر دیکھتا رہا ہے...... بولا۔

"آرام سے بیٹھو صاب...... مٹکے میں ٹھنڈا پانی بھی ہے"

اتنا کہنے کے بعد وہ مطلوب کی موجودگی سے بے نیاز ہو کر یکسوئی کے ساتھ اپنے کام میں لگ گیا۔

مطلوب نے بیٹھنے سے پہلے مونڈھے کو ہلا کر جائزہ لیا۔ کہیں ایسا نہ ہو بیٹھتے ہی لڑھک جائے۔ مونڈھے کی پشت اُدھڑی ہوئی تھی لیکن بیٹھنے کے قابل تھا۔

دھوپ کا سارا زور چھوٹے بڑے چھدرے درختوں نے اٹھا رکھا تھا۔ اُن کی شاخوں سے چھن کر آتی ہوئی دھوپ بالکل ایسی لگ رہی تھی جیسے بند کی ہوئی گھاس پھونس کی چھت میں سے بارش کی موٹی بوندوں کی طرح ٹپک رہی تھی اور زمین پر...... جھلنگے کھٹولے پر...... پلاسٹک کی تھیلیوں میں بند اور کیاریوں کی صورت سر اٹھاتے پودوں پر اور مطلوب کے زانوؤں سے لے کر جوتوں تک...... پیلے پیلے چھوٹے بڑے دھوپ کے پھول بکھرے ہوئے تھے۔ اس باغیچے میں رنگ برنگ پھولوں کی...... پودوں کی...... ہریالی کی خوشبو کچھ دیر کے لیے مطلوب کو اپنی طرف متوجہ کیے رہی، چاروں طرف دیکھتے ہوئے اس کو خیال آیا...... ہماری زندگی بھی ان پودوں کی طرح ہے۔ پانی مٹی کھاد توازن اور توجہ کے ساتھ حاصل ہو جائے تو شگفتگی خوشی اور اطمینان کے پھول کھل اُٹھتے ہیں...... پھر خیال نے پلٹا کھایا...... پھول کھلنے کے موسم تو دو ہی ہوتے ہیں...... ایک بچپن، جہاں معصومیت بے فکری کا ہاتھ تھامے کلیلیں کرتی، بھاگتی دوڑتی ہے...... اور دوسرا موسم جوانی...... ہا...... کیا کیا گل کھلائے جاتے ہیں، رگوں میں دوڑتی ہوئی بجلی...... خوشبو کو بانہوں میں جکڑ لینے کی خواہش...... بس مستی ہی مستی...... جوش ہی جوش...... پھر...... میاں مطلوب تیسرا موسم بھی تو ہے...... تاسف.. پچھتاوا... خیال ہی خیال میں گزرے لمحوں کے جگنو پکڑنے کی لا حاصل کوشش...... بہار سے روٹھا ہوا... خزاں کے ہاتھ آنے کے خوف سے شاخ سے کبھی جدا نہ ہونے کی بے سود کوشش کرتا ہوا پھول......

مطلوب کے ذہن میں اس سے آگے کا خیال آیا تو ایک جھرجھری سی آئی... گردن جھٹک کے چاروں طرف دیکھا تو اُس مالی پر جا کے نظر ٹک گئی جو اپنے کام میں مسلسل... ایک ہی توجہ کے ساتھ مصروف تھا۔

میں بھی اس وقت اپنے دفتر میں مصروف ہوتا... خیر آمدنی کے حساب سے تو کوئی گھاٹا نہیں ہوا... اوپر دو کمرے بنوا کر کرائے پر دے دیے ہیں...... کچھ ہر مہینے سود مل جاتا ہے... سود... کہتے ہیں اسلامی ملک ہے... اوہ... سارے اسلام کے ٹھیکیدار اسی ملک میں جمع ہو گئے ہیں...... پاجامہ ٹخنوں سے اوپر ہو...... سر ننگا نہ رہے...... نماز کے وقت وضو...... لیکن ایک دوسرے کا خیال کرنے کی تلقین ہوا اور...... ہمارا دین تو ہر زمانے کے لیے ہے اور ہم ماضی کی طرف دیکھے جا رہے ہیں...... کسی اسلامی ملک نے کوئی چیز ایجاد کی ہے......؟ آپس میں اتحاد تک نہیں ہے...... اور نعرہ ہے...... مسلم ہیں وطن ہے سارا جہاں ہمارا...... پہلے اپنے وطن کو تو سجا سنوار لو...... علاقائی، فقہی، نسلی، لسانی تعصبیں تو ختم کرو...... نام کے مسلمان بنے ہیں...... رمضان شریف میں نمازیوں کی تعداد زیادہ ہو جاتی ہے باقی دنوں میں ایک صف پوری نہیں ہوتی...... ان باتوں کو چھوڑو مطلوب میاں...... کچھ اپنی بیماری کے بارے میں سوچو...... بیماری کا احساس اپنی ہی ذات تک رہے تو کوئی بات نہیں...... شاید سب نہ کیں وہ...... سب کی اماں جو ہے...... اُس نے بیمار دیکھ لیا ہے پاس بیٹھ کے ڈھنگ سے محبت سے بات نہیں کرتی ہے ایمان کی تو یہ ہے میں نے کب چاہا کہ ہم الگ بیٹھیں۔ شادی کے ابتدائی دنوں کی بات الگ ہے اُس وقت تو ہم ساتھ سوتے تھے سو گئے تھے بس جاگتے ہی رہتے تھے... ذرا سی اونگھ آئی...... پھر بچہ شروع...... ان رتجگوں سے وہ بھی تھک گئی تھی... بڑے بیٹے کے پیدا ہونے سے پہلے ہی میں نے اس کو علیحدہ سونے کے لیے کہہ دیا... کیا کرتا ایک پلنگ پر ٹھیک سے کروٹ تک نہیں لی جا سکتی تھی... جب بیٹا سال بھر کا بھی نہیں ہوا تھا کمرہ ہی بدل لیا...... لوگوں پر جو بستر پر جاتے ہی خراٹے لینے لگتے ہیں...... یہاں ہزار جتن کر کے تو نیند کو مناؤ پھر اگر درمیان میں آنکھ کھل جائے تو سویرا ہی سمجھو...... جس سے بھی بات کی اُس نے یہی کہا نیند کا تعلق خیالات سے ہے تم سوچتے بہت ہو گے...... اب سوچنا کوئی اپنے اختیار میں ہے؟ نماز پڑھنے میں کتنے خیال آتے ہیں۔ ان آتے ہوئے خیالوں کے سامنے دیوار تو کھڑی نہیں کی جا سکتی...... اور کہنے والوں کی بھلی چلائی...... کہتے ہیں بیوی بڑھاپے کا ساتھی ہوتی ہے۔ کیا خاک ساتھی ہو گی...... ابھی بڑھاپا کوسوں دور ہے اور وہ ہی نویلی دلہن کی طرح... ساس نند نہ دیکھ لیں...... کہیں بچے ہی گن نہ پالیں...... یوں لیے دیے رہتی ہے جیسے میں نے کمرہ الگ نہیں کیا، بیچ

میں دیوار اٹھا دی ہے..... خیر اس میں تھوڑا بہت قصور میرا بھی ہے اس کو جب بھی بلایا اپنے مطلب کے لیے بلایا..... اور وہ..... دس بار بلانے پر آئے تبھی تو شکایات کا پلندہ کھول کے بیٹھ جائے۔ بچوں پر توجہ نہ دینے کا الزام تو خیر پرانا ہے لیکن آمدنی کم اور بچت نہ ہونے کا قصور بھی میرے ہی سر تھوپنے لگے۔ ذرہ بیٹھی ساس نندوں کے شکوے..... دراصل باتوں کا حافظہ اور عورت کا کینہ فطرت میں شامل ہے..... ایسی پرانی پرانی باتیں جو مجھے بالکل بھی یاد نہیں..... ان کو اتنی تفصیل سے بیان کرتی ہے جیسے یہ سب ابھی کی ہوں..... اپنی طبیعت کو زیادہ مکدر کرنے سے بہتر تو یہی تھا کہ ذرا دیر لٹا بٹھا کے کہہ دیا۔ "جاؤ بچہ رو رہا ہے"..... چھوڑو بھائی..... اس کی باتیں یاد کر کے دل خراب کرنے سے کیا فائدہ.....؟ جیسا ماضی ویسا حال..... دراصل مجھے شادی ہی نہیں کرنی چاہیے تھی..... خاص طور سے اس عورت کے ساتھ..... بس اماں جی دیکھ گئیں صورت پر..... ان کی غلطی کا خمیازہ اب تک بھگت رہا ہوں..... جتنی ذہنی اذیت برداشت کرنے کی سکت تھی اس سے زیادہ سہہ چکا ہوں..... ہر ضرورت پوری کر دی..... رہنے کے لیے گھر بھی اللہ نے دے دیا۔ بچوں کی تعلیم میں بھی کوئی کسر نہیں رکھی..... بیٹی کے فرض سے اللہ تعالیٰ نے سرخروئی کے ساتھ سبکدوش کیا..... مگر وہ نہیں بدلی..... میں تو اس کا دل رکھنے کے لیے بچوں کے اور اپنے پرایوں کے سامنے یہ کہتا رہا کہ بچوں کی تعلیم و تربیت میں صرف ماں ہی کا حصہ ہے اور میرے اس جھوٹ کو اس نے سچ سمجھ لیا۔ ہر آئے گئے کے سامنے دہرانے لگی۔ بچوں کے دل میں بھی اس جھوٹ کو بٹھا دیا..... دراصل جیسی ذہنیت لے کر آئی تھی اس میں رتی برابر فرق نہیں آیا..... اب تو اس کے مزاج کے سامنے میرے اعصاب شل پڑنے لگے ہیں۔ حد ہوتی ہے آخر برداشت کی بھی۔

سورج نے راستہ اور طے کیا تو دھوپ کی کرچیاں پودوں پر چبھنے لگیں..... مطلوب نے ان سے بچنے کے لیے زاویہ بدلا..... موڑھا کھسکایا..... جوتے اتار کر چارپائی کی پٹی پر پاؤں پھیلا دیے..... گردن گھما کے مالی کو دیکھا..... وہ اب کیاریوں میں سے گھاس پھوس اکھاڑ اکھاڑ کے ایک طرف ڈالتا جا رہا تھا۔

"میں نئے سرے سے زندگی کا آغاز کرنا چاہتا ہوں....."

لیکن اب..... چھپن برس کی عمر میں نوجوانی کی توانائی کہاں سے لاؤں گا.....؟

چھپن برس.....! ارے بھئی سرٹیفکیٹ کے حساب سے ابھی چون سال کا ہوں۔

جسم ذرا کمزور ہو گیا ہے۔ ذہنی طور پر تو پہلے کی طرح چاق و چوبند ہوں.....

اچھی خاصی نوکری مل رہی تھی۔ بڑے صاحبزادے نے اڑنگا لگا دیا۔

"چھوڑیے ابا..... بہت نوکری کر لی آپ نے۔ اب ہمیں کام کرنے دیجیے اور آپ آرام کیجیے....."

نوکری کرنے کو تو واقعی دل نہیں چاہتا تھا..... وہ صرف وقت گزاری کے لیے ایک مشغلہ ڈھونڈ رہا تھا۔ بیٹے کے کہنے سے خیال بھی نکال دیا۔

پھر کیا ارادہ ہے؟ کچھ سوچا ہے؟ فنونِ لطیفہ سے تمہیں لگاؤ نہیں..... ہابی پر وقت ضائع کرنا تم کو..... دولت جمع کرنے کی ہوس سے دل خالی ہے..... تیس سال کی ملازمت کی یکسانیت نے تھکاوٹ اور بیزاری تمہارے روئیں روئیں میں بھر دی ہے..... ارے تمہیں تو دفتری سیاست کے داؤ پیچ بھی نہیں آئے..... جس کرسی پر جا کے بیٹھے برس ہا برس تک اسی کرسی پر بیٹھے رہے۔ حد ہے اسی کرسی سے ریٹائر ہوئے..... تنخواہ میں سالانہ اضافہ تو ہوتا رہا..... مگر جس کو ترقی کہا جاتا ہے وہ کبھی نہیں ملی۔

لیکن میرے افسرانِ بالا تو مجھ ہی پر تکیہ کرتے تھے میرے ساتھ خود کو ادھورا بلکہ نکما سمجھتے تھے۔ اس لیے کہ ہر دفتری ضابطہ اور قانون تمہاری زبان کی نوک پر تھا۔ پرانی سے پرانی فائل تمہاری انگلی کے ایک اشارے پر نکل آتی تھی۔ افسران اپنی جو مراعات حاصل کرنا چاہتے تھے تم سرکلرز میں دیے ہوئے قواعد و ضوابط نکال کر ان مراعات کا حقدار ثابت کر دیتے تھے۔ اور اس کارگزاری کا صلہ تم کو کیا ملا.....؟ تمہارے بعد آنے والے تم سے بہت پہلے ترقی پا گئے.....

مجھے اس بات کا کوئی غم نہیں ہے..... میں نے اوپر کی فضا دیکھی ہے وہاں آنکھیں صرف اپنے آپ کو دیکھتی ہیں ذہن صرف اپنے بارے میں سوچتے ہیں۔ میں ان جیسا تھا ہی نہیں..... میں تو اپنے ادارے کی ترقی چاہتا تھا۔ جو ادارے کو فائدہ پہنچانے کی سوچ میں اس کو فائدہ حاصل کرنے کے قانونی طریقے بتا رہا تھا۔ آڈیٹر (Auditor) بھی ایک دوسرے کی صورت دیکھ کر رہ جاتے تھے..... مگر جب سفارشیوں کی نااہلوں کی لین ڈوری لگی تو میرا دل اُچاٹ ہو گیا..... اگر یہ گولڈن ہینڈ شیک کی اسکیم نہ بھی آئی ہوتی تو میں پھر بھی قبل از وقت ریٹائرمنٹ لے لیتا..... سیاسی مداخلت کی آخر کوئی حد ہوتی ہے..... پھر یہ کہ میں اپنی فطرت سے بھی خلوت پسند ہوں..... ایک Retiring Person..... جو اپنے بیوی بچوں سے کھل کے بات نہ کرتا ہے..... شاید اسی لیے میرے بہت زیادہ دوست بھی نہیں ہیں۔

اگر اتنے صبر و قناعت کرنے والے ہو تو بے وقت انگڑائی لے کے جاگ اٹھنے والی خواہش پر بھی قابو پا لیا کرو..... اس طرح گھر چھوڑ کے تو نہیں بھاگا جا سکے گا.....

دیکھو اب میری دکھتی رگ کو نہ چھیڑو... میں یہاں آرام سے بیٹھا آنکھوں میں ٹھنڈک پہنچانے والی ہریالی اور دل و دماغ میں خوشبو بھر دینے والے خوبصورت پھولوں کو دیکھ رہا ہوں اور تم اس کا ذکر چھیڑ کے کانٹے چبھو رہے ہو تم کیا جانو یہ جو میری بیوی ہے نا... یہ میرے سارے گناہوں کا عذاب ہے جو مجھے یاد بھی نہیں ہیں۔

یہ کوئی نئی بات نہیں... اگر شادی شدہ لوگوں کے دل ٹٹولو تو ان کے خیالات بھی اپنی بیویوں کے بارے میں ایسے ہی ہوں گے۔ تم تو ایسے لوگوں سے بھی واقف ہو جو کہتے پھرتے ہیں کہ بیوی سے ذہنی مطابقت نہیں اور جسمانی مطابقت کا یہ حال ہے کہ آدھی درجن بچوں کے باپ ہیں۔ تم بھی اسی قضا کا شکار ہو... چلو اٹھو... گھر جاؤ... گھنٹہ بھر سے زیادہ ہو گیا تمہیں گھر سے نکلے ہوئے...

نہیں ابھی نہیں... مجھے پتا ہے وہ میرا انتظار نہیں کر رہی ہو گی... دو ڈھائی بجے کے قریب جب چھوٹا بیٹا اٹھے گا تو اُسے ناشتہ اور کھانا کھلا کے... کیا کہتے ہیں ایسے کھانے کو... ہاں (Brench) برنچ... یہ ایک ناشتے اور لنچ کا مختصر مرکب... تو اس کے بعد شاید وہ میرے بارے میں سوچ لے۔

اس طرح خالی بیٹھ کر ہوٹ پٹانگ باتیں سوچنے کا کیا فائدہ...!

ان باتوں کے لیے بھی وقت کہاں ملتا ہے... کبھی کبھی اپنے آپ کو دہرانا بھی اچھا لگتا ہے۔

ہے کچھ بھی مجھے لے اڑی ہے خوشگوار کوئی کہیں

تمہیں مصرعے بہت یاد ہیں کوئی مکمل شعر بھی یاد ہے...؟ اچھا یہ بتاؤ کوئی خوشگوار یاد... کوئی نہ بھولنے والا واقعہ بھی اس وقت ذہن میں ہے...؟

ہاں... بہت دن ہوئے... اتنے دن کہ اب یہ بھی یاد نہیں کہ وہ میرے رشتے میں چچا تھے یا ماموں... تایا تھے یا خالو... اور عمر اُن کی ہو گی ساٹھ سے بھی کچھ زیادہ... میں نے انہیں ایک اٹھارہ انیس سال کی لڑکی کے سامنے بچوں کی طرح روتے ہوئے... نوجوانوں کی طرح عشق بگھارتے ہوئے دیکھا ہے... ایک مرتبہ نہیں... کئی بار... کبھی وہ لڑکی کے آنچل سے کھیلنے لگتے... کبھی اس کا ہاتھ اپنے ہاتھوں میں تھام لیتے... کبھی گالوں پر بوسہ لیتے... وہ منظر آج بھی یادوں کے ورق پر اپنے سارے رنگوں کے ساتھ محفوظ ہیں... اور شاید اسی لیے اب میرا بھی جی چاہتا ہے کہ میں بھی عشق کروں...

عجیب احمق ہو مطلوب حسین! اب تمہیں عشق کرنے کی اجازت دے گا... عشق کرنے کی عمر کے سارے کس بل تو ملازمت اور پھر شادی نے نکال دیے... جب عمر تھی اس وقت تم نے کیا تیر مار لیا تھا... بھولے بھٹکے کوئی جوان لڑکی سامنے آ جاتی تھی تو پسینے چھوٹ جاتے تھے۔

وہ زمانہ اور تھا... سب ایک دوسرے سے باخبر رہتے تھے۔ اسی لیے بدنامی کا خوف آدمی کو نزدل بنا دیتا تھا...

سنو زمانہ کبھی نہیں بدلتا... جز و موسم بدلیں زمانہ اپنی جگہ قائم و دائم ہے۔ ہاں لوگ بدلتے ہیں۔ ان کی ضرورتیں اور خواہشیں بدلتی ہیں... اور ضرورتوں کو پورا کرنے کے لیے طریقہ کار بدلتا ہے... فرض کرو... اب تمہیں اٹھارہ بیس سال کی لڑکی مل جائے تو کیا تمہارے ذہن میں اب یہ بات نہیں آئے گی کہ لوگ کیا کہیں گے...؟

نہیں۔ اب لوگوں کی سوچ بدل گئی ہے... اب کوئی ایک دوسرے کی خبر نہیں رکھتا... اپنے ہی چہرے کو دیکھنے سے فرصت نہیں ملتی ہے۔ اب تو بدنامی اور نیک نامی نے مل کر ایک اور نام اپنے لیے تجویز کر لیا ہے... شہرت... شہرت کے پیچھے اہلِ قلم سے لے کر اربابِ سیاست تک سب ہی بھاگ رہے ہیں۔ خاص طور سے وہ جنہوں نے کام کم کیا ہے اور تقریریں بہت... اور میں نہ تین میں نہ تیرہ میں... اسی لیے اب میرا جی چاہتا ہے عشق کروں... عمر بے عشق پر تاسف ہے... کچھ نہ کرنے کا بھی ملال ہوتا ہی ہے۔ اب اس کا تدارک کرنا چاہتا ہوں۔

کچھ میں نہیں آتا اس خیال پر ہنسا جائے یا رویا جائے... پہلی بات یہ ہے کہ تم اپنے بڑھاپے کا تزاحم کل رشتے داروں کی طرح قسمت کے دھنی تو ہو نہیں جو گھر بیٹھے بٹھائے کوئی کم سن خوبصورت لڑکی تمہارے پاس آ جائے اور کہے کہ تم میرے نخرے اٹھاؤ میں تمہارے چونچلے برداشت کروں... دراصل یہ بے تکے خیال اسی لیے آ رہے ہیں کہ گھر والی نے منہ نہیں لگایا۔

یار! اس کی یاد دلا کے موڈ خراب نہ کرو۔

تم اپنا موڈ خود خراب کرتے ہو۔ میں نے تو گزری باتیں یاد کرنے کے لیے اس وجہ سے کہا تھا کہ تم نے چار جوان بچوں کا باپ بننے تک کبھی تو اس کے ساتھ اچھا وقت گزارا ہو گا... کبھی اس نے تمہاری چاہت کا دم بھرا ہو گا۔ کبھی تم نے اپنی محبت کا اظہار کیا ہو گا... بجائے وہ باتیں یاد کرنے کے تم اپنے بڑھے رشتے دار کا قصہ لے بیٹھے۔

مطلوب نے موڑھے پر پہلو بدلا تو سامنے سے مالی آتا ہوا دکھائی دیا۔ مطلوب نے چارپائی سے پاؤں ہٹا کے جوتا پہنا اور اٹھنے کے لیے تیار ہو کر بیٹھ گیا۔

"حقہ بھروں صاب...؟" مالی نے قریب آ کے پوچھا۔

"نہیں... شکریہ میں تمباکو نہیں پیتا..." اتنا کہنے کے بعد گھڑی دیکھی گھر سے نکلے دو گھنٹے ہو چکے تھے۔

"صاب یہاں آس پاس ہی رہتے ہیں...؟"

"ہاں..."

"گھر میں بچے بوڑھے لگائے ہیں...؟"

”تھوڑے سے.... سنو... گلدستہ بنا سکتے ہو....؟“ بالکل ہی بے دھیانی میں پوچھ لیا۔

”کیوں نہیں صاب جی.... پانچ منٹ میں.... آج کل پھولوں کا موسم ہے.... پھر ایک اچھا سا گلدستہ بنا دو.... مگر ٹھہرو.... گلدستہ رہنے دو.... چلو بنا دو اور اس کے ساتھ موتیا کی کلیوں کے دو گجرے بھی....“

مالی نے حقے کی طرف بڑھنے والے ہاتھ روک لیے۔ چارپائی کے نیچے رکھا ہوا لکڑی کا بکسا کھینچا.... اُس میں سے ڈورے کا گولا اور سُوا نکال کے اس طرف چلا گیا جہاں طرح طرح کے پھول کھلے تھے۔

مالی کے جانے کے بعد مطلوب نے سوچا یہ میں نے کیا کیا....؟

بھئی اتنی دیر سے یہاں سائے میں خوشبو کے درمیان بیٹھے ہو.... کچھ تو قیمت ادا کرو۔

مگر یہ گلدستہ.... چلو ٹھیک ہے میرے کمرے میں برسوں سے جو ایک ماربل کا گلدان خالی پڑا ہے اس میں سجا دوں گا۔

کچھ یاد ہے وہ گلدان کون لایا تھا....

وہی لائی تھی.... اب یہ نہ پوچھنا کہ کب اور کیوں.... مجھے بالکل یاد نہیں ہے۔

اور یہ موتیوں کے گجرے....

بس بس بہت دیر اپنے آپ سے الجھ لیے.... اب خوامخواہ سوال جواب نہ کرو اور یہ سوچ کر جو باتیں آپ ہی آپ.... بغیر کسی ارادے کے ہو جائیں وہ ٹھیک ہوتی ہیں۔

مالی نے رنگ برنگے خوشبو بھرے پھولوں کا گلدستہ اور موتیا کی دودھیا کلیوں کا گجرا لا کے دیا۔

مطلوب نے قیمت پوچھی.... مالی نے کہا۔

”آپ نے بازار سے تو نہیں خریدا ہے جو دل چاہے دے دیجئے.... کبھی گھر پہ پیڑ پودوں کا کام ہو تو بلا لیجئے گا۔“

مطلوب نے قیمت ادا کی اور نرسری سے باہر نکلا....

اب کہاں جاؤ گے....؟

یہ گلدستہ لے کے کہاں جا سکتا ہوں....!

راستے بھر وہ ٹہل سا رہا.... کتنے غصے میں نکلا تھا اور....

مین گیٹ پر پہنچ کر گھنٹی بجائی.... گھر کا دروازہ کھلنے کی آواز آئی.... مطلوب نے ماتھے پر ابھر آنے والی پسینے کی بوندوں کو آستین میں جذب کیا.... قدموں کی چاپ قریب آتی رہی.... مطلوب نے غیر ارادی طور پر دونوں ہاتھ پیچھے کر لیے....

دروازہ کھلا.... سامنے زیر لب مسکراہٹ کے ساتھ.... اجلے کپڑوں اور ہلکے سے میک اپ میں وہ شرمائی لجائی سی موجود تھی۔

آگے کیا ہوگا؟!

انل ٹھکر (ممبئی، بھارت)

کبھی کبھی یہ کیا مشکل ہو جاتا ہے
پلنگ کے غلاف کی خوشبو مولوی صاحب کے جسم کو مہکا رہی ہے یا
مولوی صاحب کا بدن گرد و پیش کو معطر کر رہا ہے
مولوی صاحب کے لیے پلنگ خوابوں کو سینے کا گھونسلہ نہیں تھا۔ وہ ان کا اوڑھنا بچھونا بن گیا تھا۔ فجر کی نماز کے بعد جسمانی تقاضوں سے فارغ ہوتے ہی وہ پلنگ پر ایسے بیٹھ جاتے جیسے کوئی شہنشاہ جیسے اپنی گدی پر براجمان ہوتا ہے۔

پلنگ پر بیٹھتے ہی حسب معمول بیڑی سلگاتے۔ وہ چار کش کھینچتے تب تک ایک ایک، دو دو کر کے بچوں کے آنے کا سلسلہ شروع ہو جاتا۔ کچھ ہی دیر میں بچوں کی تتلی جیسی بچوں سے دالان چھلکنے لگتا۔ پڑھائی شروع ہوتی۔ کسی کو ڈانٹ کر، کسی کے کان اینٹھ کر تو کسی کو چٹکی لے کر وہ ان کے علم کی نوک پلک درست کرتے۔ وقت ضرورت سخت مٹی کی پکڑ ڈھیلی کرنے کے لیے چانٹا بھی رسید کر دیتے ان کے ہاتھوں کے نیچے تعلیم لے کر طلبہ کہاں سے کہاں پہنچ گئے ہیں۔ کئی بیرونی ممالک میں نام اور پیسہ کما رہے ہیں۔ بڑے بڑے سرکاری عہدوں پر گاؤں کا نام روشن کر رہے ہیں۔ طلبہ کے نام گنانے بیٹھیں تو لمبی فہرست بن سکتی ہے۔ دور دور اطراف میں کتنے پروفیسر اور لیکچرار ہیں جنہوں نے ان کی رائے مشورے اور نگرانی میں مقالے لکھ کر ایم۔ اے، ایم۔ فل اور پی۔ ایچ۔ ڈی کی ڈگریاں لے کر تدریس کے کام میں لگے ہوئے ہیں۔ دور دراز کے اپنے چھوٹے سے گاؤں رحیم پیٹ کو تو انہوں نے اپنے رفقاء کے ساتھ مل کر ادب کا زرخیز فارم بنا رکھا ہے۔ جہاں اردو اور کچھ زبان کے نو وارد ادبا اور شعرا ہر سو چہکتے نظر آتے ہیں۔ وقتاً فوقتاً اطراف کے پہاڑوں کی چٹانیں غالب و اقبال کو خوبصورت ترنم سے کے بول گنگناتی ہوئی محسوس ہوتی ہیں۔ گاؤں میں شاید ہی ایسا کوئی خاندان ہوگا جس میں کم از کم ایک فرد ان کا شاگرد نہ رہا ہو۔ علم بانٹنے کے کام کو وہ عبادت کا درجہ دیتے ہیں۔ پوری زندگی انہوں نے اسی عبادت سے ثواب کمایا ہے۔ بہتر ین تعلیم کے ساتھ رحیم پیٹ کو ترجیح دے کر انہوں نے اپنے وطن کی ایک تہذیبی پہچان بنائی ہے۔

کچھ سال پہلے وہ رحیم پیٹ کے مڈل اسکول سے بحیثیت ہیڈ ماسٹر ملازمت سے سبکدوش ہوئے ہیں۔ ان کی برسوں کی ملازمت کے دوران کتنی سرکار یں بدلیں۔ محکمے کے کتنے افسران تبدیل ہوئے۔ اسکول کے اساتذہ کے تبادلے ہوتے رہے مگر ان کا تبادلہ کبھی نہیں ہوا۔ جب جب بھی کسی افسر نے اس کی کوشش کرنا چاہی تو گاؤں والوں نے اپنے رسوخ کی دیوار کھڑی کر دی۔ پھر بھی تبادلوں کے موسم میں افواہیں ہوا سے اس رسوخ کی دیوار کے سائے میں بھی مولوی صاحب کبوتر کے بچے کی طرح کپکپی محسوس کرتے۔ تبادلے کے خوف کا بخار ان پر چڑھنے لگتا کیا بھی ضروری کام، ادبی اجلاس یا مشاعرہ ہوتا تو بھی گاؤں چھوڑ کر نہ جاتے اور گھبراتے رہتے کہ نہ جانے کس ان جان علاقہ میں انھیں پھینک دیا جائے گا۔

بچوں کی خانگی تعلیم کا دور ڈیڑھ دو گھنٹے چلتا۔ ان میں کچھ قریب و دور کے رشتے داروں کے بچے ہوتے۔ کچھ حلقۂ احباب کے تو کچھ دعا سلام کرنے والوں کے۔ ان سب کا مفت کے خانے میں شمار ہوتا تھا۔ چند بڑے گھروں کے بچے بھی آتے تھے۔ ان سے فیس کی رقم تب دستیاب ہوتی جب ان کے والدین کو اس کی یاد آتی۔

خانگی تعلیم کا دور ختم ہوتے ہی مولوی صاحب بیڑی جلا کر کسی کتاب یا رسالے کا مطالعہ شروع کرتے یا کوئی نظم، غزل لکھتے۔ تھوڑے وقفے کے بعد ناشتہ لیتے اور بیڑی یا چائے کی محبت سے ذہن و جاں کو تر و تازہ کرتے رہتے۔ ظہر کے وقت پلنگ سے اتر کر پڑھے ہوئے یا لکھے ہوئے موضوع کی جگالی کرتے ہوئے بڑی مسجد کے لیے نکل پڑتے۔

آج انھیں پڑھنے لکھنے کا موقع نصیب نہیں ہوا۔ بچوں کے رخصت ہوتے ہی مولوی صاحب "جامعہ" کا خصوصی شمارہ جو اختر کی سوانح، شخصیت اور شاعری پر مشتمل تھا پڑھنے کی جستجو میں تھے کہ باغبان اللہ بخش اپنے فرزند کے ساتھ لڑکوں کی طرح سینہ تانے سلام کی بانگ دیتے ہوئے داخل ہوا۔

السلام علیکم منظور احمد صاحب!

شعبہ تعلیم میں چند ہی گنے چنے فرد تھے جو مولوی صاحب کو ان کے نام سے مخاطب ہوتے تھے۔ ان میں سے کچھ کو لنگوٹیا یار ہونے کا شرف حاصل تھا۔ تو چند لوگ پیسوں کی گرمی سے اپنائیت کا وہم اوڑھے ہوئے تھے۔ باغبان اللہ بخش نے اطراف کی پہاڑیوں پر پیدا ہونے والے سیتا پھل کے کاروبار سے پیسا کما کر یہ وہم پال رکھا تھا۔ ویسے وہ دو سال مولوی صاحب کا شاگرد بھی رہ چکا ہے۔

کم گو مولوی صاحب نے دھیمی آواز میں سلام کا جواب دے کر اشارے سے بیٹھنے کو کہا۔ اللہ بخش مسکراتے ہوئے بیٹھا۔ اس کے ساتھ بیٹا بھی دھڑلے سے باپ کی بغل میں بیٹھ گیا۔ یہ دیکھ کر مولوی صاحب نے کراہت کے ساتھ اللہ کو یاد کیا..... سوچا آج کی نسل کس سمت میں گامزن ہے!! نہ باپ کا لحاظ نہ معلم کا پاس۔ ہم نے کبھی والد کے پاس بیٹھنا تو در کنار ان کی موجودگی میں بیٹھنے کا حوصلہ بھی نہیں کیا۔ ہمیشہ ہاتھ باندھے ادب سے کھڑے رہے اور آج.....

اللہ بخش دو چار لمحے انتظار کرتا رہا کہ مولوی صاحب آنے کا سبب پوچھیں گے۔ جب دیکھا وہ خیالوں میں کھوئے ہوئے ہیں تو بولا.....

وضو ہے نا؟.....وہ آپ کا.......

مولوی صاحب کی بھویں اوپر اٹھیں تو آنکھوں اور چہرے پر سوالیہ نشان ابھر آیا۔

وہی..... وہی ’وہ نامعقول۔ دھوتی‘ کرتا پہن کر گھومتا ہے کیا نام ہے اس کا؟.....

پربھاکر راو..... بیٹے نے اپنے علم کا مظاہرہ کرتے ہوئے جھٹ سے کہا۔

کیا ہے اُتّا؟....... مولوی صاحب کے سوال میں تلخی تھی۔

اس نے مجھے.......

مولوی صاحب نے ہاتھ کے اشارے سے اسے روکا اور کہا.....

جواب دیتا ہے تو اٹھ کر کھڑے رہو۔ ادب سے بات کرو۔ کیا بڑوں سے بات کرنے کی تمیز تمہیں نہیں سکھائی گئی!؟

لڑکا سٹپٹا کر اُٹھ کھڑا ہوا۔ اللہ بخش کو مولوی صاحب کا طرزِ عمل ناگوار گزرا۔

اب بتاؤ کیا بات ہے؟..... مولوی صاحب نے پوچھا۔

اس نے مجھے.....

اس نے نہیں۔ انہوں نے کہو۔ وہ تمہارے استاد ہیں۔

انہوں نے مجھے تھپڑ مارا۔

خیر بیماری کے ڈاکٹر کسی کو دوا نہیں دیتا۔

بات لڑکے کے سر سے گزر گئی۔ وہ بیوقوفوں کی طرح تکتا کھڑا رہا مگر اللہ بخش تلملا گیا۔ وہ طیش میں آ کر بولا۔

آپ بھی غضب کرتے ہیں!

میں نے کچھ غلط کہا؟ اس نے سبق یاد نہیں کیا ہوگا یا شرارت کی ہوگی۔

اس کا مطلب یہ تو نہیں کہ وہ میرے بچے پر ہاتھ اٹھائے۔

آپ کا بیٹا ان کا شاگرد ہے۔ والد اور ولد سا رشتہ ہے ان میں۔

شاگرد ہے تو اسے پڑھائے، سکھائے، سمجھائے۔ سرکار اسے تنخواہ پڑھانے کے لئے دیتی ہے پٹائی کے لئے نہیں۔

پھر آپ میرے پاس کیوں آئے؟ سرکار کے پاس جائیے۔

اللہ بخش کا چہرہ سُرخ ہو گیا۔

آپ کو اپنا سمجھ کر آئے تھے آپ تو الٹا اس کافر کی طرفداری کر رہے ہیں!!

مولوی صاحب کے چہرے پر جگنو کی طرح تیر اٹھا کر دل میں اتر گئی۔ ان کا جی چاہا اللہ بخش کو گھر سے نکال دیں۔ انہوں نے پاؤں پلنگ سے نیچے لیے۔ اللہ بخش یہ کہتے ہوئے اُٹھا۔

ایک مسلمان بچے کو اس کافر نے تھپڑ مارا۔ یہ سن کر بھی آپ کے چہرے پر شکن تک نہیں پڑی! واہ.....

اللہ بخش نے اپنے بیٹے کو دھکیلا.....

چل اب سمجھ آیا ہے۔ یہ گھی سیدھی انگلی سے نکلے گا نہیں۔ اس کافر کا تبادلہ ایسی جگہ پر کرواؤں گا کہ بچو کو پانی بھی پینا ہے تو چار کوس چلنا پڑے گا۔

مولوی صاحب کا پارہ سر سے زبان پر آئے اس سے پہلے اللہ بخش بیٹے کے ساتھ دہلیز پار کر چکا تھا۔

مولوی صاحب غصہ اُگل سکے نہ تھوک سکے۔ انہیں غصہ پی جانا پڑا۔ جس سے ان کی طبیعت میں ابال پیدا ہو گیا۔ انہیں پلنگ پر چین آیا نہ دالان میں رکھی کرسی پر۔ کہیں کسی کروٹ قرار نہیں آیا۔ وہ سوچنے لگے..... میں نے اسی اللہ بخش کو تو قصبے کے بس سٹینڈ پر سیتا پھل بیچتے ہوئے دیکھا ہے۔ پھر وہ باغات کا ٹھیکیدار بنا۔ لاریوں میں پھلوں کی لدائی شہروں کو کرنے لگا۔ اب دو نمبر کے پیسوں کے ساتھ یہ دوسروں کی تہذیب کا ٹھیکیدار بن کر آ گیا ہے.....

انہوں نے کپڑے بدلے اور گھر سے نکل پڑے۔

دس بیس دکانوں پر مشتمل بازار سے مولوی صاحب کو بے نیاز گزرتے دیکھ کر ان کے دوست نما شاگرد جوہر نے اپنی ہوٹل میں چائے پلاتے ہوئے انہیں چائے کی دعوت دی۔ چائے پینے کی طلب تو تھی۔ سو انہیں بنا۔ ”آتا ہوں“ کہتے ہوئے وہ آگے بڑھ گئے۔ وہ کہاں ’کس طرف‘ کیوں جا رہے ہیں؟ اس کی انہیں خود کو خبر نہیں تھی۔ ان کی روح بے چین تھی۔ ذہن میں لاوا اُبل رہا تھا۔ رگیں خون کے دباؤ سے پھول رہی تھیں۔ پربھاکر راو ان کے رفیقِ دیرینہ رہ چکے تھے۔ آج بھی یاری ہے۔ اساتذہ اور طلبہ کے لیے ان کے کئے کاموں کے ریاست بھر میں چرچے ہیں۔ ایسے معلم کے لیے اللہ بخش جیسے.....

وہ بائیں جانب کی گلی میں مڑ گئے۔ کوچے کے دو چار موڑ پار کر کے وہ یوسفیہ میدان پہنچے۔ اس میدان کا رحیم پیٹ کے ساتھ دل اور دھڑکن کا رشتہ ہے۔ جمعہ کو یہاں بازار لگتا ہے۔ میلا سا لگا رہتا ہے۔ مشاعروں اور کوی سمیلنوں کے سٹیج یہاں سجتے ہیں۔ مذہبی اجلاس کے شامیانے یہیں گاڑے جاتے ہیں۔ چناؤ کے موسم میں چھوٹے بڑے لیڈر ووٹ کے لیے یہیں ہاتھ پھیلاتے ہیں۔ آج میدان ویران تھا۔ دھوپ میں تپتی ریت چمک رہی تھی۔ میدان کے کنارے یوسفیہ مسجد اور اس کے سامنے حضرت یوسف کا مزار بڑا دلکش نظارہ تھا مگر مولوی صاحب کی نظر کو آج یہ نظارہ اپنی جانب راغب نہ کر سکا۔ وہ مزار پر پہنچے۔

حضرت یوسف رحیم پیٹ میں حکومتِ نظام کے اسکول میں سب سے پہلے معلم تھے۔ ایک ایسے معلم جنہوں نے اس بنجر و پتھریلے خطے میں اساتذہ کی ایک ایسی نسل تیار کر دی کہ علاقہ علم سے زرخیز ہو گیا۔ حضرت یوسف نے تعلیم کے لیے اپنی زندگی وقف کر دی۔ وہ جب اللہ کو پیارے ہوئے تو ہر قوم کے لوگوں نے مل کر ان کا مزار بنوایا۔ ان کے نام سے ایک مسجد کی تعمیر ہوئی۔ بھائی چارے

سے لبریز ہوتی اس بستی میں آج اللہ بخش جیسے لوگ آباد ہونے لگے ہیں.....
ارے جس بستی کے مغرب کی اونچی پہاڑی پر عیدگاہ ہے۔ جس کی مخالف سمت مشرق میں ایک اونچے ٹیلے پر حضرت محبوب سبحانی کا چلہ ہے جانب شمال حضرت یوسف کا مزار اور جنوب میں پہاڑ اور سڑک کے درمیان میں پربھودو صاحب کی آخری آرام گاہ ہے لیکن بستی میں برائی داخل ہونا بھی چاہے تو کس سمت سے داخل ہو سکتی ہے؟

قومی یکجہتی کے اس امرت منتھن میں مولوی صاحب کے ذہن میں حضرت یوسف کے شاگرد اور اپنے استاد پربھودو صاحب کی یاد تازہ ہو آئی۔ عقیدت کے غلبے سے ان کی آنکھیں بھاری ہو گئیں۔ حضرت کی مزار سے اجازت چاہی۔ میدان پار کیا اور پہاڑ سے اترتی سڑک کی طرف نکل دیئے۔

سڑک سے لگے اپنے اسکول کے پیچھے سے وہ گزر رہے تھے تو لاشعوری طور پر ان کے پاؤں ٹھٹک گئے۔ وہ سوچنے لگے... کیا وقت کا پھیر ہے!! میں اسی اسکول میں پڑھا اسی میں پڑھایا اور آج ہاتھ سے پھسلتے وقت کی طرح اسے سوچ رہا ہوں.....

انہوں نے نظریں اٹھائیں تو نظریں پہاڑ اور سڑک کے درمیان خاموش کھڑی سادھی پر ٹک گئیں۔ انہیں یاد آیا..... وہ ساتویں جماعت کے طالب علم تھے۔ ایک نئے استاد پربھودو صاحب اردو کا پیریڈ لینے پہنچے تو ہر طالب علم کا مختصر تعارف جاننا چاہا تھا کچھ دیر بعد محمد یٰسین کی باری آئی تو اس کا نام سن کر چونکے اور پوچھا.....

کیا نام بتایا؟

محمد یٰسین۔

واہ قرآن کا دل..... آپ میں سے جو سورۂ یٰسین جانتے ہیں وہ ہاتھ اوپر کریں۔

دو چار طلبہ نے ہاتھ اٹھائے۔

وہی لوگ ہاتھ اوپر رکھیں جنہیں مکمل سورہ ازبر ہے۔

ایک ایک کر کے سب ہاتھ نیچے آ گئے۔

ٹھیک ہے آج میں سورۂ یٰسین کی تلاوت شروع کروں گا آپ کے ساتھ غور سے سنیئے۔

موصوف نے اتنا طویل سورہ صحیح تلفظ کے ساتھ کچھ اس انداز سے زبانی سنا دیا کہ طلبہ گنگ باادب سنتے رہے تھے۔ گھنٹی بجی پیریڈ ختم ہو گیا..... دوسرے اور تیسرے دن اسی پیریڈ میں سورۂ یٰسین کی جو تفسیر پیش کی وہ آج بھی دل و دماغ میں محفوظ ہے.....

ایک تیز رفتار بس نے یادوں کا سلسلہ توڑ دیا۔

سڑک سے کنارا کشی کرتے ہوئے مولوی صاحب دبے پاؤں سادھی کے سامنے پہنچے۔ انہوں نے پوری چوکسی برتی کہ کہیں ہلکی سی چاپ سے بھی سادھی میں آخری نیند سوئے ان کے استاد پربھودو صاحب کے سکون میں خلل نہ پہنچے۔ وہ دل ہی دل میں ان سے مخاطب ہونا چاہتے تھے، سادھی کے پیچھے سے دھوپ کی لکیری اٹھتی دیکھی۔ وہ کچھ سوچیں اس سے قبل کسی کو کہتے سنا.....

بچھڑوں سے مل بھی.....

وہ چونکے کہ آواز سنی ہوئی محسوس ہوئی۔ جوابا دوسرا جملہ اچھالا

تمہیں بے سوچے دے سکا یا نہیں؟

دھوپ کے مرغولے اوپر اٹھے اور ہوا میں تحلیل ہو گئے۔ تبھی تیسرا بولا۔

تم دونوں کھیلنے کم اور جھگڑتے زیادہ ہو۔

مولوی صاحب آہستہ سے دوسری جانب گئے۔ وہاں تین لڑکے جو کھیل رہے تھے۔ ان کو دیکھا تو کھڑے ہو گئے۔ دو بھاگ گئے تیسرا حواس باختہ کھڑا رہا۔ وہ ہاتھ جوڑے لرز رہا تھا۔

اللہ بخش کے بچے کو دیکھ کر مولوی صاحب کو گھِن سی ہوئی۔ کہا.....

پرہلاد ہوتے غلطی کی ہوتی تو تھپڑ کے لائق بھی نہیں ہے

وہ سر جھکائے چل دیا۔

مولوی صاحب دل برداشتہ ہو کر غم کے چبوترے پر بیٹھ گئے۔ وہ نظریں باندھے سادھی کو تکتے رہے۔ انہیں یاد آیا..... پربھودو صاحب نے ایک مرتبہ انہیں بھی تھپڑ مارا تھا۔ وہ پورا واقعہ ان ہی کی آنکھوں میں دہرانے لگے.....

ان دنوں انہوں نے طلبہ سے اچھی تحریر لکھوانے کا ایک تجربہ شروع کیا تھا۔ روزانہ ایک لفظ دیتے۔ جس کو جملے میں استعمال کر کے دوسرے روز سبھی کلاس میں پڑھ کر سنانا پڑتا تھا۔

اس روز پڑھنے کا جب میرا نمبر آیا تو میں نے ان کی کرسی کے قریب تحریر کردہ جملہ پڑھا۔ جس میں لفظ "گال" کو استعمال کیا تھا۔

میرے جملے پر ان کا ردعمل میں دیکھ نہ سکا البتہ سامنے بیٹھے طلبہ کی نظروں کو میری پیٹھ گھورتے دیکھ کر میں نے فخر محسوس کیا۔

دوبارہ پڑھو..... پربھودو صاحب نے فرمان جاری کیا۔

میں نے سینہ تان کر طلبہ کو دیکھا اور جملہ پڑھا۔

مکرر..... موصوف نے کرسی سے اٹھ کر کہا۔

لفظ مکرر کی لذت سے میں واقف تھا۔ بزم بہار میں گاہے گاہے مشاعرہ ہوتا تھا۔ اچھے شعر پر سامعین کو مکرر کہتے میں نے سنا تھا۔ میرے محترم استاد نے مکرر کہا تو میری باچھیں کھل گئیں۔ میں نے شاعرانہ انداز میں طلبہ کو آداب کیا۔ پھر موصوف کی جانب جھک جھک کر آداب کی جھڑی لگا دی۔ گلا صاف کیا۔ جملہ دہرایا......

جملہ مکمل ہوتے ہوتے میرے گال پر زوردار تھپڑ پڑا۔ بجلی کے کڑاکے جیسی آواز کانوں سے ہوتی ہوئی میرے دماغ کو ہلا گئی۔ آنکھوں میں اندھیرا اتر آیا۔ کیا ہوا؟ کیوں ہوا؟ سوالیہ نشان بن کر رقص کرنے لگے۔

بینائی لوٹی تو دیکھا استاد جا چکے تھے۔ کلاس میں اداسی تھی۔ طلبہ سکتے میں

آگئے اور عجیب نظروں سے مجھے دیکھنے لگے۔ میری آنکھوں کا بند ٹوٹ گیا۔ آنسو کی باڑھ آ گئی۔ سارے دوست دلاسا دینے لگے۔ مجھے نشست پر بٹھلایا۔ تسلی دینے کے لیے ان کے پاس دو باتیں ہی تھیں۔ کیوں رو رہے ہو؟ روؤ مت۔ اس سے زیادہ کہنے کو ان کے پاس کچھ نہیں تھا۔ جو کچھ ہوا تھا سب کی سمجھ سے باہر تھا۔ ان کی ہمدردی مجھے اور جذباتی بنا رہی تھی۔

میری سسکیاں تھمی بھی نہیں تھیں کہ ہیڈ ماسٹر صاحب کا بلاوا آ گیا۔ مجھے یقین ہو گیا میری اصلی پٹائی تو اب ہوگی۔ میرا رواں کھڑا ہو گیا۔ چپراسی نے میری بانہہ پکڑی۔ میرے پاؤں تھرتھرانے لگے۔ وہ مجھے یوں کھینچنے لگا جیسے بکرے کو ذبح کرنے کے لیے قصاب کے پاس لے جایا جا رہا ہو۔

میں ہچکیاں لیتے ہوئے ہیڈ ماسٹر صاحب کے روبرو حاضر ہوا۔ پروفیسر صاحب دروازہ کی جانب پیٹھ کیے ہوئے بیٹھے تھے۔ میں ان کے پیچھے تھا۔ ہیڈ ماسٹر نے انگلی کے اشارے سے قریب آنے کو کہا۔ میں سسک سسک کر رونے لگا۔

یہاں میرے قریب آؤ۔

ان کی آواز میں نرمی تھی۔ میں رکتا ہوا ان کے پاس گیا۔ انہوں نے میرا ہاتھ تھام کر اپنے قریب لیا۔ میری پیٹھ پر شفقت سے ہاتھ پھیر کر بولے......

یہ تم نے لکھا ہے؟

میں نے دیکھا میری کاپی ان کی میز پر کھلی پڑی تھی۔

ان کے پیار بھرے لمس سے مجھ میں ہمت آ گئی۔ میں نے اثبات میں سر ہلایا۔

پڑھ کر سناؤ۔

ایک بار پھر گھبراہٹ مجھ پر حاوی ہو گئی۔ میں نے بہتی ہوئی ناک کو آستین سے پونچھا۔

گھبراؤ نہیں۔ کاپی اٹھاؤ۔

میں آہستہ سے آگے بڑھا۔ کاپی اٹھائی۔ ذرا ہمت کر کے ان سے دور ٹھہر گیا۔ اب میں اچانک پڑنے والے تھپڑ سے چوکنا تھا۔

کون سا لفظ دیا گیا تھا تمہیں؟

گال...... میری آواز میں لرزش تھی۔

اچھا تو اب جملہ سناؤ۔

میں نے ایک نظر پروفیسر صاحب کی جانب دیکھا۔ ان کی نظریں خلا میں جمی ہوئی تھیں مگر کان میری آواز کی جانب لگے ہوئے تھے۔ میں نے پڑھا......

"ممتاز کی محبت میں بہتے ہوئے شاہجہاں کے آنسو ہندوستان کے گال پر تاج محل بن کر رہ گئے۔"

خاموشی چھا گئی۔

ہر لحہ مجھ پر بار گزرنے لگا۔ ہیڈ ماسٹر کی کسی بھی حرکت پر بھاگ نکلنے کے لیے میں ایک پاؤں پر کھڑا تھا۔

یہ تم نے کیسے لکھا؟

میں خاموش رہا۔ شاید میری خاموشی کا سبب وہ جان گئے۔

میرا مطلب ہے...... یہ خیال تمہیں کیسے آیا؟

اب تک میرا حوصلہ قائم ہو چکا تھا۔ میں نے ان کی جانب رخ کیا اور کہا......

جناب سب کچھ کتاب میں ہی تو لکھا ہوا ہے...... شہنشاہ شاہجہاں نے اپنی ملکہ ممتاز کی یاد میں تاج محل بنایا۔ ممتاز کی موت پر آنسو بہائے...... یہی کچھ تو سبق میں ہے۔ میں نے تو صرف حضرت کے دیے ہوئے لفظ گال کو ہندوستان تصور کیا ہے۔

میری بات مکمل ہوتے ہی سناٹا طاری ہو گیا۔

سناٹا ٹوٹا۔

واہ بہت خوب! مبارک باد۔ تمہاری تشریح نے گواہی دے دی ہے کہ یہ جملہ تم نے ہی لکھا ہے۔ واقعی یہ تمہارا ہی جملہ ہے۔ واہ......

اچانک پروفیسر صاحب فیصلہ کن انداز میں اُٹھے۔ میرے سر پر ہاتھ رکھا۔ سہلایا اور مجھے اپنے ساتھ لے کر کلاس روم میں آئے۔ خوف زدہ طلبہ کھڑے ہو گئے۔ انہیں بیٹھنے کا اشارہ کر کے دل پر دردآواز میں بولے......

منظور احمد کا جملہ سن کر میں نے سمجھا یہ اس کا لکھا ہوا نہیں ہے۔ یہ اس نے اپنے والد سے لکھوایا ہے اور اپنے استاد سے جھوٹ بول رہا ہے۔ ہیڈ ماسٹر صاحب کی تحقیق سے اب مجھے یقین ہو گیا ہے۔ یہ بہترین تحریر منظور احمد کی ہی ہے۔ وہ چپ سادھ گئے۔ طلبہ کے چہرے خوشی سے چمک اُٹھے۔ مجھے مسرت ہوئی۔

وہ رنجیدہ خاطر بولے......

میں بھی انسان ہوں۔ منظور احمد کو سمجھنے میں میں نے غلطی کی۔ مجھے اس کا ملال ہے مگر میں پورے وثوق کے ساتھ کہہ سکتا ہوں یہ بڑا ہو کر شاعر، ادیب یا ایک بہترین معلم بنے گا۔

قریب کھڑے کولل کو کی ہوئی اُڑ گئی۔ غم کے نجوڑے پر بیٹھے منظور احمد صاحب کا طلسم ٹوٹا۔ ان کی پلکوں پر دو قطرے اشک کے یوں رکے ہوئے تھے جیسے دو معصوم بالٹیر پر کھڑے کسی کا انتظار کر رہے ہوں۔

مولوی صاحب نے اپنا گال سہلایا اور ساڑھی کی جانب دیکھ کر سرگوشی کے انداز میں بولے......

قبلہ! ایک تھپڑ نے مجھے کہاں سے کہاں پہنچا دیا۔ مگر فلہ بخش جیسے والدین کے ڈرانے دھمکانے سے اگر اساتذہ طلبہ کا کان دھنسنا تھپڑ مارنا چھوڑ دیں گے تو طلبہ کے مستقبل کا کیا ہوگا!

☆

سانپ

شمشاد احمد

زلزلے کے ایک شدید جھٹکے سے درخت کا کھوکھلا تنا جڑوں تک ہل گیا۔

احساس کا بچھو ڈنک مارنے لگا۔

ماہ و سال کے زرد پتے بے آواز گرتے چلے گئے تھے..... نیچے پیروں میں انبار جمع تھے اور اوپر نیم جان ٹہنیوں پر کچھ بھی نہ تھا۔

جب ہسپتال والوں نے فارغ کیا تو میں میں نہیں تھا میرا سایہ رہ گیا تھا۔

مستقبل اپنی بساط لپیٹ کر روپوش ہو گیا..... اور دھند میں سوئے ماضی کے شہر میں اچانک سینکڑوں شمعیں تمام روشن ہونے لگیں۔

میں اپنے سایے کو سنبھالے ہوئے واپس گاؤں لے آیا۔

یہاں بھی اندھے ایک دوسرے کو ڈستے سانپوں کی پھنکاریں سنائی دے رہی تھیں..... لیکن ابھی زہر رگوں میں نہ اترا تھا..... اگر کسی آشنا سے اچانک سامنا ہو جاتا تو وہ رک کر کسی جلدی کے باعث "پھر ملیں گے" کہہ کر چل دیتا تھا۔

بیچ آ چکے تھے، وہی موجود تھا، ویسی لڑکے اور گھر کا عکس سامنے رکھا تھا..... نجانے کتنا شتے ہوئی نہ سکے تھے۔ اتنی جلدی اس پر سر کے تاؤ کو ایک طرف پھینک کر کچی مٹی کا شیر کیا..... بچانے کو رہ گیا تھا!

میٹھا میٹھا سورج دیکھتے ہوئے میں اچھا لگ رہا تھا۔

بچے اسکول جا چکے تھے..... سب سے بڑا بھتیجا اختر کے امتحان کے بعد فارغ تھا اور میرے ساتھ گروہ بنا رہا تھا۔

"چلیے تایا ابو اوپر چھت پر چلتے ہیں۔"

کھلی چھت پر کھجور کے بوڑھے موجود تھے، ساتھ میں بان کی ایک چارپائی بچھی تھی۔

میں ایک بوڑھے پر نیم دراز ہو کر آسمان کو دیکھنے لگا۔

سلیمان اس دوران برساتی میں جا گھسا تھا..... وہ باہر آیا تو اس کے ہاتھوں میں گتوں کا خاصا بڑا اٹھا تھا۔

اس نے گٹھا میرے سامنے پھینکا اور جوانی کے ایک ہی جارحانہ جھٹکے سے اس کی بندش توڑ دی۔

میرے بچے کچھے بوڑھے دانتوں نے حیرانی کا اظہار کیا۔

"یار..... عام کھانے کی چیزیں بھی سنبھل سنبھل چباتے ہیں کہ کوئی کمزور دانت ساتھ ہی اندر نہ چلا جائے"

گھاؤ عام گہرے نہ تھے..... پورے تھے..... زخم اتنے زخم کرید رہا

چھینٹا اچھلا کا اٹک..... اور زرد رنگ شامل ہوئے تو رس ٹپ ٹپ کپڑوں پر......

سلیمان چلاگیں مارتا نیچے چلا گیا......

میں نے ایک گنا لیا اور ڈرتے ڈرتے دانت آزمائے......

اندازہ ہوا کہ کام چل جائے گا۔

سلیمان نمکی چھری کے ہمراہ سیڑھیوں کے دروازے پر نمودار ہوا......

مجھے مزے سے رس کی گنڈیریاں لیتے دیکھ کر ہنسنے لگا۔

"میں چھری لایا تھا کہ آپ کو گنڈیریاں بنا دوں۔"

وہ میرے قریب ہی بیٹھ گیا اور جوانی کی دلکش رعنائی سے گنے کو اُدھیڑنے لگا۔

میں اُسے ندیدہ نظروں سے دیکھ رہا تھا..... اس کی ڈھیلی ڈھالی قمیص کے اندر بازوؤں کے پٹھے تڑپ رہے تھے۔ میں اس کے جسم، اس کے قد و قامت، اس کے ڈیل ڈول میں میں اپنے آپ کو ٹٹول رہا تھا۔

ہم زندگی سے ہٹ کر اِدھر اُدھر کی غیر اہم اور ہلکی پھلکی باتیں کر رہے تھے۔

اچانک اس کی آنکھوں میں ذہن سے اتری کوئی یاد چمکنے لگی......

وہ بغیر کچھ کہے سُنے اٹھا اور ایک بار پھر برساتی میں گھس گیا۔

میرے اندر زندگی اتر رہی تھی..... موت کے بوجھ میں کچھ کمی آ گئی تھی۔

سلیمان میرے سامنے آن کھڑا ہوا..... اس کی آنکھوں میں اچھلتی کودتی شرارت سنبھالے نہ سنبھل رہی تھی۔

اس کے ہاتھ میں بانس کی ایک چھڑی تھی جو وہ اُسے معنی خیز انداز میں گھما پھرا رہا تھا..... کوئی چار ساڑھے چار فٹ کا بے ڈھنگا ٹکڑا..... تین بوڑھے جو گھیے کے مرض میں مبتلا تھے..... ہر بوڑھے شخص آگ کی طرح جاتی جسم سے خاصا بڑا......

میں سلیمان کی بجائے اب اس چھڑی کو گھور رہا تھا۔

'دیکھو بھلا اس کو کیا ہو گیا ہے'

'کوئی بات ضرور ہے'

پھر اچانک ایک پرانا بوسیدہ دروازہ چرچرانے لگا۔

ہر طرف آگ اور دھواں تھا..... لاشیں تھیں، خون تھا...... آہیں تھیں۔

ہندوستان کی تقسیم کا اعلان ہو چکا تھا..... دونوں طرف آزادی کا خونی جشن منایا جا رہا تھا۔

گھر والوں نے بچوں پر سخت پابندی لگا رکھی تھی..... انہیں کچھ اصل، کچھ من گھڑت قصے سنا سنا کر باور کرا دیا گیا تھا کہ اِدھر باہر نکلے اور گئے جان سے......

کچھ کچھ بنا تا تھا' کبھی کچھ تھوڑا کچھ بھی آنے لگتا تھا۔
دو چار دن خوف نے جکڑے رکھا..... پھر گھر کاٹنے لگا۔
بڑا ہونے کے ساتھ ساتھ میں نے بغاوت کا جھنڈا لہرا دیا۔
"اگر باہر نہیں جا سکتے تو چھت پر تو جایا جا سکتا ہے"
اُن دنوں انسان کشی کے ہتھیار نسبتاً زیادہ مہذب تھے' چاقو'
چھری..... بہت ہوا تو کلہاڑی..... گولیوں کا دور ابھی خاصا دور تھا۔
والدہ بہت کمزور ہونا محسوس کر رہی تھیں..... انہوں نے تھوڑی
ڈھیل دے دی۔
اجازت ملتے ہی میں دھڑ دھڑ سیڑھیاں روندتا چھت پر تھا۔
میں کئی دنوں کا ترسا تھا..... منڈیر پر جھک کر باہر چلتی سڑک کو
دیکھنے لگا۔
جو لگنے کا تھا لُٹ چکا تھا..... چھوٹا موٹا بچا کھچا مال رہ گیا تھا.....
مٹی کے برتن ٹوٹے' ادھ جلے دروازے' لکڑیاں وہی چلے آ رہے تھے۔
اچانک ایک طرف سے کچھ شور شرابا آیا..... میں اس طرح
بلند..... بدروؤں کی پلیا پر جمع لونڈے لپاڑے سیٹیاں بجا بجا کر خوشی کا اظہار کر رہے
تھے۔
میں تھوڑا اور جھکا..... میرے عین نیچے ایک ادھ منہ کھلی بوری
رینگ رہی تھی..... اس میں سے گڑ کی ڈلیاں جھانک رہی تھیں..... بوری
کے ایک کونے سے دھواں سا اٹھ رہا تھا۔
اس شور شرابے کی سمجھ آ گئی۔
بوری نیچے گری اور چاچا معراج دین اپنا پوپلا منہ کھول کر ہنستا
ہوا نظر آیا۔
اس نے بوری کے سلگتے کونے کو گڑ کی ڈلی نکال کر گڑ اتار تے ہوئے بیتوں
کی طرف سیدھا ہو کر ہاتھ سے ایک فحش اشارہ کیا..... پھر بوری گھسیٹ کر گرد
ڈالی اور چل پڑا۔
بڑھتے ہوئے ہجوم کی تالیوں' سیٹیوں اور ہنگڑے میں اضافہ ہو
گیا۔
چھت تنگ پڑنے لگی..... صبر کا پیمانہ لبریز ہو کر بہنے لگا۔
میں بلی کے پاؤں نیچے اترا' ڈیوڑھی میں سانس روک کر والدہ کی خبر
سونگھی اور پھر پنجوں کے بل تیز تیز چل کر کنڈی سرکائی اور باہر پھسل لیا۔
ادھر کی گلی خالی تھی..... دور دور تک کہیں کوئی کتا بلی تک نہ تھا۔
تھوڑی دیر تذبذب میں خالی ذہن وہیں کھڑا رہا..... گلی میں
اترنے کی ہمت نہ ہو رہی تھی۔
اچانک دائیں طرف سے ایک چٹاخا آواز سنائی دی..... شیخ فیاض
دروازے میں سے سر نکال کر میری طرف دیکھ رہا تھا۔
ہم دونوں ایک دوسرے کی طرف بڑھے..... کچھ اشارے
کئے..... پھر ایک دوسرے کا ہاتھ پکڑ کر ساتھ والی تنگ گلی میں اتر گئے۔
اب ہم محفوظ تھے..... گھروں میں سے کوئی نکل بھی آئے تو
فوری طور پر دیکھ نہ پاتا۔
ہم چل رہے تھے اور فیاض مجھے بڑی سنجیدگی اور زور سے سمجھا رہا تھا۔
"ہمارے گھر والے بڑے ظالم ہیں' ہمیں بند کر رکھا ہے..... ہر
کوئی لوٹ مار کی چیزیں لا رہا ہے..... لوٹ مار روز روز تھوڑی آتی ہے.....
ہم بھی لوٹ مار کریں گے"
مجھے بھی احساس ہو رہا تھا کہ ہمیں محروم رکھ کر گھر والوں نے ظلم کیا
ہے۔
ہم دونوں چھپتے چھپاتے بدبودار تنگ گلیوں میں سے گزرتے
ہوئے بازار میں آ نکلے۔
اس دوران ہمیں کہیں بھی کوئی ہندو سکھ نظر نہ آیا۔
بعد میں پتا چلا کہ جو بچ گئے تھے' انہیں شہر سے باہر کیمپ میں منتقل کر
دیا گیا تھا۔
ہم کئی دکانوں میں گھسے..... سلگتے ملبے میں ہاتھ چلائے.....
ہمارے لئے لوٹنے کے لئے کچھ نہ چھوڑا گیا تھا۔
ہمارے چہرے اس محرومی پر سرخ ہو کر تن گئے۔
کافی تگ و دو کے بعد ہمیں ایک دکان میں مال مل گیا..... یہ
بڈھے کی پان سگریٹ کی دکان تھی۔
بڈھا جس چوکی پر بیٹھتا تھا' وہ غائب تھی..... نیچے فرش پر کھرے
رنگ کے بڑے نادر سے تھے۔
خوف کی ایک لہر سر کے بالوں سے شروع ہوئی اور پیروں کی
انگلیوں سے پھسل کر نکل گئی۔
فیاض ادھر اُدھر الٹ پلٹ کر رہا تھا..... وہم تھا' اُسے کوئی کام
کی چیز مل کر نہ دے رہی تھی۔
پھر ہم دونوں کی نگاہیں لکڑی کے ایک فریم پر جم گئیں..... شوشا
کے لئے اس فریم میں ترتیب سے خالی پیکٹ سجے تھے..... اس میں جگہ جگہ
رخنے تھے..... چیک کیا جا چکا تھا کہ پیکٹ خالی ہیں۔
فیاض کی غصیلی آنکھیں کچھ نرم پڑیں۔
"چلو..... سیڑھیاں لوٹتے ہیں' انہیں پھاڑ کر پتے بنائیں گے اور
جوا جوا کھیلیں گے"
ہم دونوں نے اپنی جھولیاں بھر لیں..... اور چلتے کودتے دلوں
کے ساتھ دکان سے نکل آئے۔
دکان کے باہر اُدھڑے تھڑے کے ملبے میں آدھی سے زیادہ دفن
ایک چھری نظر آ گئی..... میں نے اُسے کھینچ لیا..... اور بڑے طمطراق سے
اُسے سڑک پر گھسیٹ گھسیٹ کر چلنے لگا۔

دو چار دنوں بعد پے بہت پھٹا گئے......

شہر میں امن و سکون ہو چلا تھا...... بے امنی کے لئے کچھ بچا ہی تھا...... فضاؤں سے گوشت اور دھوئیں کی بو بھی تقریباً ختم ہو چکی تھی۔

اور کسی کو تسلی ہو، ہمیں آزادی مل گئی...... اب ہم پہلے کی طرح گلی میں، سڑک پر، گھر کے سامنے سڑک کے پار میدان میں، کسی بھی جگہ جو کھیل سکتے تھے۔

بالکل کی چھڑی میرے ساتھ رہی۔

دادی اماں کی نظر پڑتی تو بے اختیار ہنسی کی ہنسی قہقہوں میں بدل جاتی۔

"لوٹ کر لایا بھی تو کیا! چار فٹی بدصورت چھڑی......"

چھڑی ادھر ادھر ہو جاتی اور مہینوں نظروں سے اوجھل رہتی...... اور پھر اچانک کہیں سے نکل آتی...... جس کے ہاتھ لگتی وہ اسے استعمال کرنے لگتا۔

چھڑی آج تقریباً پچاس سال بعد بھی موجود تھی اور میرا نوجوان بھتیجا اُسے لئے میرے سامنے کھڑا تھا۔

سلیمان اُسے ہاتھوں میں گھما پھرا رہا تھا اور چمکتی شریر آنکھوں سے مجھے دیکھے جا رہا تھا۔

میں نے ہاتھ بڑھا کر چھڑی اس کے ہاتھ سے لے لی۔

اچانک محسوس ہوا کہ چھڑی زندہ ہے اور میرے ہاتھ میں سرسرا رہی ہے۔

میں نے گھبرا کر جلدی سے نیچے گرا دی۔

میری کمزور بوڑھی آنکھوں کا دھوکہ ہوگا! چھڑی زندہ سانپ کی مانند سکڑی، پھیلی...... اس کے پھن پر دو چھوٹی چھوٹی آنکھیں چمکنے لگیں اور پھر...... پھر وہ زمین پر رینگنے لگی۔

میں موڑھے سے اُٹھ کھڑا ہوا اور چلانے لگا۔

"سلیمان...... اسے کچل دو...... اسے مار دو"

سلیمان میرے چیخنے چلانے پر پریشان ہو گیا...... اس نے جھک کر چھڑی اُٹھائی، ٹانگ اُٹھا کر گھٹنے پر چڑھائی اور جوانی کے بے رحم جھٹکے سے اس کے دو ٹکڑے کر دیئے۔

میں چلائے جا رہا تھا۔

"اسے باہر پھینک دو...... جلدی...... جلدی کرو"

اس نے دونوں ٹکڑے ایک کے بعد ایک ٹکڑا اٹھا کر پوری قوت سے باہر پھینک دیا۔

"ساری تایا ابو...... دیکھیں...... مجھے پاپا نے بتایا تھا۔ میں تو مذاق...... ساری......" وہ واقعی شرمسار تھا۔

اللہ کا شکر ہے کہ نئی نسل کو شرمسار ہونا تو آتا ہے...... ہم تو اس نعمت سے بھی محروم ہیں۔

ادھوری کہانی

دیپک بُدکی (بھارت)

بہت سال پرانی بات ہے۔ میرے دادا جی جب بھی موقع پاتے مجھے سامنے بٹھا کر کہانی سنایا کرتے۔ کبھی تنتر منتر کی اور کبھی جاتکوں کی۔ اس روز بھی وہ کہانی سنا رہے تھے لیکن انہیں بار بار کھانسی کے دورے پڑ رہے تھے اور سانس بھی پھول رہی تھی۔ وہ بیچ میں رک جاتے، تھوڑا سا پانی پیتے اور اپنے سینے کو داہنے ہاتھ سے دبا کر پھر شروع ہو جاتے۔ کہانی یوں تھی۔

سندربن میں ایک سوامی جی رہتے تھے۔ چاروں ویدوں کو امرت کی طرح گھول کر پی چکے تھے۔ ایک روز کولکتہ کے ایک امیر ساہوکار ان کے آشرم میں حاضر ہوئے۔ زمین بوسی کی اور کہنے لگے "سوامی جی! جیون میں ایسی کوئی چیز نہیں جو مجھے میسر نہ ہو۔ تب بھی نہ مجھے سکون ہے اور نہ ہی چین۔ ہر دم پریشان رہتا ہوں۔ رات بھر نیند نہیں آتی۔ بھلا ایسا کیوں ہوتا ہے؟ اس کا کوئی اُپائے بتائیے۔"

سوامی جی نے پاس ہی رکھے ہوئے مٹی کے گھڑے میں سے تھوڑا سا ٹھنڈا پانی ایک کٹورے میں انڈیل کر اس کو پیش کیا۔ "آپ بہت دور سے آئے ہیں۔ تھکے ہوئے معلوم ہوتے ہیں۔ تھوڑا سا پانی پی لیجیے۔"

سیٹھ جی نے، جو ساہوکاری کے ساتھ جوہری کا کام بھی کرتے تھے، پانی غٹ غٹ کر پی لیا۔ یکایک انہیں ایسا لگا جیسے اُن کی ساری تھکان کافور ہو چکی ہو۔ اُن کی آنکھوں میں غنودگی چھا گئی اور وہ وہیں فرش پر لیٹ کر سو گئے۔ رات کیسے بیتی انہیں پتا بھی نہ چلا۔ صبح سویرے اٹھ کر وہ سیدھے سوامی جی کے درشن کرنے کے لئے ان کی کٹیا میں چلے گئے۔

"آپ تو کہتے تھے کہ آپ کو نیند ہی نہیں آتی ہے۔ آپ تو رات بھر خوب سوتے رہے" سوامی جی نے نگاہیں اٹھائے بغیر پوچھ لیا۔ اُن کے لہجے میں طنز تھا۔

"سوامی جی! میں خود بھی حیران ہوں کہ آج رات میں کیسے گھوڑے بیچ کر سوتا رہا۔ نہ اپنی فکر رہی نہ دنیا و مافیہا کی۔ ہاں! جاگنے سے پہلے ایک خواب ضرور دیکھ لیا جس نے تھوڑا بہت پریشان کر لیا۔ میں کسی لمبی سڑک پر چلا جا رہا تھا اور میرے پیچھے سینکڑوں لوگ چلے آ رہے تھے۔ میں مسلسل اپنے روپ بدل رہا ہوں۔ پہلے بیتال کا روپ دھارن کیا، تھوڑی دیر کے بعد گدھا بن گیا اور آخر میں کتے کا روپ اختیار کر کے بھونکتا رہا۔ کسی راہ گیر نے میری طرف دھیان بھی نہ دیا۔ دریں اثنا چڑھتے سورج کی شعاعیں کھڑکی سے گھس کر میرے چہرے پر پڑیں اور میری آنکھ کھل گئی۔ میرا خواب ادھورا ہی رہ گیا۔ مجھے اس خواب کا مطلب سمجھ میں نہ آیا۔"

"سمجھ میں کیوں نہیں آیا؟ مطلب تو صاف ظاہر ہے۔ اس میں کوئی پریشانی کی بات ہی نہیں ہونی چاہئے۔" سوامی جی ان تینوں علامتوں کا مطلب سمجھانے لگے۔

اتنا کہہ کر دادا جی کو زوردار کھانسی کا دورہ پڑ گیا۔ میں نے اٹھ کر ان کے ہونٹوں کے ساتھ پانی کا گلاس لگا دیا۔ کچھ گھونٹ پی کر انہوں نے اپنا سر میرے کاندھے پر رکھ دیا۔ "اوم ہری اوم" کہہ کر آخری ہچکی لی اور وہیں پر اپنے پران تیاگ دیے۔

اس وقت تک میں دادا جی کی کہانیوں کو زیادہ اہمیت نہیں دیتا تھا۔ انہیں محض تفریح کا سامان سمجھتا تھا مگر اس روز میرے دل میں نہ جانے کیسی خلش سی پیدا ہو گئی کیوں کر دادا جی نے وہ کہانی ادھوری چھوڑ دی تھی۔ میں ان علامتوں کا مطلب سمجھنے سے قاصر تھا۔ موت تو خیر ایک نہ ایک دن آنی ہی تھی البتہ میری چھٹی حس کہہ رہی تھی کہ اس روز دادا جی کوئی اسرار کھولنا چاہتے تھے جب کہ اجل نے انہیں مہلت نہ دی۔

دادا جی اکثر اپنے کمرے کے گھٹے ہوئے ماحول میں اکیلے پڑے رہتے تھے لیکن زبان سے کبھی اف تک نہ کی۔ بسر اوقات کے لئے حقہ پیا کرتے تھے جب کہ میری ماں کو تمباکو کی بو سے سخت نفرت تھی۔ وہ نہ خود ان کے کمرے میں جاتیں اور نہ بچوں کو جانے دیتیں۔ اگر کبھی کبھار مجبوراً جانا بھی پڑتا تو ناک پر موٹا سا کپڑا لپیٹ کر چلی جاتیں۔ مہینے میں ایک دو مرتبہ کمرے کی صفائی ہوتی۔ طاقچوں پر رکھی ہوئی بوسیدہ جنتریاں، رامائن، مہابھارت اور دیگر کتابیں سرسری طور پر یوں جھاڑی جاتیں گویا ان میں ذوق کے گنج اعظم پوشیدہ ہوں۔ جس چوکی پر حقہ وغیرہ رکھا رہتا اس کے پاس کوئی پھٹکنا بھی پسند نہیں کرتا تھا۔

دادا جی کر بھی کیا سکتے تھے۔ اس عمر میں ان عادتوں سے چھٹکارا پانا ممکن نہ تھا۔ پھر ایک متوسط گھرانے میں نوکر چاکر بھی تو دستیاب نہیں ہوتے۔ البتہ میں ماں سے نظریں بچا کر دادا جی کا حقہ صاف کر دیتا، چلم سے اس میں تازہ پانی بھر لاتا اور جلانے کے واسطے دادا جی کے سامنے اپلے اور گھاس کے چھوٹے چھوٹے ٹکڑے رکھ دیا کرتا۔ میری ماں کو یہ سب کچھ اچھا نہیں لگتا تھا۔ بار بار سمجھایا کرتیں۔ انہیں خدشہ تھا کہ کہیں مجھے بھی تمباکو نوشی کی عادت نہ پڑ جائے۔ کبھی کبھار جب میں دو چار روز کے لئے اپنے ننھیال چلا جاتا تو دادا جی کو کوفت ہوتی۔ چہرہ مرجھا جاتا اور ان کی آنکھیں دروازے کی طرف لگی رہتیں۔ میری عدم موجودگی میں انہیں یا تو خود ہی بازار جانا پڑتا تھا یا پھر پاس پڑوس کے کسی لڑکے سے مجبوراً گھٹیا قسم کے سگریٹ منگوانے پڑتے تھے کیونکہ پنشن کی قلیل رقم سے مہنگے سگریٹ خریدنا ممکن نہ تھا۔

وہ مجھے بات بات پر بلاتے۔ چاہے کام ہو یا نہ ہو۔ اکثر نئی نئی کہانیاں سناتے اور میں خوشی خوشی ان کا حکم بجا لاتا۔ مجھے ہمیشہ یہی محسوس ہوتا تھا جیسے وہ کچھ کہنا چاہتے ہوں۔ مجھ سے ..... ہم سب سے ...... افسوس ان کی

کوئی نہیں سنتا تھا۔ وہ اپنی زندگی کے تجربات سے ہمیں فیض پہنچانا چاہتے تھے لیکن ان کی باتیں سننے کے لئے کسی کے پاس فرصت ہی نہیں تھی۔ بہر حال میری بات الگ تھی۔ میں اپنے والدین سے زیادہ دادا جی کو چاہتا تھا۔ اس لئے ان کا دل کسی طور پر بھی دکھانا نہیں چاہتا تھا۔ ان کے پاس پند و نصائح سے بھری کہانیوں کا بہت بڑا ذخیرہ تھا جنہیں وہ دوسروں کو سنانے کے لئے بے تاب رہتے تھے۔ اس اذیت سے بچنے کے لئے ان کے کمرے میں کوئی بھی آدمی قدم نہیں رکھتا تھا۔ اگر مجبوری میں کسی کو جانا بھی پڑتا وہ پہلے ہی ماں سے طے کر کے آتا کہ دو چار منٹ کے اندر ہی اس کو چائے پینے کے بہانے بلایا جا سکتا کہ اُسے بڑھے کے پاس زیادہ دیر نہ ٹھہرنا پڑے۔

ایک بات میری سمجھ میں کبھی نہ آئی۔ دادا جی جب صبح سویرے جاگتے تھے وہ کہتے کہ بھی فرداً فرداً ایک ایک کر کے کیوں جگاتے تھے؟ مرغ کی بانگ کے ساتھ ہی اٹھ بیٹھتے۔ منہ ہاتھ دھوتے اور پھر اونچی آواز میں بھجنوں کی پوجا پاٹھ کرتے۔ پھر ہر ایک فرد کا نام لے لے کر پکارتے۔ دیکھتے ہی دیکھتے سارا گھر جاگ اٹھتا۔ میں اور میری بہن اپنے اپنے بستے، کتابیں اور یونیفارم ڈھونڈنے لگ جاتے۔ ماں کچن میں ناشتہ تیار کرنے اور لنچ کے لئے پراٹھے بنانے میں مشغول ہو جاتیں۔ صرف پتاجی سوئے رہتے۔ شاید آفس میں کام کرنے کی وجہ سے بہت تھک جاتے تھے۔

"کرشنا ارے او کرشنا۔ ابھی تک جاگا نہیں۔ دفتر کے لئے دیر ہو رہی ہے۔ پھر نہائے دھوئے گا کب؟ کتنا سوتا رہتا ہے تو؟ آلسی کہیں کا۔ اٹھ دیر ہو رہی ہے۔"

یہ سلسلہ تب تک جاری رہتا جب تک پتاجی کے خراٹوں کی بہت بہت آوازیں ان کے کانوں تک نہ پہنچتیں۔ اور پھر انہیں اطمینان ہو جاتا کہ چلو ٹھیک ہوا۔ اب کرشن لال ٹائم سے دفتر پہنچ جائے گا۔ دادا جی ریلوے محکمہ میں ٹیکس انسپکٹر ونگ میں ملازم تھے۔ اپنے اثر و رسوخ سے انہوں نے پتاجی کو بھی وہیں پر نوکری دلوادی تھی۔ انگریزوں کا زمانہ تھا۔ ٹائم کی پابندی تھی۔ دادا جی کے پاس اپنی مخصوص پاکٹ واچ تھی۔ آدھا گھنٹہ پہلے ہی دفتر میں حاضری لگاتے۔ اب تو وقت ہی الٹ گیا ہے۔ دفتر کھلنے کے آدھے گھنٹے بعد بھی کوئی حاضر نہیں ہوتا۔ یا تو اس بات کا علم دادا جی کو نہیں تھا یا پھر وہ جان بوجھ کر انجان بنے رہتے۔ انہوں نے سن چالیس میں ہی ٹھیکے سے اپنی جان چھڑالی تھی۔ اس لئے انہیں ہمیشہ یہ خدشہ رہتا تھا کہ کہیں ان کا بیٹا کرشن لال دیر سے آفس نہ پہنچے ورنہ دفتر میں افسر کی گھرکی کھانی نہ پڑے۔

زمانہ کتنا بدل گیا۔ ابھی حال ہی کی بات ہے میرا بیٹا اپنی ماں سے دو ہزار روپے مانگ رہا تھا۔ میں بھونچکا سا اس کو دیکھتا رہا۔ دو ہزار اتنی بڑی رقم تو میں نے پہلی بار تب دیکھی تھی جب میں انڈین بینک میں کیشیر لگ چکا تھا۔

"تمہیں اتنی ساری رقم کس لئے چاہئے؟" اس کی ماں نے استفسار کیا۔

"سونو کا برتھ ڈے ہے۔ گفٹ دینا ہے۔"

"یہ سونو کون ہے؟"

"ممی! تم بھی اب بہت سارے سوال کرنے لگی ہو۔ سونو از مائی فرینڈ۔"

"یور فرینڈ! پچھلے اسٹیشن پر شفالی تھی۔ اس سے پچھلے اسٹیشن پر پنکی تھی اور اب یہ سونو کہاں سے آگئی؟"

"ممی شی از مائی بڈی گو۔"

"وہ تو تم شفالی اور پنکی کے بارے میں بھی کہتے تھے۔"

"تو ممی اب کی بار فائنل۔ بالکل فائنل ہے۔ بس سونو میری سب کچھ ہے قسم سے۔"

اور پھر شفالی، پنکی اور سونو۔ نہ جانے کتنی آتی رہیں اور کتنی جاتی رہیں۔ اور وہ کھونٹے کی مانند کلیں پر منڈلاتا رہا۔ اس وقت مجھے دادا جی کی بات یاد آئی۔ ایک روز میں نے اپنا رزلٹ کارڈ دادا جی کو دکھایا تھا۔ وہ بہت خوش ہوئے۔ کہنے لگے "اپنا ہاتھ ذرا آگے بڑھاؤ۔"

میں نے اپنا ننھا سا ہاتھ سامنے کر دیا۔ انہوں نے میری ہتھیلی پر ایک بھاری بھرکم اٹھنی رکھ دی اور میری مٹھی بند کر کے رازدارانہ لہجے میں کہنے لگے۔ "یہ میری طرف سے تم کو کلاس میں فرسٹ آنے کا انعام۔"

میں نے اٹھنی اپنی مٹھی میں زور سے بھینچ لی جیسے کوئی اشرفی لی ہو۔ دادا جی کے پوپلے منہ پر ایک پیار بھرا بوسہ ثبت کیا اور پھر بھاگا وہاں سے۔ ان دنوں میں بھی لاابالی تھا۔ نہ جینے کی پروا نہ مرنے کا غم۔ جہاں مرضی چلا جاتا۔ جو چاہتا کھا لیتا۔ جدھر اچھا لگتا بیٹھ جاتا۔ اپنی مٹھی میں اٹھنی دبوچے میں چاکلیٹ کی دکان پر چڑھا اور چاکلیٹ کی قیمت پوچھی۔ ایک روپے سے کم تو کوئی بھی چاکلیٹ نہ تھی۔ اس لئے بے دلی سے گارا ما ٹافی پر ہی اکتفا کرنا پڑا۔ اس کے باوجود مجھے وہ اٹھنی قارون کے خزانے سے کم نہیں لگ رہی تھی۔ میرے پتاجی مجھے ہر مہینے دس روپے بطور پاکٹ منی دیا کرتے تھے۔ امتحان میں اول آنے پر ممی ڈیڈی دونوں نے مجھے ایک گھڑی انعام میں دی تھی جس کی قیمت پچاس روپے سے کم نہ تھی۔ پھر بھی نہ جانے کیوں ان ہاتھوں میں زیادہ مٹھاس تھی۔

دادا جی بھی کتنے بھولے تھے۔ نہیں لگتا تھا کہ اٹھنی دے کر انہوں نے تخت طاؤس میرے حوالے کر دیا ہو۔ جس دم انہوں نے اپنا ہلتا ہاتھ اٹھنی نکالنے کے لئے اپنی صدری میں ڈالا تھا ان کے چہرے پر عجیب سی تمتماہٹ پیدا ہو گئی تھی۔ وہ برسوں پہلے ایک سو دس روپے پنشن پر ریٹائر ہو چکے تھے اور ان کے لئے تب سے وقت تھم چکا تھا۔ ان کی زندگی ریل کے متروک ڈبے کی مانند تھی جسے دور کسی غیر استعمال پٹری پر چھوڑ دیا گیا ہو۔

مجھے خوب یاد ہے کہ میرے اصرار پر ایک روز دادا جی نے مجھے ایک روپے کی بانسری خرید کر دی تھی۔ میں اسے اسکول لے جاتا اور ریسس کے دوران بجانے کی کوشش کرتا۔ ڈرل ماسٹر کو جب اس بات کا علم ہوا انہوں نے مجھے اسکول بینڈ میں شامل کر دیا اور مجھے بانسری بجانا سکھا دیا۔

اسکول سے واپس آ کر کھیلنے کے وقت میں بانسری بجاتا ہوا دور

پہاڑی پگڈنڈیوں پر چل نکلا۔ چیڑ اور صنوبر کے درختوں کے بیچ ایک طرف کوئل کوک اٹھتی اور دوسری طرف میری بانسری بج اٹھتی۔ دونوں کسی بے نام ہمسفر کی تلاش میں تھے۔

ایک روز اچانک ایک لڑکی نے میری پیٹھ پر دھپ سے طمانچہ مارا اور پھر زور زور سے چیخنے لگی۔ "کیوں پیٹا؟" وہ بدستور چیختی رہی لیکن میں اس چیخ کو دیکھ کر ہکا بکا سا رہ گیا۔ میں کچھ کہنے کی تیاری کر ہی رہا تھا کہ وہ چیختے ہوئے گویا ہوئی۔

"میرا نام شانتی ہے شانتی...... پر تم شانتی کو کیسے جانو گے۔ ارے ہو رکھ میں شنو ہوں شنو۔ دینا کاکا کی بیٹی جس کی بیٹھک میں بیٹھ کر تم کاکا سے سبق پڑھا کرتے تھے۔"

"اری شنو! تم اتنی بڑی ہو گئی ہو! کچھ پنڈت جی کیسے ہیں؟"

"تم بھی تو...... ہائے رام........ بھگوان بری نظر سے بچائے۔"

"تم یہاں کیا کر رہی ہو وہ بھی اس اندھیرے میں؟"

"تمہاری بانسری سننے آئی تھی۔ یوں تو ہر روز اپنی کھڑکی پر بیٹھے سنا کرتی ہوں۔ آج سوچا چل کر ہی آؤں۔"

اس روز کے بعد ہم دونوں اکٹھے سانپ کی طرح بل کھاتی ہوئی پہاڑی پگڈنڈیوں میں کھو جاتے اور رات گئے لوٹ آتے۔

"وہاں اسکول میں بھی کوئی بانسری سننے والی ہے یا نہیں؟" شنو نے اپنے دل کا غبار نکالا۔

"تم کس کی بات کر رہی ہو؟"

"کوئی بھی...... میری طرح...... جو اسکول میں تمہاری دیوانی ہو گئی ہو۔" میں نے زوردار قہقہہ لگایا۔

"وہ تو صرف لڑکوں کا اسکول ہے وہاں لڑکیوں کا کیا کام۔"

"چلو مانا اسکول میں نہیں۔ کہیں راستے وغیرہ میں تو مل ہی گئی ہو گی۔"

"اری پگلی پڑھنے سے فرصت ملے تب نا۔ یہاں تو مرنے کی فرصت نہیں تو تانک جھانک کیا کریں۔"

شنو نے چین کا سانس لیا اور اطمینان سے گھر کی راہ لی۔ میں جونہی گھر میں گھسا تو ممی کو منتظر پایا۔ وہ مجھے دیکھتے ہی بڑبڑانے لگیں۔ میں سر جھکائے چپ چاپ کھڑا سنتا رہا۔ اتنے میں پاپا بھی آگئے اور پھر ممی کا نزلہ ان پر اتر آیا۔

"کہاں رہتے ہیں اتنی دیر؟ کچھ ٹھور ٹھکانہ بھی نہیں۔ دنیا میں سبھی لوگ نوکری کرتے ہیں۔ شام کو پرندوں سے پہلے ہی اپنے گھونسلوں میں لوٹ آتے ہیں اور ایک آپ ہیں۔ دن کی خبر نہ رات کی۔ بیوی کی خبر نہ بچوں کی۔ بیوی زندہ ہے یا مر گئی آپ کو اس سے کیا غرض؟"

پاپا کا بھی پارہ چڑھ گیا۔ انہوں نے بھی ترکی بہ ترکی سنائی۔

"کوئی رنگ محل نہیں ہے جس کے پاس شام کو جاتا ہوں۔ کام ہی ایسا ہوتا ہے۔ شام کو دو ٹائم کیا کوئی پاپ تو نہیں۔ اور پھر کیا بھی تو تمہیں لوگوں کی خاطر ہوں۔ ایک تو دن رات گدھے کی طرح کام کرو اور اوپر سے طعنے بھی سنو۔"

"رنگی بھی ہو تو کیا معلوم۔ جو رکھتے ہیں ان کے پر تو نہیں لگے ہوتے۔"

"ہاں ہاں میں نے رکھی ہے۔ روز اسی کے پاس چلا جاتا ہوں۔ تمہیں جو کرنی ہے کر لو۔"

"پھر اسی کے ساتھ کیوں نہیں رہتے۔ یہاں آنے کی کیا ضرورت ہے؟ یہاں تمہارے لئے کون پریشان ہو رہا ہے۔ جاؤ وہیں چلے جاؤ۔" ممی کا لہجہ اب بالکل بدل چکا تھا۔ وہ 'آپ' کے بدلے 'تم' پر اتر آئی تھی۔

"جاؤں گا۔ ضرور جاؤں گا۔ ایسا ہی معاملہ رہا تو ایک دن ضرور چلا جاؤں گا۔ میری تو قسمت پھوٹی تھی جو تم جیسی گنوار عورت سے شادی کر لی۔"

"بھاگ تو میرے پھوٹے تھے جو تمہارے پلے پڑ گئی۔ میری تو زندگی دوبھر ہو گئی ہے۔ اب تو اس گھر میں دم گھٹنے لگا ہے۔"

"دم گھٹتا ہے تو اس گھر میں رہتی ہی کیوں ہو۔"

"لاچار ہے نہیں تو کبھی چلی جاتی۔"

"جاؤ کون روکتا ہے۔"

"ٹھیک ہے۔ صبح ہونے دو۔ میں اپنے میکے چلی جاؤں گی۔ بھائی بھاوج کو بھاری تو نہ پڑوں گی۔ اب تو ضرور جاؤں گی۔ اتنا آزار نہیں سہہ سکتی۔ کچھ کیا رکھا ہے تم نے۔ یہ آخری بار ہے۔ اب کبھی واپس نہ آؤں گی۔"

اس رات میں بہت ڈر گیا۔ دونوں کے تیور عجیب سے تھے۔ میری سمجھ میں نہیں آیا کہ ممی نے پاپا کے ساتھ غصے میں بات کیوں کی۔ ایک تو صبح سے شام تک ہمارے پیٹ پالنے کے لئے کام کریں۔ پھر اس پر الزام۔ کس لئے؟ ہمیں طرح طرح کی سکھ سوودھائیں مہیا کرنے کے لئے۔ خود تو کئی برسوں سے اپنے لئے ایک گز نیا کپڑا بھی نہیں خریدا۔ یہاں ہماری فرمائش منہ سے نکلی نہیں اور چیز فوراً حاضر۔ بے چارے پاپا! کتنا خیال رکھتے تھے ہم سب کا۔

یہ گرہست آشرم بھی آدمی کو کچھ سوچنے نہیں دیتا۔ پاپا کو سوتے جاگتے بس ہماری فکر لگی رہتی تھی۔ کتنے پیٹ پالنے پڑتے تھے۔ ہمیشہ تنگ دست رہتے تھے مگر اُف تک نہیں کرتے تھے۔ بے چارے صبح نکل جاتے اور رات گئے تک لوٹتے تھے۔ پندرہ سال پرانا سائیکل ان کا ہمسفر تھا۔ دونوں کی حالت ایک جیسی تھی۔ دن بھر بوجھ اٹھاتے رہتے تھے۔ بچوں کو صبح اسکول چھوڑتے پھر دفتر جاتے۔ لنچ ٹائم پر میری چھوٹی بہنوں کو گھر لے آتے پھر واپس دفتر اور اس کے بعد رات کو گھر لوٹتے۔ ساگ سبزی لانا، سودا سلف لانا اور دیر رات تک بچوں کو اسکول کا ہوم ورک کراتے۔ یہ کام تو ممی بھی کر سکتی تھیں مگر انہوں نے یہ کہہ کر اپنی جان چھڑا لی کہ بچوں کو آپ نے بگاڑ دیا ہے۔ اب مجھ سے کنٹرول نہیں ہوتے۔ وہ تو بس کچن میں گھسی رہتیں۔ کبھی کھانا پکانے میں مشغول اور کبھی پوجا پاٹھ میں مصروف۔ اب تو پاپا کی کمر میں درد بھی رہنے لگا تھا اور بلڈ پریشر کی شکایت بھی

رہتی تھی۔ ڈاکٹر نے علاج جاری کی تھی کہ صبح سویرے اور رات کو کھانا کھانے کے بعد سیر کیا کرو مگر انھیں فرصت ملتی تب نا۔ وہ تو بس کام کام ہوتا تھا۔

وہ رات تو واقعی کالی رات ثابت ہوئی۔ اتنی اتنی کہ پھر کبھی نہ پہلے کی طرح بن پائی۔ ماں نے اپنا بستر باہر ڈرائنگ روم میں بچھا لیا۔ میں نے ٹوٹتے ہوئے رشتوں کے قصے سنے تھے۔ ڈر رہا تھا کہیں ماں باپ کی آپسی دھمکیاں سچ ثابت نہ ہوں۔ میرا اور میری چھوٹی بہنوں کا کیا حشر ہوگا۔ پاپا وکیل کے پاس جائیں گے اور ماتا جی اپنے بھائی بھاوج کے پاس۔ پھر ہم لوگ کہاں جائیں گے؟

دو چار روز فضا میں کافی تناؤ رہا۔ دونوں طرفین پہل کرنے میں ہچکچا رہے تھے۔ میں سوچ رہا تھا کہ میں کس نرک میں آکر پھنس گیا ہوں۔ ان دونوں کو ملانے کی کوئی تدبیر سوجھ نہیں رہی تھی۔

اگلے اتوار کی صبح میں نے ناشتے کے لئے فرج سے دو تین سیب نکالے اور انہیں چھیلنے لگا۔ اچانک میرا چاقو میرے بائیں ہاتھ کی چھنگلی میں لگ گیا اور خون بہنے لگا۔ میرے منہ سے چیخ نکل گئی۔ ایک جانب سے ممی دوڑ پڑیں اور دوسری جانب سے ڈیڈی۔ پاپا نے میری چھنگلی زور سے دبائی اور ماں کو حکم دیا۔

"ارے منہ پھاڑ پھاڑ کر کیا دیکھ رہی ہو۔ جلدی سے ڈیٹول کی شیشی اور روئی لے آؤ۔ سامنے دراز میں بینڈ ایج پڑا ہے وہ بھی لے آنا۔"

ممی تینوں چیزیں اٹھا کر لے آئیں۔ پاپا نے پھر حکم دیا۔

"وہاں کے ڈبے میں بیٹا سلف کی بوتل رکھی ہوئی ہے وہ بھی لے کر آنا۔"

ممی نے بیٹا سلف پوڈر بھی لا کر دیا۔ پاپا نے زخم پر پٹی باندھ دی۔ اتنی دیر میں ممی دودھ کا گلاس لے کر چلی آئیں۔

دونوں کے درمیان مکالمہ بحال ہو گیا۔ اس سمجھوتے کے لئے میرے خون کے چند قطرے گرے ضرور تھے۔ دفعتاً میں سوچنے لگا کہ آخر کب تک میرا خون ان دو بے کل دلوں کو جوڑتا رہے گا۔ اس دن کے بعد جب کبھی بھی میرے سامنے ان کی ان بن ہو جاتی تو میرے شریر میں بجلی سی کوند جاتی اور میرا لہو بہنے کے لئے تڑپ اٹھتا۔ سارا بدن تپنے لگتا۔ سر میں شدید درد اٹھتا اور میں چیخنے لگتا۔

شنو کے ماں باپ نے اس کی شادی کر دی۔ مجھے بعد میں معلوم ہوا کہ اس کے پاپا ہمارے ساتھ رشتہ جوڑنے کے خلاف تھے۔ وہ اونچی ذات کے برہمن تھے گو ان کا گھر افلاس و غربت کی تصویر بنا ہوا تھا۔ شنو کی ماں نے اشارہ تو کیا تھا مگر اپنے شوہر کے تیور دیکھ کر چپ رہی۔

"ارے پڑھنے لکھنے سے کیا ہوتا ہے۔ بینک کا ملازم ہے تو کیا ہوا۔ اپنی ذات برادری میں کیا لڑکوں کی کمی ہے۔ میں بیٹی کو بن بیاہی رکھوں گا لیکن اپنی ذات کے باہر ہرگز نہیں دوں گا۔ آگے پھر کبھی ایسے وچار اپنے من میں نہیں لانا۔"

شنو کی ماں خاموش ہو گئی تھی۔ شنو کے ارمان اور اس کی تمنائیں اس کے من کے اندر ہی دب گئیں۔ پھر ایک روز دوسرے گاؤں سے ایک ڈاک ہرکارہ شنو کو بیاہ کر لے گیا اور سارا گاؤں دیکھتا رہ گیا۔ میں بھی باہر اس ڈولی کو جاتے ہوئے دیکھتا رہا۔ میرے من میں اس وقت اتھل پتھل مچ اٹھی تھی مگر کر بھی کیا سکتا تھا۔ بیسویں صدی میں بھی میرے دیش کو ذات پات نے جکڑ کر رکھا ہے۔ بے شمار ہندوستانی لڑکیاں مجبور و لاچار خاموش معصوم بھیڑوں کی طرح ہانکی جا رہی ہیں۔ چاہے ان کے دلوں میں طوفان ہی کیوں نہ اٹھ رہا ہو وہ آہ تک بھی نہیں کر پاتیں۔ چپ چاپ سب کچھ سہہ لیتی ہیں۔ پھر یہ دستور یہ آزادی نسواں! یہ انصاف کے جتارا یہ سب ڈھکوسلے ہیں ڈھکوسلے۔ دکھاوے اور دل بہلاوے۔ امیر زادیوں کے کھلونے۔ غریب لڑکیوں کے بہکاوے۔ غریب عورت کو انصاف تب ملے گا جب وہ عدالت کا دروازہ کھٹکھٹائے گی۔ یہاں تو دروازہ کھٹکھٹانے کی نہ کسی میں جرأت ہے اور نہ طاقت۔ پھر کہاں کا دستور اور کہاں کا انصاف۔ میں نے کئی بار شنو کو اپنے پیروں پر کھڑا ہونے کی ترغیب دی تھی۔ اس کی ہمت بندھائی تھی۔ اسے سماج کے خلاف بغاوت کا پرچم اٹھانے کی تلقین کی تھی مگر لاکھ کوششوں کے باوجود وہ نہ مانی۔ اسے اپنے خاندان کی عزت زیادہ عزیز تھی۔

وقت کے جیسے پر لگ گئے۔ ایک روز میں نے اپنا چہرہ غور سے آئینے میں دیکھا۔ پاپا کا ڈپلی کیٹ لگ رہا تھا۔ پاپا بھی اب کافی بوڑھے ہو چکے تھے۔ دادا جی تو عرصہ پہلے بھگوان کو پیارے ہو گئے تھے۔ ان کی یادیں مجھے رہ رہ کر ستاتی تھیں۔ بے چارے دادا جی نے اپنے آخری سفر کے لئے کتنا طویل انتظار کیا تھا۔ اس کے برعکس پاپا اتنا انتظار نہیں کر پائے۔ اچانک سیریبرل ہیمرج کی وجہ سے ان کے دماغ کی کوئی نس پھٹ گئی۔ اسپتال میں داخل کرانے سے پہلے ہی راہ عدم اختیار کر لی۔ ان دنوں میری پوسٹنگ ہندوستان کے شمال مشرقی علاقے میں تھی۔ گھر پہنچتے پہنچتے دو دن لگ گئے۔ تب تک ان کا داہ سنسکار کیا جا چکا تھا۔ ان کے بدلے مٹی کے گھڑے میں رکھی ہوئی راکھ میرا انتظار کر رہی تھی۔ سنا ہے کہ مرتے دم تک ان کی آنکھیں دروازے کی طرف دیکھتی رہیں۔ ان کا انتم سنسکار کرنا بھی نصیب نہ ہوا کیونکہ خاندان کے بڑے بزرگوں نے لاش کو گھر میں زیادہ دیر رکھنے سے منع کر دیا تھا۔ ان کا کہنا تھا کہ یہ پاپا جی کی روح کے لئے عذاب دہ ہوگا۔ میری آنکھیں مدتوں اپنے پاپا کو ڈھونڈتی رہیں۔ وہ کبھی سپنوں میں بھی اپنے درشن نہیں دکھاتے۔

البتہ کل رات دادا جی خواب میں چلے آئے۔ میری خیر خبر پوچھنے لگے۔ انہیں یہ جان کر حیرانگی ہوئی کہ میں اس کہانی کو جو انہوں نے ادھوری چھوڑ دی تھی پوری طرح سننے کے لئے اب تک مضطرب ہوں۔ کہنے لگے "بیٹے تم خود ان مرحلوں سے گزر چکے ہو۔ پھر یہ بے تابی کیسی۔ اپنی ہی زندگی پر نظر ڈالو ان علامتوں میں پوشیدہ راز سمجھ جاؤ گے۔"

میں نے مڑ کر اپنی زندگی پر نظر ڈالی۔ پھر اپنے اندر جھانک کر دیکھا۔ میرے اندر کا گدھا اب تھک چکا تھا اور کتا بھونکنے لگا تھا۔

گوہرِ نامقصود

گلزار جاوید

"ایک منٹ' بس ایک منٹ میری جان!" میک اپ کے امپورٹڈ سامان سے بھرے ڈریسنگ ٹیبل کے آئینے میں اس کی آنکھوں میں غصے کی چنگاریاں دیکھ کر میڈم درخشندہ نے نچلے ہونٹ کی لپ سٹک کو ادھورا چھوڑ کر اس کی گردن میں پیار سے بازو حمائل کرتے ہوئے بچوں کی طرح اس کے گال چمکار کے اپنے مخصوص انداز میں "My sweet bitch just one minute" کہہ کر پھر سے ادھوری لپ سٹک درست کرنے کی کوشش کی تو اس کے چہرے کی کرختگی کسی قدر کم ہو گئی تھی۔ غصہ کی جگہ طبیعت میں رومان اُمڈنے لگا تھا۔ آنکھوں کی چمک شکاری کتے کی مانند تیز تر ہونے لگی تھی اور اُن میں لپکتی بھوک تیرنے لگی تھی جو غذا کے بغیر بھی مٹائی جا سکتی ہے۔ ایسا پہلی بار نہ ہوا تھا جب بھی وہ میڈم درخشندہ کی کسی بات پر برانگیختہ ہوتی' میڈم درخشندہ اُسے منانے کے لئے یہی حربہ اختیار کرتی جس پر اُس کا غصہ یک لخت غائب ہو جاتا اور طبیعت میں ایک طرح کی بشاشت در آتی۔ وہ لیبرا ڈاگ تھی نہ چیہوا ڈاگ نہ ڈابر مین ڈاگ تھی نہ اُس کا تعلق السیشین نسل سے تھا اور نہ جرمن شیفرڈ یا ملٹی ڈاگ سے اُسے کوئی نسبت تھی۔ ہوتی بھی کس طرح......؟ وہ "کتیا" کیا کوئی بھی جانور سے کسی طرح کی نسبت نہ رکھتی تھی۔ وہ تو ایک انسان تھی......! اچھی جاتی' ہنستی کھیلتی' زندگی سے اپنے حصے کا بھرپور رس نچوڑنے' کبھی کبھی دوسروں کے حصے کی مٹھاس بھی اُچکنے سے بھی دریغ نہ کرتی۔

زندگی نے اُس کے لئے تجربات و حوادث کے بہت سے در وا کئے ہر بار وہ اُسی طرح سرخرو اور سرفراز ہو کر نکلی جس طرح فاتح میدانِ جنگ سے برآمد ہوا کرتے ہیں۔ بظاہر صنفِ نازک عمر کی بابت بہت حساس ہوا کرتی ہیں مگر وہ اپنی عمر کے چھتیس ویں سال کو اس طور عیاں کرتی کہ سننے والے کو اُس کا اعتماد محسوس ہوا کرتا۔ میڈم درخشندہ کے بقول وہ اُس سے عمر میں چار سال اور تجربات میں چھتیس سال پیچھے تھی۔ والدین کی اکلوتی اولاد سلمیٰ کو ابتدا ہی سے وہ سب میسر تھا جو امیر اور پوش گھرانوں کا طرہ ہوا کرتا ہے۔ والدین میں ذہنی ہم آہنگی کے فقدان نے دونوں کو الگ الگ راہ پر ڈال دیا تھا جس کا سلمیٰ کے ننھے ذہن پر بہت گہرا اثر ہوا۔ پہلے پہل دونوں ایک دوسرے سے چھپ چھپا کر کاروائی ڈالتے آہستہ آہستہ دل اور دماغ میں کشادگی کے باعث بے باک ہو گئے تھے۔ آدھی رات گئے ماں کو اکثر کوئی گاڑی اور نیا ڈرائیور چھوڑنے آتا جس کے ردعمل میں باپ اور بھی بے باک ہو گیا تھا۔ کبھی کوئی مہ جبیں جھلمل کرتے لباس اور تیز خوشبو لگائے باپ کے ساتھ گھر تک آ جاتی تو واپسی پر اُس کی ماں کو دونا پا لگ جاتا اور وہ سلمیٰ سے مخاطب ہو کر کہتی! "کیوں آج پھر تیرے باپ کے ساتھ کوئی کتیا آئی تھی...... ؟" سلمیٰ کا ننھا ذہن بہت مشکل میں پڑ جاتا اچھی بھلی عورت کو اُس کی ماں کتیا کیوں کہہ رہی ہے......؟

پانچ سال پر لگا کر اُڑ گئے۔ دونوں میاں بیوی کے درمیان خاموش معاہدے کے وقت سلمیٰ سات برس کی تھی آج جبکہ رحیم داد جو برسوں سے اُن کا نمک خوار اور وفادار تھا جس کے ذمہ کھانا پکانے کے ساتھ بے بی کی دیکھ بھال بھی شامل تھی چالیس کے پیٹے میں ہونے کے باوجود بے حساب جوتے کھا رہا تھا۔ وہ تمام گالیاں نا کردہ مردانہ اُس کے حصے میں آ رہی تھیں جو کسی بھی بے غیرت انسان کا مقدر ہوا کرتی ہیں۔ سلمیٰ کے کیا ٹی ذہن میں ایک طرح کا جوار بھاٹا اُٹھ رہا تھا۔ دونوں میاں بیوی ایک دوسرے کو موردِ الزام ٹھہرا رہے تھے......! رحیم داد کے نکالے جانے پر ایک اور معاہدہ میاں بیوی کے درمیان ہوا......! جب بھی ایک شخص باہر جائے گا دوسرا لازماً گھر پر رہتے ہوئے بے بی کو کمپنی دے گا......

وقت کی رفتار پھر سبک روی سے اپنی چال چلنے لگی۔ آہستہ آہستہ ماں اور باپ کو کڑوے ساتھ کی شدت سے نجات ملنے لگی۔ اُن کے خیال میں جو کچھ ہوا وہ بے بی کی کم سنی' کم عمری اور کم علمی کے باعث ہوا۔ ماشاءاللہ اب بے بی جوانی میں قدم رکھ رہی ہے فرسٹ ایئر کی طالبہ ہے اچھا برا سمجھ سکتی ہے۔ خیال دونوں کا درست اُس وقت ثابت ہوا جب بے بی ڈرائیور نثار کے ساتھ پرائیویٹ کلینک کے چکر لگانے لگی۔ بے بی کی مجبوری نے ماں اور باپ دونوں کو کسی زحمت میں مبتلا کرنا مناسب نہ سمجھا۔ نثار کے ساتھ بھی رحیم داد والا رویہ اپنایا گیا اور اُسے بھی دھکا دے کر نوکری سے الگ کر دیا گیا۔

دونوں میاں بیوی پھر سر جوڑ کر بیٹھے اور مسئلہ کا حل تلاش کرنے لگے۔ ایک ہی حل شادی پر دونوں متفق تھے۔ بے بی سے بڑی عاجزی اور انکساری سے اُس کی پسند دریافت کی گئی۔ نفی میں جواب پا کر آئندہ کے لئے محتاط رہنے کی درخواست اور سرگرمی سے رشتہ تلاش کرنے کی یقین دہانی کرائی گئی۔ عجلت میں بے بی سے پندرہ بیس برس زائد عمر کے بڈھے شخص کا رشتہ دستیاب ہو سکا۔ ابتدا میں دولہا میاں بڑے کم گو اور سادہ طبیعت کے دکھائی دیتے تھے۔ شادی کی پہلی رات ہی اُن کا اصلی رنگ روپ اُس وقت ظاہر ہو گیا جب اُنہوں نے نئی نویلی دلہن سے صاف صاف لفظوں میں اُن کے سابقوں کی تفصیل جاننا چاہی۔

پہلے پہل سلمیٰ بیگم کو بہت حجاب آیا۔ وہ ہر بات کا جواب نفی میں دیتی رہیں۔ بعد میں جب اُن کی ممی نے اُن کو سمجھایا کہ وہ کسی طرح کی کمزوری یا پشیمانی کا قطعی اظہار نہ کرے بلکہ صاف صاف کہہ دے کہ "شادی سے پہلے کی زندگی پر شوہر کا کوئی حق نہیں ہوتا" چنانچہ سلمیٰ بیگم کے اس جواب کے بعد اُن کے شوہرِ نامدار کچھ زیادہ ہی منہ پھٹ ہو گئے۔ وقت بے وقت' بات بے بات سلمیٰ

بیگم کا کردار زیرِ بحث لے آتے اور طرح طرح کے چبھتے سوالات کیا کرتے جن کا سلمیٰ بیگم کبھی غصہ اور کبھی حقارت سے من ملا جواب دیا کرتیں۔ آٹھ مہینے میں تین دن کم پر جب سلمیٰ بیگم کو زچگی کا درد اُٹھا تو اُن کے شوہر کو زبانی کھل کھیلنے کا خوب موقع دستیاب ہوا۔ اللہ کی کرنی پیدائش کے تیسرے روز یرقان کے باعث بچہ چل بسا اور سلمیٰ بیگم ہر طرح کی آزادی کا پروانہ لے کر ہسپتال سے گھر آ گئیں۔

چند یوم کی تُو تُو مَیں مَیں کے بعد میاں بیوی کے درمیان بول چال بند ہو گئی۔ آہستہ آہستہ سلمیٰ بیگم کے والدین کے گھر کا قانون رائج ہو گیا۔ ابتدا میاں صاحب نے کی اور انتہا سلمیٰ بیگم کے ہاتھوں ہوئی۔ پہلے پڑوس کا کم سن لڑکا حامد شکار ہوا بعد میں شوہر کے بھتیجے امر اسے بھی بہلایا گیا اس کے بعد کی قطار زنجیر کی طرح کڑی در کڑی پھیلتی چلی گئی۔ جس طرح بارش کا پہلا قطرہ زمین کی پیاس بجھاتا ہے اسی طرح پہلے دنیا میں آنے کے باعث اس کی خوراک بھی سلمیٰ بیگم کے شوہر کو بننا پڑا۔ بظاہر الزام اُن کے دل کو لگ گیا۔ جاننے والے جانتے ہیں کہ اس کا اصل حق دار کوئی اور ہی ہے ایک نیا دن جاتے جاتے سلمیٰ بیگم کے شوہر نے ضرور کی جسے سلمیٰ بیگم اُن کا احسان بلکہ اُن کا دیا ہوا اعزاز گردانتی ہیں۔

ایک دن گھر میں داخل ہوتے ہی میاں کا پارہ چڑھ گیا۔ اُن کے منہ سے مارے غصے کے جھاگ اُڑنے لگی۔ "لو بھلا بتاؤ اب محلے والے بھی طعنے دینے لگے ہیں کہ میاں تمہاری بیوی کا چال چلن روز بروز خراب ہوتا جا رہا ہے کچھ کرلو ورنہ ایک دن یا تو بیوی سے ہاتھ دھو بیٹھو گے یا محلے سے بے عزت کر کے نکالے جاؤ گے۔" جواب میں سلمیٰ بیگم نے بھی محلے والوں کا نام لے کر شوہر کو بے نقط سنائیں۔ "لگی وہ کون ہوتے ہیں مجھے بدمعاش کہنے والے۔ پہلے اپنی ماں بہنوں کو دیکھیں کہ وہ کس کس کے ساتھ کب کب رنگ رلیاں مناتی ہیں۔ اور یہ تم کیا دوسروں کے کہنے پر ہر وقت بری عورت! آوارہ عورت' بدمعاش عورت کی گردان کرتے رہتے ہو۔ بری تو وہ ہوتی ہے جو چھپ کر کی جائے میں جو کچھ کرتی ہوں ڈنکے کی چوٹ پر کرتی ہوں......!" "کیوں نہیں کرو گی......! کرنا ہی چاہئے' یہ تو تمہارا خاندانی وطیرہ ہے......!" "میرے خاندان پر انگلی اٹھانے سے پہلے ذرا ملک کی ہائی فائی آبادیوں کا سروے کرلو جہاں بہت بڑی تعداد میں شادی کے چند سال بعد ہی میاں بیوی ایک دوسرے سے بوجہ آزاد روی اختیار کر لیتے ہیں......!" سلمیٰ بیگم نے نئی بحث کی گرہ لگائی۔ "کرتے ہیں تو کرتے رہیں بھی وہی ہیں ایسے لوگوں کے پیٹ کا جہنم کبھی نہیں بھرتا' ہمیشہ بھوکے ہی رہتے ہیں......!" "یہ تمہارا خیال ہے...... ہر کسی کی طلب اور بھوک کا پیمانہ الگ ہوا کرتا ہے میرا پیٹ ایک روٹی کھا کر بھر جاتا ہے تم تین تین روٹیاں کھا کر بھی سیر نہیں ہوتے میں نے تو کبھی تمہیں تمہارے پیٹ کی بھوک پر لعنت ملامت نہیں کی پھر تمہیں کیا حق ہے کہ تم کسی کی......!"

جواب میں کہنا بہت کچھ چاہتے سلمیٰ بیگم کے میاں کہہ نہ پاتے منہ ہی منہ میں بڑبڑ کر کے لفظ گویا کانچ یا روڑ کر کے پھینکتے ہوئے باہر نکل جاتے۔

شوہر سے نجات کے بعد سلمیٰ بیگم نے پوش علاقہ میں گھر خرید کر فیشن ڈیزائننگ کا کورس کیا اور اپنا بوتیک کھول لیا جس کے لئے انہیں ایک مددگار اور معاون کی ضرورت تھی جو اُن کی طرح خوبصورت' سمارٹ' چاق و چوبند' حاضر دماغ' مہذب' ایکٹیو اور بہت حد تک چُرا ہو۔ کافی تلاش بسیار کے بعد انہیں سکول کے زمانے کی ایک دوست رخشندہ ظہیر جو شادی کے بعد رخشندہ بلال اور چوبیس سال کی عمر میں بیوگی بنا کر میڈم رخشندہ کہلانے لگی تھی مل گئی۔ عہدہ میڈم رخشندہ کا میڈم سلمیٰ کی سیکرٹری شپ کا تھا مگر دونوں کی پرانی دوستی کا رواداری مفادات پر ہمیشہ حاوی رہی۔ میڈم سلمیٰ نے بھی رخشندہ میڈم کو دوست ہی تصور کیا۔ دونوں کے مزاج میں فطری طور پر موجود روایت اس دوستی کو اور بھی تقویت بخش رہی تھی۔

ابتدا میں میڈم رخشندہ کام سے فارغ ہو کر اپنے گھر چلا کرتی تھی آہستہ آہستہ میڈم سلمیٰ کا گھر اُن کا گھر بھی بن گیا اس میں کام کی نیا دتی اور کام کے بعد کی مصروفیات و مشاغل کے علاوہ میڈم سلمیٰ کے اصرار کو زیادہ دخل تھا۔ ایک معاہدہ دونوں کے درمیان پہلے دن طے پا گیا تھا کہ وہ کسی صورت ایک دوسرے کی پسند یا ایک دوسرے کے شکار کو منہ نہ ماریں گی۔ کھیل کے تمام اصولوں اور ضابطوں کی اسی طرح پابند رہیں گی جس طرح کرکٹ' ہاکی' فٹ بال اور باسکٹ بال کے کھلاڑی ہوا کرتے ہیں۔ فرق یہاں اس قدر تھا کہ دونوں دوست بھی خود ہی کھلاڑی بھی اور ایمپائر بھی۔ کبھی بھی میڈم سلمیٰ کو میڈم رخشندہ سے شکایت ہوئی نہ میڈم رخشندہ کو اپنی باس کم دوست سے کسی زیادتی کا گلہ ہوا۔

کرنل شفیق ظاہری طور پر مہذب اور وضع دار انسان تھے۔ دونوں خواتین کی عزت بھی بہت کیا کرتے تھے۔ کسی طور پتا نہیں چلتا تھا کہ اُن کی نظر التفات کس جانب ہے۔ ایک دن میڈم سلمیٰ نے جان بوجھ کر کرنل شفیق اور میڈم رخشندہ کو تنہائی کا موقع فراہم کیا۔ دوسرے دن اُس وقت میڈم سلمیٰ کو بڑی حیرت ہوئی جب میڈم رخشندہ نے بتایا کہ سارا وقت کرنل شفیق میڈم سلمیٰ کی تعریفیں کرتے رہے۔ عین اسی طرح جب میڈم رخشندہ نے کرنل شفیق اور میڈم سلمیٰ کو تنہائی کا موقع فراہم کیا تو وہ اُن سے میڈم رخشندہ کے بارے مبالغے سے کام لیتے رہے۔ دونوں سہیلیوں نے یک جان و یک خیال ہو کر اُن سے جان چھڑانا ہی مناسب جانا۔ ڈاکٹر محسن البتہ دھڑلے کے آدمی تھے۔ ہر محفل میڈم سلمیٰ کی تعریفوں کے دریا میں خود بھی بہتے اور دوستوں کو بھی بہا لے جاتے۔ پہلی بار اُن سے ملاقات انہیں کے کلینک میں ہوئی جب سلمیٰ کو چیسٹ انفیکشن ہو گیا تھا۔ سلمیٰ تیسرے روز ہی قلانچیں بھرنے پر آمادہ تھیں ڈاکٹر محسن لوشن کوبڑ بن چکے تھے۔ تیسری تنگ ملاقات کے بعد سلمیٰ میڈم نے ڈاکٹر محسن سے کبھی نہ ملنے کا فیصلہ کر لیا

تھا۔ بقول اُن کے وہ عشق بھی اسی طرح فرماتے ہیں جیسے مریض کا دوبہ جراحت چیک کر رہے ہوں۔ دوسرے اُن کی عمر جس قدر کم نظر آتی ہے جذبے اُس کے برعکس زوال پذیر ہیں۔

سلیمان سیٹھ کم گو اور وضع دار انسان تھا مرنا وہ بھی میڈم سلمٰی پر ہی تھا پر اپنی بیوی سے ڈرتا تھا کہتا تھا وہ آج جو کچھ بھی ہے اپنی بیوی کے طفیل ہے اُس کے باپ نے جہیز میں ڈھائی سو سوا اور ایک مکان دیا تھا۔ سلیمان سیٹھ نے بعد میں سوا ٹیچ کر کاروبار شروع کیا اور شہر کا اہم آدمی بن گیا۔ کچھ عرصہ غائب رہنے کے بعد سیٹھ نے میڈم سلمٰی سے تعلقات کی استواری کے لئے بہت ہاتھ پیر مارے میڈم درخشندہ کو بھی شیشے میں اُتارنے کی کوشش کی پر کوئی بھی حربہ کارگر ثابت نہ ہوا۔ ایسا ہی رویہ میڈم درخشندہ نے گابے شاہ قلم پروڈیوسر کے ساتھ روا رکھا تھا کہ وہ میڈم درخشندہ پر جیب ڈھیلی کرنے کے بجائے زبان سے کام لیتا تھا۔ یہ تیسرا لفظا میڈم کو بیروئن بنانے پر خرچ کیا کرتا تھا اس کے علاوہ نظر اُس کی میڈم سلمٰی پر بھی صاف نہ تھی۔ دونوں سہیلیوں نے نیلا کر کے گابے شاہ کی لکی چھٹی کرائی کر بے چارہ دوبارہ تین فلمیں فلاپ کرا بیٹھا۔

آدمی کام کا تھی۔ یمنی بھی بہت تھا۔ جب چاہو جہاں چاہو حاضر موجود ہر کام پر آمادہ مزاج بھی میڈم سلمٰی سے بہت قریب ''اعصاب کا مضبوط' گیم تھیم' سرخ سفید' جوان دیتا ''دل پھینک۔ اُسی غضب کا صاف صاف لفظوں میں حرف مدعا بیان کر دیا کرتا۔ خرابی سب سے بڑی یہ کہ ایک وقت میں دونوں کے قرب کا خواہاں۔ آخر میں میڈم درخشندہ کے فراق میں اس قدر مبتلا ہوا کہ شادی کی پیشکش کر بیٹھا۔ سلمٰی میڈم نے اس کی سنجیدگی کے پیش نظر میڈم درخشندہ کو اجازت بھی دینا چاہی۔ میڈم درخشندہ نے صاف صاف لفظوں میں کہہ دیا کہ علیم اور پانی میں چلنے والا گفگیر کبھی بھی دال ساگ کے کام کا نہیں ہوتا۔ دال ساگ ہمیشہ ہانڈی میں ہی پکتا ہے اور ہانڈی کو گفگیر سے کیا کام ہوتا وہ تو ڈوئی ہی سے لگی رہتی ہے۔

دونوں کی چند سالہ رفاقت میں دوستوں مرد آئے اور گئے مگر اُن کی دوستی پہلے روز کی طرح اٹل اور مضبوط رہی۔ وجہ دونوں کی ایمانداری اور پیشہ ورانہ پروفی تھی۔ بہت سے مرد گئے یا اُن کی زندگی میں ایسے آئے جو باری باری انہیں ہمیشہ کے لئے اپنا اپنے گھر کی زینت دیکھنا چاہتے تھے۔ دونوں ہی کبھی کسی کے جھانسے میں نہ آئیں۔ اُن کا مقصد کھلی ہواؤں' آزاد فضاؤں میں محو پرواز رہنا تھا۔ دونوں ہی اپنی اپنی زندگی میں مرد کی غلامی کا طوق پہن چکی تھیں۔ دونوں ہی گئے دنوں کی یادوں سے خوف زدہ تھیں۔ سچی بات یہ کہ دونوں کو روز روز کی یکسانیت سے چڑ تھی۔ وہ غریب کے دستر خوان کی طرح بے بس و مجبور رہنا نہ چاہتی تھیں۔ بھوک ہو نہ ہو کھا کھا کے اوجڑی بھرتے رہو اور کبھی حلال کرتے رہو یا پھر ہر روز دال ساگ کی بھرے نہ بھرے سوئی چھٹی روٹی' طبیعت

سیر ہو نہ ہو وہی بے مزا دی..... ! ایک طرح سے دونوں کے درمیان غیر تحریری معاہدہ تھا کہ ایک دن' ایک ہفتہ یا ایک مہینے سے زیادہ کوئی تعلق نبھانا نہ چاہئے اُن کے خیال میں یہ بوسیدگی کی علامت' گھٹن کی نشانی اور ٹھہراؤ کی جانب اشارہ ہے ایک طرح سے یہ قدرت کی نعمتوں سے منہ موڑنے کے مترادف بھی ہے جب جگہ جگہ' قدم قدم گلی گلی شہر شہر اور قریہ قریہ آپ کی من پسند اشیاء دستیاب ہوں پھر ایک جگہ رک جانا' ٹھہر جانا' سمٹ جانا اُن کے خیال میں کور ذوقی کی دلیل ہے۔

ساحل سمندر' کوہ دمن' باغات' پبلک پارک' تھیٹر' سینما کلب' کوئی شاپ' ریسٹورنٹ' ہوٹل...... ! کوئی بھی جگہ اُن کی دسترس سے باہر نہ تھی۔ موسم' ماحول' مزاج اور منشا کے مطابق ہر شام مخصوص مقامات کا طواف رہا کرتا جب جب جہاں جہاں مقصد برآری ہوتی اسی جگہ زیادہ گذر رہتا۔ گذشتہ ایک ہفتہ سے میرا خیال ہے چھ دن سے کیونکہ ساتویں اور آخری دن آج شروع ہوا تھا۔ یہ فیصلہ کبھی ہوا چاہئے اُن کے اہداف کے مطابق ایک' دو' تین' پانچ یا سات روز سے زیادہ کسی ایک سمت میں پیش رفت قطعی طور پر نامناسب بلکہ ناجائز ہے۔ بقول اُن کے یہ وقت کا ضیاع اور احساسات حال کی توہین ہے۔ ایسا شاید کبھی ہوا بھی نہیں کہ مقررہ دنوں میں اُن کا مطلوب ہاتھ نہ آئے یا آپ ہی کر اُن کے دام کا اسیر نہ ہوا ہو۔

ساحل سمندر پر گذشتہ چھ روز سے کالے رنگ کی لپ ماڈل پاون سوی کی مرسڈیز میں چھ فٹ سے اوپر قد' تیس برس کے لگ بھگ عمر' چالیس چھاتی' بتیس کمر' سرخ رنگت' ورزشی جسم اور بھوری آنکھوں پر کالا چشمہ اُن کے طواف میں ہے واضح طور پر اُس کا جھکاؤ میڈم سلمٰی کی جانب دکھائی دے رہا ہے تیسرے روز سے جلوہ ہائے کے بعد درخشندہ میڈم نے خود پر اجنبیت طاری کرلی ہے ساتھ ہی انہوں نے میڈم سلمٰی کو ہر روز دس منٹ تاخیر سے آنے کی تاکید کی ہے تا کہ فریق ثانی کے جذبات کی شورید سری خوب بے لگام ہو۔ وہ گذشتہ کئی دنوں سے اُن کی آمد سے پہلے گہرے رنگ کے تھری پیس سوٹ جس کے درمیان سے شفاف پنڈلی کی لذیذ رنگ نمائش کرتا دکھائی دیتا ہے وہ ہر روز میڈم سلمٰی سے جلوہ ہائے کرنے کے بعد اُن کا اور اُن کی دوست کا احوال دریافت کرتا ہے۔ وہ ہر روز انہیں کھانے کی دعوت پر اصرار سے بلاتا ہے آج..... مگر ...... آج وہ ابھی تک کیوں نہیں آیا...... ! حالانکہ...... ! حالانکہ...... !
گذشتہ کل اُس سے کافی رسم و راہ بڑھی ہے...... ! گذشتہ کل اُس کی دعوت کے جواب میں حوصلہ بخش اُمید دلائی گئی ہے...... ! گذشتہ کل ہی ٹیلیفون اور موبائل نمبروں کا تبادلہ ہوا ہے...... ! گذشتہ کل ہی ذوقی پسند و ناپسند میں مماثلت پائی گئی ہے...... ! گذشتہ کل ہی ایک دوسرے کی مقناطیسی شخصیت کا اقرار کیا گیا ہے...... ! گذشتہ کل ہی تعلقات کی استواری پر زور دیتے رہے

ہیں.....! گزشتہ کل ہی آنے والے دنوں میں رنگ بھر گیا ہے.....! گزشتہ کل ہی وہ دلوں کی دھڑکن یک جان ہونے پر آمادہ ہوئی ہے.....! گزشتہ کل.....! گزشتہ کل.....! گزشتہ کل ہی.....ارے رے رے.....! یہ کیا.....! آنکھوں پر یقین نہیں آ رہا.....اوہ.....! وہ آ رہا ہے.....! اُس کی گاڑی سبک روی سے اسی جانب چلی آ رہی ہے......! قریب......! اور قریب.....! اور قریب آ گئی ہے.....! یہ دل.....! دل اس قدر بے قرار کیوں ہے.....! رخشندہ کی بچی بت بنی پتھر پر کب تک بیٹھی رہے گی.....! وہ آ کیوں نہیں جاتی.....! کیوں بے قرار دل کو ڈھارس نہیں بندھاتی.....! اوہ نزدیک بہت نزدیک آ رہا ہے.....اور.....! اور نزدیک آ گیا ہے.....! بس میں اب کچھ بھی نہیں ہے.....! یہ.....! یہ آنکھوں کو کیا ہو گیا ہے.....! منظر دھندلا کیوں رہا ہے.....! وہ آ کیوں نہیں جاتا.....! اوہ.....! آئے.....! آئے.....! آئے.....! راہ سے بھٹک کیوں گیا ہے.....! اوہ.....! وہ نظر کیوں نہیں آ رہا.....! وہ نہیں آتا کم از کم رخشندہ ہی آ جائے.....! دلِ بیتاب.....! دلِ بیتاب کو کسی قدر قرار تو آئے.....! میڈم سلمٰی پر ہذیانی کیفیت طاری ہو گئی ہے.....! بظاہر وہ اُن کی طرف.....! ہاں ہاں اُن کی طرف ہی بڑھا آ رہا تھا.....! پھر.....! پھر اچانک.....! اُس کا سایہ.....! اُس کا سایہ معدوم ہو گیا.....! یکدم معدوم ہو گیا.....! اُس کی گاڑی بھی آنکھوں سے اوجھل ہو گئی ہے.....! اُن کی عزیز سہیلی.....! عزیز ترین سہیلی.....! رخشندہ.....! میڈم رخشندہ بھی کہیں کھو گئی ہے.....!

سامنے.....! بالکل سامنے کی طرف ڈھلوان پر بیٹھا اسی پچاسی سال کا بوڑھا بلڈاگ گلے کی زنجیر تھامے سارا منظر دلچسپی سے دیکھ رہا ہے.....! سورج آہستہ آہستہ ڈھلک رہا ہے.....! بے ساختہ طور پر بوڑھے کے ہاتھ سے بلڈاگ گلے کی زنجیر چھوٹ جاتی ہے.....! سورج ڈھل ہو گیا ہے.....! بلڈاگ گیا میڈم سلمٰی کے نزدیک پہنچ کر عجیب و غریب آوازیں نکالنے لگا ہے.....! سورج بالکل معدوم ہو گیا ہے.....! سمندر کی لہریں اندھیرے کی چادر اوڑھ چکی ہیں.....! بلڈاگ میڈم سلمٰی کے قریب.....! اور قریب.....! اور قریب ہو کر اُن کے پیر چاٹنے لگا ہے.....! میڈم سلمٰی کی آنکھوں سے نکلے شعلے شبنمی پھوار میں تبدیل ہو رہے ہیں.....! اُن کے چہرے کی رنگت شگفتہ.....! شگفتہ تر ہونے لگی ہے.....! بوڑھا ہونٹوں پر معنی خیز مسکراہٹ سجائے جیب سے سگار نکال کر سلگا رہا ہے.....! دھوئیں کے مرغولے فضا میں بکھرنے لگے ہیں.....! اوس کے شبنمی قطرے بشاشت کا احساس اُجاگر کر رہے ہیں۔ آہستہ.....! آہستہ.....! دھوئیں کے طاقت ور مرغولے فضا میں دم توڑ رہے ہیں.....! فضا پُراسرار اور پُرسکون ہو گئی ہے.....! ہر طرف امن و شانتی کی چادر تن چکی ہے.....!!!

رُباعیات

عبدالعزیز خالد

(۱)

لفظوں میں نہیں حسنِ تکلّم محصور
اتنا ہی عیاں ہو کوئی جتنا مستور
لب خندِ نہاں بھی تو زباں حسن کی ہے
سرگرمِ سخن بھی ہو نہیں کوئی ضرور!

(۲)

ہے جوشِ نبرد آزمائی بھی وہی
اظہارِ خودی و خود نمائی بھی وہی
عالم ہے وہی کارگہِ عالم کا
ہے پیکرِ خاک کی خدائی بھی وہی!

(۳)

اے عشوہ طراز ساختیانِ ہوش
خُم کے آگے خُم ہوں نہ ہم سے سرکش
ہم کو مئے خانہ ساز کا شوق نہیں
ہیں بادۂ لایزال کے ساغرکش!

(۴)

منگتا ہو کسی کے نہ وہ کچھ کے مارے
غیروں کے لیے تن ہو نہ پَت ورنا کے
سمجھے کسی اوپرے کو اپنا نہ کبھی
بچ کر رہے کامدیو کے بانوں سے!

(۵)

امید و یقیں قوتِ حیاتِ گزراں
ہنگامۂ ہست و بود کی روحِ رواں
امید و یقیں سے رہے پیوستہ بہم
دل کی دروبست، جسم کی تاب وتواں!

(۶)

ان میں سے کہ جن کو کرے وہ طالع مند
کرتا ہے خدا شکر گزاروں کو پسند
اور ان کی اس شکر گزاری کے عوض
ان پر کرتا ہے وہ عطا اپنی دوچند!

(۷)

ساداتِ سخن ہوں کہ غلامانِ ہنر
دزدانِ مضامیں ہوں سخنور اکثر
ہے سرقۂ دانستہ تو مذموم مگر
ہو جائے توارد تو کرو صرفِ نظر!

(۸)

سمجھو نہ ہمیں دیکھ کے یوں افتادہ
پس ماندۂ قافلۂ واماندہ
کی اس لیے اختیار تنہا سفری
تا کر سکیں پرداختِ فکرِ تازہ!

کونارک

بلراج کومل (دہلی بھارت)

فلک بوس مینار
دیوار و در
وصل کا جشن
صد رنگ تصویر
کایا کے سُر
جن میں نر اور ناری نے
سمبھوگ کے سارے امکان
حل کر رہے تھے
سفر گرچہ مٹی کا تھا
پھر بھی دھرتی سے آکاش تک کی
نئی سے نئی رفعتوں کا سفر تھا
سمندر وہ شفاف شاہد تھا ہمسائگی میں
جہاں آسماں اور زمیں کے
سبھی عکس شام و سحر تیرتے تھے

یہ مندر فلک بوس مینار سے آج محروم ہے
پر وہ رتھ، کائناتی، درخشاں و تابندہ رتھ
جلوہ افروز ہے جس پہ سورج
بہاؤ میں اپنے
سماوی و خاکی۔ سبھی کچھ سمیٹے ہوئے
آج بھی روشنی کے سفر پر رواں ہے
کشادہ خموشی میں
سرگوشیوں کی زباں میں
کوئی باب اسرار
امروز بھی لکھ رہا ہے

نیا جنم

رفعت سروش (نوئیڈا بھارت)

بدن پر میلے کپڑے، پاؤں ننگے، مفلسی صورت
اسے احساس تھا وہ سب سے کم تر ہے
یتیموں سے بھی بدتر ہے
وہ بزدل تھا
کرے تذلیل جو اس کی
وہ اس سے جھک کے ملتا تھا
مذمت اپنی خاموشی سے سہتا تھا
مگر اندر ہی اندر ریزہ ریزہ کنتا رہتا تھا
وہ سب کے حکم کا بندہ تھا، لیکن پھر بھی تنہا تھا
اور اک دن ہاتھ سے اس کے پیالہ چھوٹ گیا صبر و تحمل کا
خدا کا شکر ہے وہ مر گیا،
اب خاک سے اسکی
اٹھا ہے ایک باغی نوجواں، خودسر
کسی کو اب نہیں لاتا وہ خاطر میں
جو کل تک اس پہ ہنستے تھے
اسے تکتے ہیں حیرت سے
کہ آخر ماجرا کیا ہے!

ڈاکٹر یوگیندر بہل تشنہؔ (کیلیفورنیا امریکہ)

میرے مولاؐ تیری شہہ پہ سفر میں پاؤں رکھ رہا ہوں
اسمیں تیری رضا ہے شامل، اس لئے سفر کر رہا ہوں

میرے ہر لمحے کا تو مالک، تو ہی مالک زیر و زبر کا
تجھ سے باہر تو کچھ نہیں، پورے وثوق سے مانتا ہوں

حیات دیگر حیات لینا' تیرا ہی حق ہے میرے مولا
کس میں جرات ہے جو چوں چراں کی، تجھے اپنا گردانتا ہوں

دلّی ہو کہ ہو امریکہ، جو ہونا ہے وہ ہو کر رہے گا
ہاتھ بندے کے کچھ نہیں ہے، میں بخوبی یہ جانتا ہوں

کیا ہوا جو ہو سکا نہ میرا میڈی انشورنس اے دوست
میرے ہمراہ ہے میرا مولاؐ میں یقین سے مانتا ہوں

وہ ہی مشکل کشا ہے میرا، وہ ہمدرد و ہمنوا بھی
ہے ہمیشہ ساتھ میرے، میرا پتا ہے، پہچانتا ہوں

ماسوا اُسکے نہ ہو گا کوئی، اجنبی شہر میں میرا
میرے سر پہ ہے سایہ اُس کا، میں یقیناً یہ جانتا ہوں

قدم قدم پہ، لحہ لحہ، ساتھ ہو گا وہ میرے ہمدم
غیر ممکن گزند پہنچے، یقین ہے محکم، مانتا ہوں

دست بستہ دے رہا ہے تشنہؔ اپنی پتوار تیرے ہاتھ
تیری مرضی جیسے رکھ، حوالے خود کو میں کر رہا ہوں

لکیروں کا سوگ

علیم صبا نویدی (بھارت)

نامکمل ہے ابھی میری بیاضِ زندگی
دے چکا ہوں وقت کو اپنے ارادوں کا لہو
اپنے ارمانوں کا صالح اور پاکیزہ لہو
پی چکا ہوں عمر بھر صحرا کے ویرانے کی دھوپ
موسموں کی طرح بدلے میں نے بھی سو بار روپ
چاندنی کی چھاؤں میں بھی زیست محوِ یاس تھی
وقت کے ایندھن میں جا کر روح سہمیا اس تھی
مجھکو مرے ہاتھ کی ریکھا بھی بیوہ ہی ملی

آگے بڑھ کر کون دے گا بیوگی کو اب سہاگ
روح بھی زخمی ہے میری، آس بھی بسمل ہے آج
میرے اندر ہی چھپا شاید مرا قاتل ہے آج
اب کہاں لے جا کے دفناؤں بھلا میں اپنا بھاگ

حوصلے بھی بجھ گئے ہیں قرب کے شعلوں کے سات
میرے اندر ہی سمٹ کر رہ گئی ہے میری ذات

تمہارے لئے

قیصر تمکین

(لدھیانہ میں جشنِ ساحرؔ کے موقع پر منعقد ہونے
والے ایک ہند مشاعرے میں پڑھی گئی)

میں اپنے دامنِ احساس میں تمہارے لئے
دیارِ پاک کے سارے گلاب لایا ہوں
محبتوں کے جو تم نے پیام بھیجے ہیں
گلوں پہ لکھ کے میں ان کے جواب لایا ہوں

زمینِ ساحرِ جادو بیاں پہ حاضر ہوں
پیامِ جاں لئے اقبالؔ کے دیار سے میں
ہے فیضؔ کا سخنِ دلستاں بھی پاس مرے
کروں گا نذر جو صد حُسنِ اعتبار سے میں

دمِ سفر یہ کہا مجھ سے روحِ وارثؔ نے
کہ اہلِ درد بُھلائیں نہ ہم فقیروں کو
جہاں کہیں بھی بسے ہوں سلام پہنچے مرا
دیارِ ہند کے رانجھوں کو اور ہیروں کو

تمہاری بزمِ شبانہ کو اب محبت کا
فریدِ گنج شکر نے پیام بھیجا ہے
میں اُٹھ کے آیا ہوں نانک کے بادہ خانے سے
گرو نے بادۂ عرفاں کا جام بھیجا ہے

تمہیں بھی یاد ہے ہم بھی وہ وقت بھولے نہیں
جب ایک ساتھ ہمارے یہ دل دھڑکتے تھے
کچھ اس طرح تھے فدا ایک دوسرے پر ہم
کہ تم جو ہم پہ تو ہم تم پہ جاں چھڑکتے تھے

خوشا کہ آج پھر آئی ہے رت محبت کی
کھلے ہیں شاخِ دل و جاں پہ اعتماد کے پھول
نظر نظر میں ہیں امید کے دیے روشن
کہ ہونے والے ہیں پھر وضعِ دوستی کے اصول

مگر یہ یاد رہے تم بڑھے جو ایک قدم
تو ہم تمہاری طرف سو قدم بڑھائیں گے
تم ایک بار ہمارے قریب تو آؤ
ہم اپنی پلکوں پہ یارو تمہیں بٹھائیں گے

نظر لگے نہ تمہارے بھی دست و بازو کو
رہیں ہمارے سلامت یہ دست و بازو بھی
جہاں کو آؤ بتا دیں یہ ہم گلے مل کر
کہ قہقہے بھی ہیں ساجھے ہمارے آنسو بھی

وفا کی راہوں پہ دشوار ہے مگر چلنا
یہ ہم بھی جانتے ہیں اور سمجھتے ہو تم بھی
وفا پنپتی نہیں ہے بغیر قربانی
ہمیں بھی سوچنا ہو گا یہ سوچ لو تم بھی

کل جو ہوتا ہے آج ظاہر ہے

دِل نواز دِل

اَشک آنکھوں میں اَب نہیں آتے
کوئی صورت دِکھائی دے کیسے
ظُلم ہوتا ہے ہر طرف اَب تو
اَب سِتم کی نہیں ہے حد کوئی
جس کو دیکھو وہی سِتم گر ہے
جس سے پوچھو نہیں خبر اُس کو
اَب نہیں دُنیا سے سب کے سب نالاں
صُبح کرتے ہیں شام کرتے ہیں
آہ بھرتے ہیں رات دن سارے
خون کرتی ہے خود شَفَق اپنا
ڈوب جاتا ہے بحر میں سُورج
چاند روتا ہے موج میں آکر
اور بِکھرتے ہیں ٹوٹ کر تارے
عَدل کوئی نہیں ہے دُنیا میں
اِس پہ اِحسان کیا کرے کوئی
سب کی آنکھوں میں ایک دہشت ہے
سب دِلوں میں جہاں کی وحشت ہے
ایک جنگل ہے یہ زمانہ اَب
گھات کرتے ہیں پیڑ شاخوں سے
دُکھ میں نِکلے تو غم ملتا ہیں ہیں
ایک صحرا ہے سب کی آنکھوں میں
سُرخ آندھی جہاں پہ چھائی ہے
قتل ہوتے ہیں اب ہزاروں میں
زندگانی کا دِل سے ماتم خود
اَب کرے تو کرے کوئی کیسے
ایک لاشہ پڑا ہے ہر گھر میں
اور گلی میں ہے لہو لہو دیکھو
زندگی کیا ہے موت ہے اَب تو
جو مہذب ہیں لوگ وحشی ہیں
جن کا تہذیب اور تمدُّن سے
کوئی رشتہ نہ کوئی ناتا ہے
یہ مہذب ہیں صرف کہنے کو
اِن کی آنکھوں پہ حرص چھائی ہے
یہ بُجاری ہیں لوبھ کے بُت کے
یہ ہیں اَندھے تمام دُنیا کے
یہ ہیں بہرے جنم جنم کے سب
کب یہ سُنتے ہیں بات دُنیا کی
دیکھ کر بھی یہ سچ کو کیوں دیکھیں!
اِن کو جمہور کی ہے فکر سُنو!
اِن سے دُنیا کے حق کا ذِکر سُنو!
سب کو آزاد کرنے آئے ہیں
کوئی اِن کا غُلام ہو کیسے!
اِن سے کوئی کلام ہو کیسے!
صید حیلے کے یہ بہانے کے
یہ ہیں صَیاد اِک زمانے کے
اِن کا انجام کیا ہے کیا جانوں
دِل جو کہتا ہے میں وہی مانوں
دِل کا کہنا ہے اِن کی آخر ہے
کل جو ہوتا ہے آج ظاہر ہے

حرف مدعا

ڈاکٹر مناظر عاشق ہرگانوی

نامرادی کے بگولے
روح کی پہنائیوں میں
کھو گئے ہیں
اب کسی تحریک پر
میں تال دے سکتا نہیں
درد میں ڈوبی ہوئی
اک گونج
احساسات سے
دامن چھڑا سکتی نہیں
یاس کی تاریکیوں میں
ڈوب کر
آنسو مچل سکتے نہیں
ہر طرف جو کچھ ہوا
دیکھا سنا
پھر بھلا کیوں
راستے کے پیچ و خم سے
دل مرا گھبرا رہا ہے

یُونس صابر

کاروکاری

لوگ ابھی تک بُھتاراں اور گاؤں کی وہ پنچائیت
بھول نہیں پائے اُن کی نفسا نفسی' ماروماری
اک دن تو انصاف ملے گا حوا کی بیٹی کو جو
سہتی ہے آدم کے بیٹوں کے ہاتھوں کاروکاری

اُبو غریب جیل (پنجابی ہائیکو)

اُجڑ گیا بغداد تے اُبو غریب چ بند اسیراں توں
ہٹلر نال ہلاکو دوہاں دی رُوحاں شرمندہ نیں
کئی ہزار شہید تے ہو گئے بیوہ ماواں نال یتیم
پر' کالے کرتوتاں والے گورے اج کیوں زندہ نیں

لکھاری (ہندکو ہائیکو)

کدے اُردو' کدے ہندکو' کدے بولے او پنجابی
او ساڈے شہر دا واسی اے' اُس دا دل پشوری اے
او سندھی اے' بلوچی اے یا پشتو اے زبان اُس دی
لکھاری حرف تے واری' پشوری یا لہوری اے

علی آذر

(نذرِ پروین شاکر)

دوست میرے سب کے سب نظروں میں دھندلانے لگے
اجنبی لوگوں کے چہرے جانے پہچانے لگے . . .!

زندگی میں کوئی آتا ہی نہ تھا دروازے پر . . .
جب خبر مرنے کی پہنچی، سب کے سب آنے لگے

ساتھ میرے گھومتے پھرتے رہے ہر ہر جگہ . . .
ہم سفر کا فیصلہ ہوتے ہی شرمانے لگے . . .

اک ذرا رنجش کا سُن کے سب تمہارے "خیرخواہ"
چپکے چپکے، دھیرے دھیرے، تم کو بہکانے لگے

نوجوانی کی وہ باتیں سوچنے جب لگ گیا . . .
واقعے سارے کے سارے، مجھ کو افسانے لگے . . .

لوگ سارے جا رہے تھے جانب دارورسن . . .
عشق میں سرشار سب کے سب وہ دیوانے لگے

جب علی آذرؔ نے "خوشبو" کے دریچے وا کیے
دل کے گھر کو خوشبوؤں کے رنگ مہکانے لگے

ورلڈ ٹریڈ سینٹر کا ملبہ

فیصل عظیم

عمارت کیا گری!
محسوس ہوتا ہے،
کہ اپنے گھر کے بھی دیوار و در ٹوٹے
ہمارے سر پہ گویا چھت نہیں باقی
کھڑے ہیں بے سر و سامان، بے سایہ
"کسی" کا سانحہ
"ہم" کو بلا کی دھوپ میں لایا
کبھی تو پاؤں جلتے تھے
مگر اب سر بھی زد پر ہیں
یہ سمجھیں جیسے اب ہم سب فنا ہونے کی حد پر ہیں
عمارت کیا گری!
ہم لوگ میلوں دور بھی بکھرا گئے جیسے
ہم اس کے ٹوٹتے ملبے کے نیچے آ گئے جیسے
وہ پتھر، اینٹ اور گارا تو آخر ہٹ ہی جائے گا
مگر ہم پر گرا جو، کون "وہ" ملبہ ہٹائے گا؟
ہمارے ساتھ ہے تہذیب اور تاریخ بھی شاید!
سنائی دی ہے ہم کو دینِ حق کی چیخ بھی شاید!
صدا زخمی سہی لیکن غنیمت ہے، صدا تو ہے!
ہمیں خود احتسابی کا کوئی موقع ملا تو ہے!

صلیبِ حق

عائشہ ثروت

کیوں میرے یہ ہمسائے
اب نظر بچاتے ہیں
سچ نظر نہیں آتا۔
حق کو سن نہیں سکتے۔
کیوں کسی برائی کو
یہ برا نہیں کہتے
کیوں کسی بھی حق گو کا
ساتھ یہ نہیں دیتے۔
جس کو یہ برا جانیں
منہ پہ یہ بھلا کہہ دیں۔
جس کو یہ بھلا مانیں
اُس پہ صرف تنقیدیں
یہ حوالے لاتے ہیں۔
قول اور حدیثوں کے
عیسوی زمانے کے
موت اور صلیبوں کے
فرق صرف اتنا ہے۔
جسم تب صلیبی تھا۔
اب ضمیر لٹکے ہیں۔
تب کا جسم حق پر تھا۔
اب صلیب حق پر ہے۔

لمحوں کے چراغ

مخمور سعیدی

وہ روشنی جو سیہ بادلوں کی آڑ میں ہے
کبھی کبھی اتر آتی ہے دل کے آنگن میں
تو زندگی کے وہ نقش و نگار دیرینہ
جو مٹ چلے تھے پھر اک بار ابھرنے لگتے ہیں
نظر کے رنگ اچانک نکھرنے لگتے ہیں
گمان خود اپنے پہ کیا کیا گزرنے لگتے ہیں

وہ روشنی جو سیہ بادلوں کی آڑ میں ہے
کبھی کبھی اتر آتی ہے دل کے آنگن میں
تو صبح و شام گزشتہ کی ساری رعنائی
افق سے تا بہ افق جیسے پھیل جاتی ہے
جہت جہت کے دریچے سے مسکراتی ہے
نظر نظر کو ہزار آئنے دکھاتی ہے

وہ روشنی جو سیہ بادلوں کی آڑ میں ہے
کبھی کبھی اتر آتی ہے دل کے آنگن میں
تو کتنی یادوں کے ڈوبے ہوئے ستاروں کو
نظر کے سامنے جلوہ طراز پاتا ہوں
تمام بجھتے چراغوں کی لو بڑھاتا ہوں
اندھیرے میرا مقدر ہیں، بھول جاتا ہوں

''کتاب عشق''

علیم صبا نویدی (چنئی۔ بھارت)

صلاح الدین پرویز کی ''کتاب عشق'' ایک ایسے شاعر کے ذہن اور دل کی اس کیفیت کی ترجمان ہے جو برسوں کے فکری انہماک' تجربات' احساسات' معاملات' اجتہاد و اعتقاد کی بھٹی میں پگھل کر ایک موضوع فراہم کرنے میں کامیاب ہوئی ہے۔ وہ موضوع ہے عشق۔ یہ موضوع کئی سطحوں پر اردو شاعری میں ابھرا ہے مگر اس کی دو ہی صورتیں مقرر کر دی گئی ہیں۔ یعنی عشق حقیقی اور عشق مجازی۔ عشق کے موضوع پر اظہار خواہ وہ مذکورہ کسی بھی صورت سے متعلق کیوں نہ ہو بیشتر قیاسی اور روایتی ہی رہا ہے اس موضوع پر جستہ جستہ اشعار بھی ملتے ہیں اور نظمیں بھی۔ اسی موضوع پر مثنویاں بھی تحریر ہوئی ہیں۔ جن میں عبدالرحمٰن شاطر مدراسی کی قصیدہ نما مثنوی ''اعجاز عشق'' قابل بیان ہے۔ جو آج سے بہت پہلے رقم ہو چکی ہے۔ جس کو اس وقت کے اکابرین نے اپنی بہترین آراء سے نوازا ہے۔ شاطر نے عشق کے ہر پہلو کو ابھارنے کی کامیاب کوشش کی تھی۔ ''اعجاز عشق'' کو ہم اس موضوع کی تمام شعری کاوشوں میں بہترین کاوش قرار دیں گے۔ عشق کے موضوع والی شاعری حظ و نشاط کے ساتھ ساتھ ایک خاص وجدان پیدا کرنے والی شاعری ہے۔ عشق مجازی میں فکر کی آبیاری زیادہ ہوتی ہے اور عشق حقیقی میں جذبہ و اعتقاد کی کارفرمائی۔ جذبہ اور اعتقاد کا تعلق ذہن سے زیادہ دل سے ہوتا ہے اور دل ہی وہ مقام ہے جہاں کوئی بات جب سما جاتی ہے تو پھر اس کا وہاں سے نکل جانا محال ہوتا ہے وہاں جم کر ہر حیثیت سے اپنے عروج کو پہنچتی ہے۔ جذبات اور اعتقادات جب عروج پاتے ہیں تو کئی صالح قدروں کو ساتھ ساتھ سنبھالا دیتے ہیں اور یہ قدریں سارے وجود کو اپنی ملکیت میں لے لیتے ہیں۔ فرد کا وجود، وجود محض نہیں رہتا بلکہ وہ تمام عالم کو اپنے احاطہ میں لے لیتا ہے۔ یہاں تک کہ عرش و کرسی اور صاحب عرش و کرسی کو بھی اپنے اندر سمو لیتا ہے۔ صاحب عرش و کرسی تک پہنچنے کے لئے کئی مقامات سے گزرنا پڑتا ہے اور یہ وہ مقامات ہیں جہاں کائنات کی بہترین تخلیقات کا قیام ہوتا ہے۔ یہ وہ مقامات ہیں جہاں اللہ کے برگزیدہ بندے ہوتے ہیں۔ جن کے نام سے ہی عقیدت و احترام کی جبیں سجدہ ریز ہونے لگتی ہے۔ اس کا یہ مطلب ہوا کہ عشق حقیقی محض کسی ایک ''وجود'' سے عشق کا نام نہیں ہے بلکہ موجودات کی تمام پاکیزہ اور صالح ہستیوں سے عشق ہے اور اس کی انتہا پر سرور کائنات فخر موجودات صلی اللہ علیہ وسلم ہیں جن کی خاطر ہی اس پوری کائنات کی تخلیق عمل میں آئی ہے۔ عشق کی ان منزلوں سے ہر ایک گزر سکتا ہے بشرطیکہ اس کا سفر صدق خلوص و عقیدت و انتہائے طہارت دل ہو۔ اس راہ پر گامزنی میں بڑی دقتیں ہیں اس میں سب کچھ کھونا پڑتا ہے کیا کیا کھونا پڑتا ہے اس کی کوئی فہرست ہی نہیں بنائی جا سکتی۔ البتہ اتنا کہہ سکتے ہیں کہ ہر فانی چیز کو یہاں فنا کرنا پڑتا ہے اور اس وقت تک فنا کرتے رہنا ہے کہ کچھ بھی نہ بچے۔ منزل بہ منزل وجود کے اندر سے ایک ایک چیز گھٹتی جاتی ہے اور آخر میں صرف حیرت و استعجاب کے ساتھ تکنے والی وہ ذات رہ جاتی ہے جس کے لئے سفر طے کیا گیا۔ اس انتہائی منزل ہی کو صوفیاء کے پاس اصطلاحاً حقیقت محمدی کا نام دیا گیا۔ عاشق جب وہاں پہنچتا ہے تو عرش و کرسی کے قریب ہو جاتا ہے اسی مقام کے لئے ''قاب قوسین او ادنیٰ'' کہا گیا۔

صلاح الدین پرویز ''کتاب عشق'' میں ''عشق مکتوب'' سے آغاز کرتے ہیں اور اپنے خالق کے نام ۴۲ مکتوبات پیش کرتے ہیں۔ ۳۹ ویں مکتوب میں وہ اپنے طور پر حقیقت محمدی کا مشاہدہ کرتے ہیں۔ اور اسی مشاہدہ کے باعث ان کی زندگی بھر کی اکٹھی کی ہوئی ساری قوت اظہار سمٹ کر عشق کے محاورے میں ضم ہو جاتی ہے اور وہ ایک ایسی کتاب کے مصنف بنتے ہیں جو ان کی حقیقی عبادت ہے۔

صلاح الدین پرویز صاحب کا کہنا ہے کہ ان کو رو عشق کے عجائبات کا مشاہدہ ہوا ہے۔ صرف مشاہدے سے انہیں آتش نہفتہ کا احساس ہوا اور ابھی انہیں قلم تحریر کر پائے ہیں تو اگر اس راہ میں سفر کرتے تو شاید عالم حیرت میں ان سے ایسی کوئی نظم تصنیف ہو ہی نہیں پاتی۔ رہ عشق کے عجائبات سے آپ نے بہ واسطہ علم ہی شناسائی کی ہوگی۔ آج لوگ اس طرح کی شناسائی کے لئے بھی تیار نہیں ہیں۔ یہ شناسائی بھی عاشقی ہی کی ایک منزل ہے اور آج شہر ان عاشقوں سے خالی دکھائی دیتے ہیں۔ وہ چاہتے ہیں کہ ان کی نظم کا شور ان مردہ دلوں کو جگا دے اور ان میں بھی عشق کی آگ روشن ہو جائے۔ انہیں بہ واسطہ علم جس عشق سے شناسائی ہوئی وہ اُن ہستیوں ہی سے شناسائی کے باعث ہے جنہیں ہم حافظ شیرازی' عمر خیام' عراقی' جامی' سعدی' عطار' سنائی' منصور حلاج کہہ سکتے ہیں یا مولانا روم' شمس تبریز' نظام الدین اولیاء' حضرت بختیار کاکی' خواجہ معین الدین چشتی' حضرت فاطمہ' حضرت حسن' حضرت حسین' حضرت علی کرم اللہ وجہہ اور ان تمام کے واسطے سے مدینۃ العلم صلعم تک آپ کا علمی سفر ہوا ہے۔ اس علم میں بھی عشق کے حصول کا عنصر موجود تھا اسی کے باعث صلاح الدین پرویز کا مطالعہ، مشاہدۂ عشق سے ہوتے ہوئے تجربۂ عشق تک پہنچا اور جہاں مشاہدے ہی میں گہری گہری تھی تو تجربہ میں یہ گہری مزید تقویت پا کر اس منزل کو پہنچ گئی جس کو پا لینے کے بعد انہوں نے تمام باکمال بزرگوں سے ملاقات بھی کر لی اور ''کتاب عشق'' مکمل بھی کر لی۔

''کتاب عشق'' پڑھتے وقت اس کے قارئین پر جو اثر مرتب ہوتا ہے وہ اگر بیان کر دیں تو صلاح الدین پرویز کے اظہاریہ کو داد مل جائے گی۔ الباب الاول پڑھتے وقت قاری کے روبرو وہ ندی مقدمہ جیلانی کامران تھا اور ندی صاحب تصنیف کی تحریر ''قصۃ العشق''۔ یہ دونوں مضامین الباب الثانی میں ہیں۔ الباب الاول ہی میں ''عشق مکتوب'' کے تحت خدا کے نام چالیس مکتوب ہیں۔ ان مکتوبات کا اسلوب صلاح الدین پرویز کا پسندیدہ اسلوب ہے۔ اشعار کیا ہیں ہلکی ہلکی موجوں پر رواں کشتی کے ہچکولے معلوم ہوتے ہیں۔ اس میں

شاعرانہ نیرنگیاں اور فکر و احساس میں وجدان پیدا کرنے والی پوری جمالیاتی کیفیت موجود ہے۔ زبان و اظہار اتنے شستہ ہیں کہ قاری کی طبیعت ان چالیس نظمیات ہی کو متعدد دفعہ پڑھنے پر آمادہ ہوگی۔ یہ مکتوب آزاد اور نثری نظمیں ہیں جو بہترین اظہار کا مرقع دیئے جا سکتے ہیں۔

الباب ثانی میں جیلانی کامران کا عکس نامہ ہے جس کو اس کتاب پر بہت تبصرہ کہہ سکتے ہیں۔ پھر صلاح الدین پرویز صاحب کی اپنی تحریر "القصة الحسن لا لفصام لها ..... " ہے۔ صلاح الدین پرویز صاحب نے اس میں ایسی باتیں بیان کی ہیں جو اپنی نظم سے متعلق بھی ہیں اور نظم سے ہٹ کر بھی۔ اس تحریر سے ان کی پوری نظم کو سمجھنے میں بڑی مدد ملتی ہے۔ وہ جن ذہنی اور دلی مرحلوں سے گزرتے ہیں اس کی ترتیب بھی ہے اور مقصد بھی۔ اس "کتاب عشق" میں قاری بعض حصوں کو بار بار پڑھے گا۔ مثلاً "خوش کردم اے جاناں" میں بندے کا اس کے سفر اور عشق سے تخاطب کا انداز بڑا والہانہ ہے یہ حصہ تو بڑا ہی جمالیاتی اور بے ساختہ ہے۔

اے عشق!
تیرا راستہ
تنہائی اور مستی ہے
تکمیل باش بشو
خاک سے چرخ تک
جسم سے روح تک
میں سے تو تک.....
سب تیرے ہی غلام ہیں

اس طرح کا انداز یا پھر پابند نظم کے انداز جا بجا نظم کے درمیاں آتے ہیں۔ وہ یا تو نظم کے کسی عنوان کے ساتھ ہیں یا پھر یہ عنوان "رقص" ہیں۔ جہاں بھی رقص کا مضمون آیا ہے وہاں ایسا لگتا ہے کہ صلاح الدین پرویز وجدان میں آ کر رقص میں شریک کر لیتے ہیں۔ یہ رقص وحشی نہیں بلکہ رقص سرود و خوشی ہی معلوم ہوتا ہے۔ ایک رقص کا ایک بند ملاحظہ کیجئے۔

اے عشق تو میرا طبیب
اے عشق تو میرا نصیب
اے عشق تو میرا حبیب
اے عشق تو میرا رقیب
اے عشق مجھ کو لوٹ لے
اے عشق مجھ کو لوٹ لے

جہاں بھی کوئی رقص آیا ہے اس میں عشق ہی کو مخاطب بنایا ہے۔ البتہ ایک "رقص" میں شاعر نے اپنی (یا عاشق) کی بدلتی ہوئی کیفیتیں بیان کی ہیں مگر اس کا آہنگ ایک صوت ناز ک ہے اس کا ہر مصرعہ اپنی جگہ ایک گہر ہے۔ اس کا ایک حصہ ملاحظہ کیجئے۔

سوختہ ہے ہوا کی
سوختہ ہے زہرہ کی
سوختہ حسن کی کی
سوختہ ہے شجر کی
تو حال نہیں لکھا
تو میر نہیں لکھا
اسے کچھ نہیں ہوا
ایک پل کچھ نہیں سنا
جب تک مری میت کو
دیکھیں نہ مجھ کی
تو یونہی مسری رہتا
تو یونہی مسری رہتا

"کتاب عشق" میں بقول عبدالاحد ساز "لحن ہندی بھی ہے اور رقص داؤدی بھی" حسب موقع صلاح الدین پرویز نے اس میں ہندی آمیز زبان بھی استعمال کی ہے اور عربی و فارسی آمیز زبان بھی۔ جہاں بھی پابند شاعری ہوئی ہے ان کی زبان ٹھیٹ روایتی طرز کی ہے بہت ہی تراکیب آزاد اور نثری شاعری میں بھی استعمال ہوئے ہیں۔ اس کا مطلب یہی ہے کہ اس نظم کو طویل مدت میں ختم کرنے کی باعث جیسی جیسی ذہنی حالت رہی ہے زبان بھی ویسی ہی استعمال ہوئی ہے۔ انہوں نے خود تحریر کیا ہے کہ نظم کے ختم کر لینے کے بعد بھی تین چار سال تک اس کو شائع کرنے سے رہے اور اس دوران اس کا خود ہی بار بار مطالعہ کیا اور قطع و برید یا ترمیمات سے کام لیا۔ تاہم لفظیات میں زیادہ ردّ و بدل نہیں کیا ہے اور جوں کا توں رہنے دیا ہے۔

بنو نجار کی بچیوں نے "طلع البدر علینا"..... کا گیت دف بجا کر گایا تھا اور حضور پُر نور صلعم کے یثرب میں استقبال کیا تھا اس کو "سنگل سے سواگت ہے" کے عنوان سے صلاح الدین پرویز نے ایک نیا ہی انداز دیا ہے جیسے یہ گیت ہندوستان کے کسی پہاڑی علاقے میں گایا گیا ہو۔ منظر تو یثرب ہی کا ہے مگر گیت ہندوستانی طرز کا ہے۔ اسی گیت کے ساتھ حضور پُر نور صلعم کو یثرب میں نہیں سب کے دلوں میں جگہ دے کر صلاح الدین پرویز صاحب نے "کتاب عشق" ختم کی ہے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی آمد کے بعد دل میں اور کون سا مضمون رہ سکتا ہے۔ لاکھ صلاح الدین پرویز صاحب کہیں کہ وہ "کتاب عشق" غیر مکمل ہی پیش کر رہے ہیں مگر عشق کے موضوع کا پھر آغاز ہو سکتا ہے مگر انجام سرور کائنات صلی اللہ علیہ وسلم ہی ہیں تو ہر بار عشق کی کوئی کتاب آپ ہی پر تکمیل پائی رہے گی۔

یہ کتاب بہ حیثیت موضوع تو بہت ہی انوکھی ہے مگر تکنیک فن شاعری صلاح الدین پرویز صاحب کا شہکار ہے جس کی نوعیت اپنی جگہ مسلم ہے اور اس طرز کی شاید پہلی تصنیف ہے۔

تخلیقِ عصر

تازہ تصانیف کا تعارف

عطیہ سکندر علی

سر سید احمد خان اور جدت پسندی

ڈاکٹر محمد علی صدیقی کا شمار ملک کے چیدہ اہلِ دانشوں میں ہوتا ہے۔ اُن کی تخلیقات دنیائے اردو میں رہنمائی کا فریضہ نبھا رہی ہیں۔ ڈاکٹر صاحب جس موضوع پر لکھتے ہیں اس کی جستجو کھوج اور سراغ تک پہنچنے کے بعد لکھتے ہیں۔ کوئی پہلو ایسا نہیں ہوتا جو پڑھنے والے کو تشنہ معلوم ہو۔ "سر سید احمد خان اور جدت پسندی" ڈاکٹر محمد علی صدیقی صاحب کی عرق ریزی کا ایسا عمدہ نمونہ ہے جس سے سر سید احمد خان کی شخصیت اور زیادہ روشن اور نمایاں ہو گئی ہے۔ ڈاکٹر محمد علی صدیقی کے دیباچے سے اقتباس ملاحظہ فرمایئے۔ "سر سید احمد خان اپنے زمانہ میں ایک صدی آگے کی بات کرتے تھے اور آج جب کہ ہم ۲۱ویں صدی میں قدم رکھ چکے ہیں تو یوں لگتا ہے کہ مسلم برصغیر نے فکری طور پر ترقی معکوس پر چلنے کا تہیہ کر رکھا ہے اور سر سید احمد خان کی فکر بطور خاص اُن کے مذہبی خیالات یعنی بطور خاص وہ خیالات جو تفسیر القرآن میں ظاہر ہوئے اسی طرح شجرِ ممنوعہ ہیں جیسا کہ انیسویں صدی میں تھے۔"

عنوانات پر توجہ فرمایئے "عالم اسلام میں جدت پسندی کی تحریک اور سر سید احمد خان"، "سر سید کی مذہبی فکر اور سیاست"، "سر سید احمد خان اور الہٰ آباد"، "سر سید احمد خان انگریزی حکومت اور مسلم مفادات"، "سر سید اور حرمتِ سود"، "سر سید اور اُن کے رفقا کا تصورِ علم"، "سر سید احمد خان اور تعلیم"، "سر سید احمد خان اور تہذیب الاخلاق"، "سر سید احمد خان شبلی اور مسلم سیاست"، "سر سید اور اقبال"۔

اس کے علاوہ ضمیمہ جات کے عنوان سے سر سید کا سوانحی خاکہ گراہم کی غلط فہمیوں کا ازالہ، عرض داشت سر سید برائے ورنیکلر یونیورسٹی، ہندوستان میں اعلیٰ تعلیم اور گورنمنٹ کیا کنٹرولڈ یونیورسٹی ایک دستوری اشاعت: اصول و ضوابط محمڈن اینگلو اورینٹل ڈیفنس دستوری اشاعت: اصول و ضوابط علی گڑھ کالج کے یوم تاسیس پر روزنامہ پائنیر کا تعارفی مضمون۔ ضخامت دو سو تیس صفحات مجلد عمدہ کاغذ نفیس پرنٹنگ کے ساتھ قیمت صرف ایک سو اسی روپے۔ دستیابی کا پتہ مشفق اکیڈمی اردو بازار کراچی۔

جہات

"نئے تنقیدی مضامین کا مجموعہ "جہات" کے ساتھ حاضر ہوں۔ جن قارئین نے اس مجموعے سے پہلے شائع ہونے والے میرے مضامین کے مجموعوں نشانات، مضامین اور اشاریے کا مطالعہ کیا ہے وہ واقف ہوں گے کہ میرے ہر مجموعہ مضامین میں نظری مباحث کے ذیل میں آنے والے مضامین ضرور شامل ہوتے ہیں۔ اس مجموعے کے پہلے حصہ میں بھی بعض مضامین نظریاتی ہیں۔" (ڈاکٹر محمد علی صدیقی)

"جہات" میں بارہ مضامین کا پہلا باب بڑی اہمیت کا حامل ہے جس میں جدید مضامین کے علاوہ جمال الدین افغانی، نیاز فتح پوری، پروفیسر کرار حسین، سید سبط حسن، احتشام حسین، ضمیر نیازی پر مبسوط اور جامع مضامین قلم بند کیے گئے ہیں۔ گلشن کے عنوان سے عصمت چغتائی، مستنصر حسین تارڑ، اقبال مجید، آغا سہیل، زین سنگھ، کمال مصطفےٰ کی فن و شخصیت کو مزین کیا گیا ہے۔ شاعری کے باب میں میر انیس، بہادر شاہ ظفر، علامہ اقبال، ن م راشد، فراق گورکھپوری، علی سردار جعفری، کیفی اعظمی، حبیب جالب، امجد اسلام امجد، جون ایلیا، مرتضیٰ برلاس، پروین شاکر، حسن عابد، واحد بشیر کا احاطہ بڑی وضاحت اور بالغ نظری سے کیا گیا ہے۔ جہات کا دائرہ اس قدر وسیع، بامعنی اور مفید ہے کہ چند دنوں میں قاری بہت سے ادبی، علمی سنگ میل عبور کر سکتا ہے۔ صوری و معنوی دونوں اعتبار سے "جہات" ایک سے زیادہ جہات کی حامل ہے جس کی قیمت صرف دو سو روپے اور دستیابی مکتبہ دانیال، عبداللہ ہارون روڈ کراچی۔ ویلکم بک پورٹ، اردو بازار کراچی۔ مشفق اکیڈمی اردو بازار کراچی سے ممکن ہے۔

گم ہوتا آسمان

جناب رفعت مروش موضوعات اور تجربات کے اعتبار سے کہنہ مشق اور قادر الکلام شعرا میں نمایاں مقام کے حامل ہیں۔

یہ زمیں حسین و دلکش مگر آسمان کی زد میں
کہ ستارے اس کے دشمن رہے بغض اور حسد میں

مقصود "گم ہوتا آسمان" پر آپ کی توجہ دلانا ہے مگر ایک شعری ہماری بات کو اس قدر وزن فراہم کر رہا ہے کہ بات خود بخود آگے بھی بڑھ رہی ہے اور عمدگی سے بن بھی رہی ہے۔

بس ایک حرفِ محبت، بس ایک لفظ وفا
ہمارے پاس نہیں اور کچھ بس اس کے سوا

بڑھتے رہیئے پڑھتے رہیئے کہ صداقت ملاحظہ فرمایئے۔

مری سرشت میں کیا چیز ہے مرے معبود
بکھر بکھر کے سمٹتا رہا ہے میرا وجود

نظموں کا باب بھی اس قدر بھرپور طاقتور ہوتا ہے کہ آپ چاہیں بھی تو اس سے صرفِ نظر نہیں کر سکتے۔ حرفِ آزاد کے عنوان سے فرماتے ہیں۔

اچانک ایک شعلہ سا جو لپکا دشتِ ہستی میں
تحیر تھا زمانے کو کہ یہ کس کی صدا گونجی
جھنجھوڑا ہے یہ کس نے سالہا سال کی زندہ لاشوں کو

غلامی کو پسینہ آ گیا، گھبرا کے کروٹ لی

اس کے علاوہ حضرت امیر خسرو، میاں غالب، نذر سیّد، ٹیگور، حرف آزاد ایک سوال اور فیض منزل کے عنوان سے ڈاکٹر ذاکر حسین اور فیض احمد فیض کو بڑی دلسوزی سے یاد کیا گیا ہے۔ "گم ہوتا آسمان" ہمارے خیال میں نہایت باوزن باوقار اور بامعنی شعری نسخہ ہے جس کی تڑپ ہر صاحب ذوق کو ہونا چاہئے۔ تسکین طلب کے لئے نرالی دنیا پبلی کیشنز، بازار دلی گیٹ، دریا گنج نئی دہلی سے رجوع کیجئے۔ ایک سو چوبیس صفحات کا یہ دلکش دیدہ زیب شعری نسخہ صرف چار صد روپیے کے عوض آپ کا منتظر ہے۔

ابابیلیں نہیں آئیں

ڈاکٹر حنیف ترین پیشے کے اعتبار سے اور ذوق سخن کی تڑپ کے زیر اثر دو طرح کی مسیحائی کا علم اٹھائے ہوئے ہیں۔ اُن کے وجود میں بلکہ وجود کے انگ انگ اور پور پور میں انسانیت کا درد و کرب بری طرح حاوی ہے۔ آب کی مانند تڑپ رہا ہے اُن کی بد قسمتی کہ جس دور میں وہ جی رہے ہیں یہی اسی دور میں تلوار کی دھار اُن کی اپنی شہ رگ کاٹنے پر بضد ہے۔ وہ دوسروں کا درد و غم باٹتے باٹتے اپنے وجود پر ٹوٹنے والے ظلم و ستم پر جب آہ بھرنے لگتے ہیں تو اُن پر بنیاد پرستی کا الزام دھر دیا جاتا ہے۔ یہ ایک ایسا گناہ ہے جو اُن کے سینے پر داغ دیا جاتا ہے۔ وہ آخر کیا کریں؟ کب تک نہتے اور بے گناہ انسانوں پر ہونے والے ظلم کو خاموشی سے برداشت کریں؟ اگر مظلوموں کی اکثریت اُن کی ہم مذہب اور ہم مشرب ہے تو اس میں اُن کا قصور کیا ہے؟ قصور وار ڈاکٹر حنیف ترین ہیں یا وہ لوگ جو اس تماشا کی کے ذمہ دار ہیں۔ ڈاکٹر حنیف ترین تو کھلے دل و دماغ کا محب وطن انسان ہے جو انسانیت کی سربلندی اور سرفرازی کے لئے برسرِ پیکار ہے کبھی تو اس کے سینے میں ہیومن ایکٹی وسٹ رشل ورلی کوری کے لئے بے پناہ درد اٹھ رہا ہے کبھی تو وہ اس کا نوحہ لکھ رہا ہے نہ صرف اس کا نوحہ لکھ رہا ہے بلکہ اپنے چاروں طرف ورود بچے ظلم کے ملاوٹے اٹھنے والے آنکھوں کو قتل مسیحائی سے عام کر رہا ہے کہ انسانیت اگر کہیں باقی ہے انسانیت اگر ابھی زندہ ہے تو آگے بڑھے اور ظلم و بربریت کا اصلی چہرہ بے نقاب کرے "ابابیلیں نہیں آئیں" بظاہر ایک سو پچاس صفحات کی شعری دستاویز ہے مگر ان صفحات میں درج نظموں بالخصوص "بالی سچے ہوتے ہیں" لمبی نظم ہے جس میں نہ صرف مصنف بلکہ انسانیت کا دل دھڑک رہا ہے۔ اگر آپ زندہ ہیں اگر آپ سچے ہیں اگر آپ سچ کو زندہ رکھنا چاہتے ہیں تو ڈاکٹر حنیف ترین کی کتاب "ابابیلیں نہیں آئیں" ضرور پڑھئے۔ جو استعارہ پبلی کیشنز 53-A ذاکر باغ اوکھلا نئی دہلی بھارت پر آپ کو پکار رہی ہے۔

نہ قفس نہ آشیانہ

محترمہ شبنم شکیل اردو شاعری کا ایک محترم نام ہیں۔ بہت سے احباب اس امر سے شاید واقف نہ ہوں کہ شبنم شکیل جس قدر خوبصورتی، چابکدستی اور ہنر سے اپنا گرد و پیش اشعار میں بُنتی ہیں اُسی مہارت سے کہانی کی بُنت بھی کرتی ہیں۔ فیصلہ قاری خود کر سکتا ہے کہ ان کا اصلی میدان کون سا ہے۔ ضروری نہیں کہ قاری خود کو اس کھکھیڑ میں مبتلا کرے کہ محترمہ شبنم شکیل عمدہ شعر کہتی ہیں یا اچھے افسانے لکھتی ہیں۔ مقصود زیر نظر کتاب سے حظ اٹھانا ہے اور ایک سو بائیس صفحات پر مشتمل گیارہ افسانوں میں اتنی قدرت اور کمال بدرجہ اتم موجود ہے کہ وہ آپ سے خود کو پڑھوا اور منوا کر داد ضرور حاصل کریں گے۔ دیکھئے شبنم شکیل اپنے افسانوی سفر کے بارے میں کیا فرماتی ہیں۔

"تجربات اور مشاہدات کے حوالے سے میں نے ایک بھرپور زندگی گزاری ہے۔ دل چاہتا ہے کہ ان سب واقعات کو دوسروں سے شیئر کروں مگر ان میں سے کچھ ایسے تھے کہ انہیں بیان کرنے سے ان کی بے توقیری کا اندیشہ تھا اور کچھ ایسے کہ جن کا تقدس متقاضی تھا کہ اسے پامال نہ کیا جائے۔ چنانچہ میں نے بس چند واقعات کا انتخاب کیا اور انہیں افسانے کی شکل دے دی۔ اب ظاہر ہے کہ ایسی صورت میں ان واقعات میں کچھ تبدیلیاں کرنا ناگزیر تھیں اور جائز بھی۔ وہ یوں کہ میں کہانی کہہ رہی تھی عدالت کے کٹہرے میں نہیں کھڑی تھی کہ جہاں مجھے قسم کھانا پڑتی کہ سچ کہوں گی سچ کے سوا کچھ نہیں کہوں گی۔ تو اس مختصر تمہید "عذر گناہ" کے ساتھ یہ مختصر سا افسانوی مجموعہ آپ کے سامنے ہے۔"

مصنفہ کے اس بیان کے بعد ہمارے لئے کچھ بھی کہنا قطعی ناواجب ہوگا سوائے کتاب کی دستیابی اور قیمت کے۔ ایک سو بائیس صفحات کی عمدہ کاغذ اور مضبوط جلد کی اس کتاب کو سنگ میل پبلی کیشنز لاہور نے شائع کیا ہے جس کی قیمت ایک سو اسی روپیہ ہے۔

زندگی خودکشی کا مقدمہ نہیں

جناب علی محمد فرشی جدید اردو نظم کا ایک روشن باب کہلانے کے بجا طور پر مستحق ہیں۔ "علینہ"، "قرینہ"، "کلیہ"، "قاعدہ"، "تجسس"، "تحریک"، "تہذیب" کو انگوٹھی میں نگینے کی طرح اردو نظم میں جس طرح علی محمد فرشی پرو رہے ہیں بہت کم لوگوں کو اس قدر کمال حاصل ہے۔ موت کا جشن کے عنوان سے کہتے ہیں۔ تم نے موت کو ...... باتیں کرتے دیکھا ہے ...... اس کے ہونٹ نہیں دیکھے ...... اور ہونٹوں کے پیچھے ...... کنڈلی مارے بیٹھی ...... لمبی لال زبان نہیں دیکھی ......

راہبہ کے عنوان سے ایک مختصر نظم اور ملاحظہ فرمائیے۔

راہبہ! ...... سچ بتا! واقعی جسم ناپاک ہے؟ ...... پھر مقدس محبت کے اُجلے پردے نے ...... اس میں ہی کیوں گھر بنایا ہے؟ ...... کبوتر ہمیشہ انہی گنبدوں پر اترتے ہیں ...... جن سے خدا تک پہنچنے کا ...... نورانی زینہ ملے ...... جنتی ہجر کا چاک سینہ ملے ...... پھول دل کا کھلا

خیابانِ شعری کے خیال میں علی محمد فرشی البتہ جست ہے لیکن اس کے ہاں حقیقت یک رنگی نہیں اس لئے وہ لفظوں کی کئی معنوی سطحیں دریافت کرنے پر قدرت رکھتا ہے سوچ لیجئے......! خود بھی فرمالیجئے......! کہ اس کے بعد ہمارے اور آپ کے پاس براہِ راست "زندگی خودکشی کا مقدر نہیں" سے رابطے کے سوا کوئی چارہ نہیں ہے۔ چارہ سازی کے لئے 16/17 اکرم پلازہ ریلی مارکیٹ نیچ بازار راولپنڈی سے رابطہ لازمی ہے کہ "زندگی خودکشی کا مقدر نہیں" بڑی سج دھج اور آن بان سے فقط ایک سو بیس روپے کے عوض آپ کی دسترس میں آنے کو بے چین ہے۔

رودِ خیال

ایک تیرے نہ ہونے سے کیا ہوگا خیال آخر
اتنی بڑی دنیا میں کیا خلقِ خدا کم ہے

پروفیسر خیال آفاقی اپنی دُھن میں مگن ایسے تخلیق کار ہیں جو زمانہ سازی سے زیادہ زمانہ شناسی کو اہمیت دیتے ہیں۔ وہ نہ تبلیغ کے قائل ہیں اور نہ وعظ پسند کرتے ہیں۔ باتوں باتوں میں مدعا بیان کرنے اور پڑھنے والے کے ردِعمل کا انتظار کئے بنا آگے بڑھ جاتے ہیں۔ ایسا بھی نہیں کہ اُن کے ہاں اپنا آپ اور اپنا گرد و پیش خوبصورت دیکھنے کی خواہش نہیں پائی جاتی۔

آئینہ دیکھ دیکھ کے خود اپنے حال پر
اتنا ہنسے کہ رونے کا ارماں نہیں رہا

ایک صدائے بیرانہ لگانے کے بعد خیال آفاقی صاحب خاموش رہنے کے بجائے نئی صدا کو جنم دیتے ہیں۔

ہزار چاند نکلتا ہے شہر اور بن میں
دیئے سے روشنی ہوتی ہے گھر کے آنگن میں

پھر بھی کوئی ردِعمل ظاہر نہ ہو تو بے ساختہ پکار اُٹھتے ہیں۔

میری جبیں ہوئی کہ ترا نقشِ پا ہوا
رشتہ کوئی ضرور ہے ان میں چھپا ہوا

غرض معاملہ آپ کے اور خیال آفاقی صاحب کے درمیان ہے جس قدر آپ توجہ فرمائیں گے اسی قدر خیال آفاقی صاحب آپ کو مسحور کرتے جائیں گے۔

چھوڑ بیٹھا تھا میں دنیا ان کو اپنا دیکھ کر
ہنس رہی ہے آج دنیا مجھ کو تنہا دیکھ کر

الغرض "رودِ خیال" دو سو چھپن صفحات کا بھرپور مخزن ہے جس میں غزلیات، نظمیات کا نہایت عمدہ اور بھرپور شعری ورثہ محفوظ ہے جن میں ارضِ وطن، کو ہ دمن، اپنے روز و شب، اپنے غم، اپنی خوشیاں سبھی بہ انداز تخن موجود ہیں اور قیمت صرف تین سو روپیہ ہے جس کے ترسیل کار ویلکم بک پورٹ کراچی ہیں۔

سارے جہاں کا درد

اردو شاعری اور گجری زبان میں اب تک ڈاکٹر صابر آفاقی کے سولہ شعری مجموعے منظرِ عام پر آچکے ہیں اور ایک عالم سے ڈاکٹر صاحب کی قادرالکلامی کی داد حاصل کر چکے ہیں۔ "سارے جہاں کا درد" ایک سو بائیس صفحات کا شعری مجموعہ ہے جس میں ڈاکٹر صابر آفاقی صاحب نے غزلیں، نظمیں، دوہے، گیت، ماہیے، نیٔے، کہہ مکرنی اور قصیدے شامل کئے ہیں۔ عصرِ حاضر کی living legend محترمہ قرۃ العین حیدر کا قصیدہ ایک بار پڑھ کر بار بار پڑھنے کو جی چاہتا ہے۔ "اکیسویں صدی کے نام" نظم بھی ڈاکٹر صابر آفاقی کی آفاقیت کو خوب خوب اُجاگر کر رہی ہے۔ مسرت بھری ڈیجیٹری بھی محمدہ نظمیں ہیں جن میں موضوع کے ساتھ فنی پابندی کی بھی عمدگی سے استعمال کی گئی ہے ایک غزل کے دو اشعار ملاحظہ کیجئے۔

قفسوں میں وہ اثر رکھا ہوا ہے
دلوں کو بے خبر رکھا ہوا ہے

بڑی مشکل سے دل کو بھی زندہ
بامیدِ سحر رکھا ہوا ہے

ایک کہہ مکرنی کا لطف بھی لیجئے۔

عورت کی سب عزت اس سے...... اچھا نام شرافت اسی سے...... لیکن بدلے وقت کے تیور...... اے سکھی عصمت؟...... ناں سکھی زیور......

ایک دوہا بھی آپ کی نظر ہے

اے پرچھو سچا ہے تو جھوٹا کُل سنسار
سچا تو اور سچے سچے سب اوتار

ڈاکٹر صابر آفاقی کا زیرِ نظر شعری مجموعہ "سارے جہاں کا درد" مبلغ تین صد روپیہ کے عوض پوسٹ بکس 9 مظفر آباد آزاد کشمیر پر دستیاب ہے۔

درد کے خیمے کے آس پاس

جناب مفتی تبسم کا شمار ایسے شعراء میں ہوتا ہے جو کم کم کہتے ہیں مگر جم جم کہتے ہیں۔ یعنی اپنے اشعار کے خالق بھی ہوتے ہیں قاری بھی اور ناقد بھی۔ خیالات کی بے ہنگم روکو آنا فاناً شعری قالب میں ڈھالنا اُن کا وطیرہ ہرگز نہیں ہے بلکہ نوآبادیاتی نازکی کی پیرائے میں قید کرنے کو وہ درست گردانتے ہیں۔ غور فرمائیے!

میں اپنے قدموں کی آہٹیں ہو رہا ہوں لوگو
جو ہو سکے تو مری صدا کا عذاب سہہ لو

خیالوں کا جہاں آباد کر لیں
خلوصِ رفتگاں کو یاد کر لیں

پچھتائے بہت سفر گنوا کر
ہم آئے تھے کشتیاں جلا کر

اُن کو دل کی خبر تو ہو گی ہی
آئینے پر نظر تو ہو گی ہی

بظاہر یہ اشعار مختلف غزلوں سے چنے گئے ہیں مگر سب اشعار میں دردکی لے مشترک دکھائی دیتی ہے اس لئے کہ ان اشعار کے خالق نے قلب دروں کو پگھلا کر اشعار کا روپ دیا ہے۔

تمام ساز کرم بے نوا ہوئے آخر
جبیں سے نقش کف پا خفا ہوئے آخر

یہی لے یہی دردو کرب نظموں میں نمایاں ہے۔ نظم مجھے یاد ہے کا ایک بند ملاحظہ فرمائیے۔

مجھے یاد ہے تری گفتگو جو فضا میں تھی
مجھے یاد ہے تری آرزو
تری آرزو کے قریب ہی
مری زندگی تھی کھڑی ہوئی
مرے راستے میں ہر ایک سمت رکاوٹیں تھیں پڑی ہوئی

صفحات دوسو' کاغذ عمدہ' طباعت نفیس' جلد مضبوط اور قیمت صرف دوصد روپیہ دستیابی کے مقامات مکتبہ شعروحکمت' سوماجی گوڑہ حیدرآباد دکن' سب رس کتاب گھر پنجہ گٹہ' حیدرآباد دکن' ماڈرن پبلشنگ ہاؤس' گولا مارکیٹ دریا گنج دہلی۔

بات سے نکلی بات (تبصرہ عزیزی)

تبصرہ نگار ڈاکٹر زیر بحث تخلیق کی چند نگارشات کی تعریف کر کے ایک طرح سے بقیہ تخلیقات کو کم تر گردانتے ہیں مگر ہم جناب محمد سبکتگین صبا کی تازہ تخلیق "بات سے نکلی بات" کے تعارف میں یہ غلطی دہرانا نہیں چاہتے۔ محمد سبکتگین صبا اردو ادب بالخصوص کراچی کے حوالے سے محترم مقام کے حامل کالم نگار ہیں۔ سالہا سال سے روزنامہ "نوائے وقت" میں اُن کا کالم شائع بھی ہوتا ہے اور ذوق شوق سے پڑھا بھی جاتا ہے۔ صبا صاحب لگے بندھے اصولوں ضابطوں کو زیادہ خاطر میں لاتے ہیں نہ گھسے پٹے جملوں اور فرسودہ خیالات کو اپنے ہاں جگہ دیتے ہیں۔ بات کہنے کا اُن کا اپنا ڈھنگ ہے جس میں شرارت بھی ہے شرافت بھی ہے شکایت بھی ہے اور مسائل کی نشاندہی بھی۔ کہنے کو یہ ادبی کالم ہی کہے جاتے ہیں مگر جابجا آپ کو ان میں سیاست' صحافت' معیشت' شوبز اور کھیل وغیرہ کی چاشنی بھی دکھائی دیتی ہے جو پڑھنے والے لوگوں کو لانے کے ساتھ باخبر بھی کرتی ہے۔ "بات سے نکلی بات" میں جناب سبکتگین صبا نے ایک ادبی منتخب کالم کے علاوہ خاکے کے عنوان سے قریبی احباب کی نسبت چند تحریریں بھی شامل اشاعت کی ہیں جن میں مصنف اور زیر بحث شخصیات کے علاوہ اور بھی بہت سے احباب ادب دکھائی دیتے ہیں۔ "بات سے نکلی بات" دو سو بارہ صفحات کا دیدہ زیب اور دیدہ ذہن قلمی نسخہ ہے جس کی قیمت صرف دوصد پچاس روپیہ ہے جو ڈائلاگ پبلی کیشنز M/13 گورین ٹاور بلاک 10 گلشن اقبال کراچی کے زیر اہتمام شائع ہوا ہے۔

غالبیات پر تین یادگار تقریریں

اوّل بھارت دوم دوراُفتادہ شہر پا سوم ہندوستان سے متعلق ایک دانشور نوجوان..... نتیجہ غالبیات پر تین یادگار تقریروں کی ترتیب و تدوین جناب نجے گوڈبولے بظاہر ایک نام ہے ایک شخصیت ہے مگر قدرت نے اُن کی ذات میں علوم و فنون کا خزینہ محفوظ کر دیا ہے۔ اُن کے فکر' اُن کے دل اور اُن کے دماغ میں اس قدر اصول اور اقدار نے محفوظ ہیں کہ بے شمار منظم و فعال ادارے بھی اس کے متحمل نہیں ہو سکتے۔ غالبیات پر تین یادگار تقریریں ہے تو چھتر صفحات کی ایک مختصر کتاب مگر اس میں جناب علی سردار جعفری' جناب کالی داس گپتا رضا اور ڈاکٹر خلیق انجم صاحبان کی تین ایسی تقریروں کو یکجا کیا گیا ہے جس سے غالب سے متعلق بہت سے اہم نکات اور تحقیقی باتیں عام ہوتی ہیں۔ اس کے علاوہ جناب نجے گوڈبولے کی روشن دماغی نے زیر نظر کتاب کی اہمیت کو اجاگر کرنے کے لئے غالب کے چیدہ اشعار کو انگریزی میں ترجمہ کے ساتھ شائع کر کے بہت اہم کام سرانجام دیا ہے۔ تینوں فاضل مقالہ نگاروں جناب علی سردار جعفری' جناب کالی داس گپتا رضا اور ڈاکٹر خلیق انجم صاحبان کے حالات زندگی بھی اضافی خوبی کے طور پر کتاب ہذا میں شامل کئے گئے ہیں۔ بہت سے اہم مواقع کے عکسی نقش بھی کتاب کے حسن کو دوبالا کر رہے ہیں۔ کتاب کی طباعت میں ہر ہر صفحہ مرتب کی ہنرمندی اور مشقت کا ثبوت فراہم کر رہا ہے۔ اس انمول تحفہ کی بظاہر تو کوئی قیمت ہو ہی نہیں سکتی اور یہ امر مرتب کے پیش نظر بھی یقینا ہوگا تبھی تو صرف ساٹھ روپیہ قیمت کتاب پر درج ہے۔ دستیابی کا پتہ اساق پبلی کیشنز' سائرہ منزل 230-B/102' دمان درشن' نجے پارک' لوہ گاؤں روڈ' پونہ 32' مہاراشٹر بھارت۔

بھائی جان عاشق

صاحبزادہ احمد سعید خان المعروف بھائی جان عاشق کا شمار حضرت داغ کے لائق شاگردوں میں ہوا کرتا ہے۔ آپ نواب امیر خان کی اولاد سے ہیں۔ اجمیر میں پیدا ہوئے اور میو کالج اجمیر میں ہی تعلیم پائی۔ کچھ عرصہ دہلی میں قیام کے دوران حالی سے نکات شاعری میں ملکہ حاصل کیا اور بعد میں حضرت داغ کو کلام دکھانے لگے اور حضرت داغ کے رنگ تغزل کو خوب نمایاں کیا آخر میں ظہیر دہلوی سے تلمذ اختیار کیا' ملاحظہ کیجئے۔

کویا کہ کچھ کسی سے لب تک نہیں ہوا ہے

یہ بات ہم سمجھ لیں اس واسطے چاہیے

اس آرزو پہ قول جو تم نے دیا مجھے
کیا اس پہ یہ کہا ہے کہ یہ کیا ہوا مجھے

ہم جانتے تھے ہم سے نہ ملنا چاہے ہے
یہ لب کھلا کہ ظلم یہ خوف خدا ہے ہے

یہ اعلیٰ شعر تھا کہ آپ کے دل میں یقیناً اشتیاق کو مہمیز دے رہا ہوگا کہ کاش اس کے پیچھے بھی جناب سخی کولا بھولے کا ہے جنھوں نے نہایت جانفشانی سے بھائی جان عاشق کا کلام اور حالات زندگی کو دریافت کر کے خوبصورتی کے ساتھ ایک گم گشتہ ادبی باب کو محفوظ کرلیا ہے۔ کتاب کی ضخامت اٹھاسی صفحات پر مشتمل ہے جس کی طباعت میں وہی سلیقہ وہی قرینہ اور وہی لگن شامل ہے جو جناب سخی کولا بھولے کی شخصیت کا امتیاز ہے۔ قیمت صرف اٹھاسی روپیہ ہے اور دستیابی کا پتہ ٹیکسلا پبلی کیشنز 847 بدھوار پیٹھ پونا 411002 مہاراشٹر بھارت ہے۔

مناظر عاشق ہرگانوی

مناظر عاشق ہرگانوی ایک عظیم شخصیت، مناظر عاشق ہرگانوی بحیثیت محقق، مناظر عاشق ہرگانوی بحیثیت نظم نگار، مناظر عاشق ہرگانوی اور ادب اطفال، مناظر عاشق ہرگانوی اور لندن کا سفر، مناظر عاشق ہرگانوی اور ملی کی شخصیت یہ عنوانات ہیں "مناظر عاشق ہرگانوی شش جہاتی فنکار" کی جسے ڈاکٹر نوشاد عالم آزاد نے تحریر کیا ہے۔ صفحات جس کے چھیانوے اور قیمت ایک سو پچیس روپیہ ہے۔

"مناظر عاشق ہرگانوی ایسے ادیبوں میں ہیں جنھوں نے اپنے گہرے مطالعے وسیع تجربے اور مشاہدے کے ساتھ ہی عزم مستحکم اور جہد مسلسل کے ذریعہ دنیائے ادب میں اپنا پرچم بلند کیا ہے" اقتباس ابتدائیہ ڈاکٹر نوشاد عالم آزاد صدر شعبہ اردو مہادیو سنگھ کالج بھاگلپور بہار۔

اردو ادب کے قاری کے لئے ڈاکٹر مناظر عاشق کا نام ہمہ جہتی قلم کاوشیں اور پر اشتیاق عزم و لگن ہمیشہ رہنمائی کا ذریعہ رہے ہیں۔ زیر نظر کتاب اُن کی شخصیت، فن، خوبیوں، خامیوں، جستجو، ہمت، لگن، عزم کی ایسی دستاویز ہے جس میں ایک سچے عاشق اردو کا عکس بڑے سلیقے قرینے سے سجایا گیا ہے جو آج بھی ہمارے لئے اہم ہے اور آنے والے دنوں میں اس کتاب کی اہمیت دوچند ہونے کا قوی امکان ہے۔ دستیابی نئی دنیا پبلی کیشنز بازار دہلی گیٹ دریا گنج نئی دہلی بھارت سے بآسانی ممکن ہے۔

دوہا رنگ

ڈاکٹر مناظر عاشق ہرگانوی اور جناب شاہد جمیل نے "دوہا رنگ" کے عنوان سے دوہے کا پہلا انتخاب شائع کیا ہے جس میں دو سو کے قریب قدیم وجدید دوہا نگاروں کے کلام سے انتخاب اور کچھ کا سوانحی تعارف شامل اشاعت ہے۔ بظاہر دو ہندسوں میں تحریر کیا جانے والا دوہے کا جملہ آسان نظر آتا ہے مگر کتاب ہذا کو دیکھنے پڑھنے کے بعد ہر دو فاضل مصنفین کی محنت اور لگن کی داد دینا پڑتی ہے۔ حضرت امیر خسرو سے لے کر بابا فرید گنج شکر، کبیر داس، تلسی داس، چیپادے، رحیم، راجہ رام نرائن موزوں، بہرائچی، سور داس، لکھنوی، شاہ برہان الدین جانم، عبدالرحیم خانخاناں، کبیر داس، گھاگ، تلسی رام جیسے جید نام قدیم دوہا نگاروں کے عنوان سے آزاد گلاٹی، اندر جیت، گاندھی، توقیر چغتائی، راج کنور، شارق بلیادی، عرفان نجمی، گلشن کمل، نثار ربانی، جیسے معروف نام جدید دوہا نگاروں کے عنوان سے آئے۔ رام لعل، الطاف پرواز، رفیق تیری، شاعر صدیقی، عرش صدیقی، گھنشیام، نور بخش تصویر اور کوائف والے دوہا نگار ہیں جن میں احمد کیس، امام اعظم، ساحر شیوی، ماہر آفاقی، فراق گورکھپوری، مناظر عاشق ہرگانوی، منزل لوہاگھری، عدا جعفری، نوا نگر جیسے بڑے نام تصویر اور کوائف کے ساتھ درج ہیں۔ دوہے کی ابتدا، ارتقاء، ترقی اور مختلف تاریخ و ادوار کے ساتھ دلچسپی کے حامل احباب قلم کے لئے "دوہا رنگ" نہایت اہم اور منفرد دستاویز ہے جس کی ضخامت ایک سو بارہ صفحات، قیمت ایک سو پچیس روپے اور دستیابی نئی دنیا پبلی کیشنز بازار دہلی گیٹ دریا گنج نئی دہلی سے ممکن ہے۔

اُجالا

1976 سے 2003 تک مختلف ادبی تقاریب میں کی گئی محترمہ ناقبہ رحیم الدین کی تقاریر کا مجموعہ ہے۔ بہت سے اہم اور سنجیدہ مواقع پر کی گئی تقاریر کے علاوہ بیشتر تقاریر قلم قبیلہ اور چلڈرن اکادمی کے زیر اہتمام بچوں کی تقاریب کے موقعوں پر کی گئی ہیں۔ بظاہر ان تقاریر میں علم و ادب کا اتنا اہم خزانہ پوشیدہ نہیں ہے جس سے آنے والے دنوں میں اردو ادب کا قاری یا تنقید طالب کسی طرح مستفید ہو سکے البتہ ایک تن تنہا خاتون کا وطن کے بچوں کے لئے اس قدر سرگرمی سے مبتلا رہنا اس امر کی گواہی ضرور دیتا ہے کہ کچھ نہ کرنے سے کچھ نہ کچھ کرنا ہمیشہ مفید نتائج لاتا ہے۔ جو بچے دوراُفتادہ مقام پر رہتے ہیں اور جنھیں اپنی صلاحیتوں کو اُجاگر کرنے کے مواقع میسر نہیں ہیں محترمہ ناقبہ رحیم الدین کی مخلصانہ کاوشوں کے تحت ایسے بہت سے بلکہ لاتعداد بچوں کو اپنی صلاحیتیں آزمانے اور اُن کا صلہ پانے کا موقع میسر رہتا ہے۔ "اُجالا" بارہ سو صفحات سے زائد پر مشتمل ہے جسے ہمارے خیال کے مطابق کم صفحات میں بھی سمویا جا سکتا تھا اور اسی ضخامت کے باعث کتاب ہذا کی قیمت مبلغ سات صد روپیہ انتہائی گراں ہے جسے ایک عام قاری کے لئے خریدنا بہت دشوار ہے پھر بھی "اُجالا" اردو ادب میں ایک تازہ روشنی تازہ ہوا اور تازہ ثمر ادب ہے جس سے آپ مستفید ہونے کی تڑپ اگر دل میں محسوس کرتے ہیں تو ولیمن ٹرسٹ میں 9۔ جائی روڈ راولپنڈی کینٹ سے رابطہ کیجئے جہاں ایک پرکشش پیکٹ بندھا کتاب آپ کی راہ دیکھ رہی ہے۔

رس رابطے

جستجو، ترتیب و تدوین

اعجاز عبید

عزیزم مجاز صاحب۔ دعائیں، شاباش

"چہار سو" معنوی اور صوری دونوں اعتبار سے پسند آیا۔ آپ نے محنت کی ہے اللہ اجر دے۔

رسالہ دیکھ کر حجاب کی تصویر نظر آئی سوچ ہی رہی تھی کہ ایک دن رسالہ لے کر جاؤں گی انہیں دینے کے لئے مگر ایک دم خبر آئی کہ ان کا انتقال ہو گیا۔ بڑی شفقت تھی میرے اوپر ان کی انہوں نے پچھلے لمحوں میں میرا ساتھ دیا یعنی جذباتی سہارا دیا جب کہ اس دیارِ غیر میں کوئی نہ دے سکا تھا۔ آخری ملاقات گذشتہ رمضان میں ہوئی تھی۔ جانے کیوں جنازے پہ کھڑے ہو کر میں پھوٹ پھوٹ کر روئی۔ سوچتی ہوں ہم جب کسی پہ روتے ہیں تو شاید خود پہ روتے ہیں۔ خیر موت زندگی کی بہت بڑی حقیقت ہے۔ میں نے تابوت سے گردن اٹھا کر سوچا خدا حافظ حجاب۔

حجاب کی کتابیں چاروں مل جائیں تو ایک مضمون لکھوں گی۔ تمام رسالہ حسبِ معمول معیاری ہے اس دفعہ نئی کتابوں پہ تبصرہ ہے جو پسند آیا نئی تخلیقات سے تعارف ہو جاتا ہے۔ افسانوں میں خوب خوب اگر وہ پڑھنے والے خوب خوب ہیں تو بڑی مدت بعد ان کا افسانہ پڑھنے کو ملا اچھا افسانہ ہے۔

نظم کا حصہ بہت جاندار ہے خصوصاً شہر طراز کی نظم "محبت تو زمانہ ہے" اچھی لگی اس کو شاعری کہا جا سکتا ہے۔ نثری نظم میری نظر میں شاعری نہیں ہے "نثری نظم" کی ترکیب ہی مجھے غیر منطقی معلوم ہوتی ہے۔

محسن احسان اور قیصر نجفی کے مضامین محنت سے لکھے گئے ہیں۔ تحسین زہرا کا مضمون "محمد حسن عسکری کی تنقید" سے واضح نہ ہو سکا کہ وہ کیا کہنا چاہتی ہیں۔ مضمون زیادہ توجہ کا محتاج ہے انہیں کوشش جاری رکھنی چاہئے۔ میں رسالہ کے لیے آپ کو دوبارہ مبارکباد دینا چاہوں گی۔ مجھے محسوس ہوتا ہے کہ تنقیدی ادب میں ترقی نہیں ہو رہی ہے۔

حمیدہ معین رضوی

محترمی و مکرمی مجاز صاحب۔ سلام مسنون

"چہار سو" کا شمارہ مئی جون ملا۔ ممنون ہوں۔ اسی اشاعت میں گوپی چند نارنگ کے کسی سیکشن کا ذکر ہے مگر مجھے "چہار سو" کا وہ شمارہ نہیں ملا۔

محترمہ حمیدہ معین رضوی صاحبہ "قرطاس اعزاز" کی ہر طرح مستحق ہیں مگر انٹرویو (براہ راست) میں انہوں نے یہ ارشاد فرما کر مجھے حیران کر دیا ہے کہ قاسمی صاحب نے مجھے اعزازی گلڈ کا ممبر بنوایا۔ جب کہ خود میں گلڈ کی ممبر شپ کو زیادہ اہمیت نہیں دیتا تو ایک محترم خاتون کو اس میں کیوں الجھاتا۔ نہ جانے اس ارشاد کا پس منظر کیا ہے۔

مگر مجھے زیادہ دکھ ان کے یہ الفاظ پڑھ کر ہوا کہ "جب اوراق شائع ہوا شروع ہوا تو اوراق میں لکھنا شروع کیا جس کے بعد فنون والوں نے مجھے چھاپنا بند کر دیا۔ ان سب کا اندازہ مجھے دونوں بعد ہوا۔"

آپ جانتے ہیں میں ایسا "کمزور دل" نہیں ہوں کہ کسی کے "اوراق" میں چھپنے کی وجہ سے اس سے قطع تعلق کر لوں۔ بے شمار لوگ فنون کے علاوہ اوراق میں بھی چھپتے رہتے ہیں۔ نہ جانے حمیدہ صاحبہ کس غلط فہمی کا شکار ہو گئیں۔ میرا مقصود صرف اور صرف یہ ہے کہ فنون کے لئے جو چیز بھی مجھے ملتی ہے اس کے معیار کو دیکھتا ہوں اور اگر معیار تسلی بخش ہو تو لکھنے والا کوئی بھی ہو اسے شاملِ اشاعت کر لیتا ہوں۔ ممکن ہو تو خاتونِ محترم پر میرا نکتہ واضح کر دیجئے گا۔

احمد ندیم قاسمی

عزیزِ محترم دعائیں۔

غالباً انتظار حسین کے خاص نمبر کے بعد "چہار سو" کا کوئی شمارہ نہیں ملا۔ ہو سکتا ہے آیا ہو اور گھر کی دو میزوں اردو یونیورسٹی کی ایک میز پر ڈاک کے تین انباروں میں موجود ہو۔ میری علالت نے میرے باقاعدہ کاموں کو بے قاعدہ کر دیا ہے۔ گھر کے لوگ بھی اپنی ذاتی اسٹڈی (یعنی گھر میں جو کمرہ اسی کام کے لئے وقف ہے) میں بیٹھ کے کام نہیں کرنے دیتے۔ خیر جانے دیجئے ان باتوں کو۔ کہنا یہ ہے کہ مذکورہ شمارے میں پروفیسر قیصر نجفی نے عدم صاحب کے بارے میں ایک مضمون لکھا ہے۔ بہت عمدہ ہے۔ عدم صاحب کے حوالے سے انہوں نے اختر شیرانی کے متعلق جو یہ لکھا ہے کہ Salama was an imaginary girl۔ یہ بھی صحیح کہا ہے عاشق حسین بٹالوی نے مجھے بتایا تھا کہ سلمیٰ کے جو خطوط اختر شیرانی کے پاس ہیں وہ خود اختر شیرانی نے اپنے ہاتھ سے لکھے ہیں۔ عاشق حسین اس کا ایک ثبوت بھی مہیا کرتے تھے۔ وہ یہ کہ بقول اختر شیرانی سلمیٰ دسویں جماعت (یعنی دسویں درجے) کی طالبہ ہے اور اس کے خطوط میں قدم بقدم پر فیضی کے اشعار درج ہیں۔ بقول عاشق حسین بٹالوی دسویں درجے کی طالبہ کی ذہنی رسائی فیضی کے کلام تک پہنچ ہی نہیں سکتی تھی۔ اس وقت فیضی مرحوم کی کلیات پنجاب یونیورسٹی لاہور کی لائبریری میں بھی نہیں تھی۔ لاہور میں اس کی صرف ایک جلد تھی اور وہ اختر شیرانی صاحب کے والد محترم پروفیسر محمود شیرانی کی تحویل میں تھی۔ اختر صاحب نے خود ہی سے فیضی مرحوم کے اشعار سے سلمیٰ کے جعلی خطوط کو بھر دیا۔ اس وقت میں اپنی کم عمری اور کم علمی کی بنا

پر اس پوزیشن میں نہیں تھا کہ عاشق حسین صاحب سے اس مسئلے پر سوال و جواب کرتا۔ انہوں نے جو کچھ بتایا میرے حافظے میں محفوظ ہو گیا ہے۔ خیر اس بات کو بھی چھوڑیئے۔ یہ خط تو میں نے یہ کہنے کے لیے لکھنا شروع کیا کہ عدم صاحب مرحوم پر قیصر تجمی کا مضمون مجھے بہت پسند آیا ہے۔ ساتھ ہی مجھے یہ خیال بھی آیا کہ راولپنڈی میں قیام کے زمانے میں والد محترم اور عدم صاحب کے بہت گہرے مراسم تھے۔ عدم صاحب اکثر و بیشتر ہمارے یہاں تشریف لاتے تھے۔ میں بڑی حد تک جو کچھ ہوں' ان دونوں کی باہمی بات چیت کی بدولت ہوں۔

چنانچہ میں نے مضمون لکھا اور چونکہ زف تھا اپنے نقل نویس کو صاف کرنے کے لیے دیا۔ جب اس نے صاف کر کے مجھے دے دیا تو سوچا کر ایک نظر میں پھر دیکھ لوں تا کہ اغلاط سے پاک ہو جائے۔ اسی دوران میں مجھے باہر جانا پڑ گیا واپس آیا تو بہت ڈھونڈا نہ ملا۔ اصل یعنی رف بھی اور نقل یعنی صاف شدہ کاپی بھی۔ کافی مدت اسی پریشانی میں گزر گئی۔ اب کل ایک اور مضمون کی تلاش میں اسی کی دونوں کاپیاں مل گئیں۔ اصل بھی اور صاف شدہ نقل بھی۔ اب صاف شدہ نقل اس خط کے ساتھ منسلک ہے۔ قدرے طویل ہو گیا ہے لیکن کوئی حصہ ایسا نہیں جسے خارج کیا جائے۔ (اگر پسند آئے تو اس کا کریڈٹ قیصر تجمی صاحب کو دیجئے)۔ اس کا آخری حصہ یعنی دو ایک صفحات عدم صاحب کے بارے میں نہیں ہیں لیکن راولپنڈی کا ذکر تو ہے۔ ذکرِ محبوب کسی صورت میں بھی ہو محبوب ہوتا ہے۔

قیصر تجمی صاحب نے میرے ایک مصرعے پر اعتراض کیا ہے اعتراض صحیح ہے لیکن غلطی میری نہیں ہے کمپوزر صاحب کی ہے۔ میں نے "رنج مزدوروں" لکھا تھا (مرکب اضافی) کمپوزر نے اسے "رنج مزدوروں" بنا دیا۔ پہلے ہم کاتبوں کی قابلیت کا رونا روتے تھے۔ اب کمپوزروں کی قابلیت کا رونا روتے ہیں۔

جگن ناتھ آزاد

پیارے گلزار جاوید صاحب' جی ہاں گلزار جی صاحب' جاوید جی صاحب' السلام علیکم

تازہ چہار سُو موصول ہوا اگرچہ بہت مشغول ہو گیا ہوں پھر بھی یاد ہے میں نے آپ کے چہار سُو پر بار ہا اظہار خیال کیا لیکن معلوم نہیں آپ اُسے کہاں غائب کر دیتے ہیں۔ سیاہ قلم کہیں کالا نہ کر گیا اب نیلم پر کہ خط لکھ رہا ہوں۔ مطلب یہ ہے کہ نیلے قلم سے۔ ویسے اگر آپ اسے پری بھی سمجھیں تو مجھے کوئی اعتراض نہیں اس لئے کہ میں حسین لوگوں کے علاوہ کسی سے ہمکلام ہونا گناہ سمجھتا ہوں۔ اچھا ہوا آپ نے حمیدہ معین رضوی پر بھی قرطاسِ اعزاز نکال ڈالا۔ آخر مجھ ایسے لوگ بھی تو اس دنیا میں رہتے ہیں۔

مشکور حسین یاد

پیارے گلزار جاوید۔ خوش رہئے!

مشہور و مقبول افسانہ نگار محترمہ حمیدہ معین رضوی کا قرطاسِ اعزاز نہایت مناسب اور بھرپور ہے۔ ان کا مضمون "قوموں اور نسلوں کا عروج و زوال" اردو زبان کے حوالے سے بہت اہم ہے۔ براہ راست کے ذریعے آپ نے ان کی ذات و نظریات کے بارے میں بہت واضح تصویر پیش کی ہے۔ انور سدید' محسن بھوپالی' نشاط یاور' انیس مغل صاحبان کے مضامین حمیدہ معین رضوی صاحبہ کے فن اور شخصیت پر خوبصورت مواد پیش کرتے ہیں۔ سب کے ساتھ ساتھ آپ کو بہت مبارکباد۔

زیر نظر شمارے میں آپ نے ان بہت سے ہندوستانی اور پاکستانی شعراء حضرات کا وہ کلام شائع کیا ہے جو انہوں نے آپ کی موجودگی میں لدھیانہ (بھارت) میں ساحر کے موقع پر پڑھا تھا۔ یادیں تازہ ہو گئیں۔

جناب تنکشورو کرما کا "سہما ہوا آدمی" اور آپ کا افسانہ "خود ساختہ ناخدا" بہت دلچسپ اور معیاری افسانے ہیں۔ آپ کی تحریر حقیقت پر مبنی جذبوں کی کہانی ہے جو ساحر اور اس کے شہر کے باسیوں اور شہر کی ہواؤں سے گندھی ہوئی ہے اور جسے آپ کے قلم نے ایک خوشبو ایک تڑپ اور ایک احساس عطا کیا ہے۔ ہم آپ کی محبتوں اور جذبوں کی تڑپ کی بیحد قدر کرتے ہیں۔ آپ خوش رہئے' سلامت رہئے' شاد و آباد رہئے اور اپنے وجود کی عظمتوں کو قائم رکھئے۔

ڈاکٹر کیول دھیر

زندہ باد بھائی گلزار جاوید۔

چہار سُو کا شمارہ مئی جون ۲۰۰۲ء موصول ہوا۔ رسالہ نکالنے کا ڈھنگ اور فن آپ کو آتا ہے کاش میں بھی کسی رسالے کا مالک و مدیر ہوتا۔ پھر قرطاسِ اعزاز آپ کے لیے وقف کرتا۔ آپ جس شخصیت کے لیے بھی قرطاسِ اعزاز مخصوص کرتے ہیں اس کی شخصیت اور فنی جہات کے ساتھ قاری کو پوری طرح متعارف کرا دیتے ہیں.... پھر منظومات کے ساتھ افسانے' مقالے' تبصرے' خطوط.... سب ہی کچھ اپنے پڑھنے والے کو دیتے ہیں۔ جزاک اللہ... اور جزاک اللہ اس بات پر بھی کہ انور خواجہ کا خط پڑھوایا گیا اور تصحیح بھی ہو گئی... خواجہ سے میری یاد اللہ ۳۰/۳۵ سال پہلے سے ہے.... وہ اسکی ہی گرم کہانیاں لکھتا ہے۔

تنکشورو کرما کا افسانہ مختصر بھی ہے اور پُر تاثیر بھی.... اور خود ساختہ ناخدا.... زبان کے بے ساختہ پن نے کہانی کو رواں دواں رکھا ہے اور کنارے سے منجدھار اور پھر وہاں سے کنارے تک پہنچا دیا ہے۔ مبارکباد۔ مجھے قیصر تجمی صاحب پر رشک آتا ہے.... خوب لکھتے ہیں۔ ادب کے ہر موضوع پر دسترس ہے۔ مجھے جتندر بلو نے ٹیلیفون کر کے ڈرانے کی کوشش کی تھی کہ وہ اس کتاب پر تبصرہ لکھوں.... کتاب نسیم درانی صاحب کو بھیجی ہے میں تبصرے کے خوف

سے سیپ کے دفتر گیا اور نسیم درانی صاحب کے گھر.... قیصر تمکین صاحب نے تبصرہ لکھ کر اور آپ نے شائع کر کے سارے پاکستانی رسائل کی نمائندگی کر دی۔

سلطان جمیل نسیم

محب مکرم! تسلیم!

چہار سُو کا مئی جون ۲۰۰۲ء کا شمارہ مل گیا ہے اور آپ کا خط بھی۔ یہ شمارہ بھی حسبِ معمول اعلیٰ درجے کے مضامین نظم و نثر سے مزین ہے۔ حمیدہ معین رضوی کا گوشہ بھی خوب ہے۔ "دہشت گرد اور دہشت گردی" بڑا دلچسپ اور خیال افروز افسانہ ہے۔ موصوفہ نے برطانوی سوسائٹی کے خد و خال واضح کرنے میں کافی محنت کی ہے۔ ان کا اندازِ بیان قاری کی پوری توجہ اپنی طرف کھینچ لیتا ہے اور یہ بڑی بات ہے۔ ان کے متعلق مختلف ادیبوں کے جو مضامین ہیں ان سے بھی حمیدہ معین کے فکر و فن پر کافی روشنی پڑتی ہے۔ اپنے مراسلے میں جو زیرِ نظر شمارے کے آخری صفحے پر شائع ہوا ہے، میں نے جگن ناتھ آزاد کے حوالے سے کچھ باتیں کی تھیں۔ افسوس صد افسوس کہ حضرت آزاد بھی ۲۴ جولائی کو اپنے خالقِ حقیقی سے جا ملے۔ وہ اپنے آپ میں نیکی، شرافت اور انسانیت کا ایک جیتا جاگتا مجسمہ تھے۔ اب ایسے نادرِ روزگار لوگ کہاں ملتے ہیں۔ شاید وہ سانچہ ہی ٹوٹ گیا جس میں آزاد جیسے شریف النفس انسان ڈھلا کرتے تھے۔ اقبال اور متعلقاتِ اقبال سے ان کا گہرا شغف ایک مثال بن گیا تھا۔ ادھر ڈاکٹر فہیم اعظمی کا بھی ۲۴ جولائی کو کراچی میں انتقال ہو گیا۔ ان کا رسالہ "صریر" اردو کے تمام ادبی رسائل میں ایک انوکھے طرز کا رسالہ تھا، جس کے ہر شمارے پر ان کی مہر ثبت ہوتی تھی۔ اردو، عربی اور انگریزی پر ان کو پورا عبور حاصل تھا اور ادبی نظریات کے وہ گہرے مزاج شناس تھے۔ خدا ان کی مغفرت فرمائے۔

نامی انصاری (کانپور)

بھائی گلزار جاوید۔ السلام علیکم

یقین کیجئے کہ آپ سے شرفِ ملاقات حاصل کرنا پروگرام میں شامل تھا لیکن ہوا کیا؟ آپ کے شہر سے گزرے، شہر نے کا موقع نہیں ملا.... لاہور بھی کیونکہ بحیثیت گائیڈ مشاعرے کے وفد میں شامل ہر رفیقِ ذہن کی یہ آرزو تھی کہ جتنی جلد ممکن ہو سرحد کے اس پار پہنچ جائیں، جہاں بقول شخصے ہر سو یا ہوتی۔

کرے دریا نہ پُل مسمار میرے
ابھی کچھ لوگ ہیں اُس پار میرے

سوسکھوں کے دلوں کی لگن رنگ لائی.... اسلام آباد سے ہمارا سفر ہوا وہ سر ہو کر لاہور پہنچے۔ جہاں بھارت کی سرحد پر فیتان قلم اور منتظمین تقاریب نے وفد کا اس طور استقبال کیا کہ بس! بیان سے باہر ہے۔

جالندھر کے عالمی مشاعرے سے لے کر دہلی اور یوپی کے بعض اہم شہروں کی سیر و سیاحت کے ساتھ ساتھ ادبی و شعری محافل کی شرکت (اور وہاں سے کراچی واپسی) تک کا آنکھوں دیکھا حال محترم گلزار آفریدی فون پر آپ کی سماعت کی نذر کر چکی ہیں، گزار سے تحقیق!

کراچی کی مصروف زندگی سے آپ آگاہ ہیں۔ رسائل و جرائد اور جمع شدہ ڈاک پر سرسری نگاہ ڈال کر اولین فرصت میں آپ سے مخاطب ہوں۔ خوش قسمتی اتفاق "چہار سُو" کے منظر سے منظر کے نائب رہنے کے منتظر ہیں۔

جنوری فروری کے شمارے کے بعد "چہار سُو" کا مئی جون ۲۰۰۲ء کا شمارہ بھی ابھی ملا ہے۔ ان شماروں کے مضامین نظم و نثر (اور دیگر متن پر) اظہارِ رائے کرنے سے قاصر ہوں کہ اس میں مزید تاخیر واقع ہو گی۔ اس باعث باقی گفتگو آئندہ۔

منظر ایوبی

مکرمی گلزار جاوید صاحب۔ سلام مسنون!

میں نے "قرطاسِ اعزاز" کے مضامین دلچسپی سے پڑھے ہیں۔ حمیدہ معین رضوی افسانہ نگار، مضمون نگار، شاعرہ اور تنقید نگار، ہر اعتبار سے خوب ہیں۔ انور سدید، محسن بھوپالی، ظاہر تونسوی اور الطاف فاطمہ کے مضامین محترمہ کی شخصیت و فن کے بہت سے نئے گوشے وا کرتے ہیں۔ "براہِ راست" میں خود حمیدہ معین رضوی نے بہت اہم باتیں کی ہیں خاص طور سے تعلیم کے متعلق۔ آپ مبارکباد کے مستحق ہیں۔

رفعت سروش (نوئیڈا بھارت)

عزیزی و محبی گلزار جاوید۔ السلام علیکم

گزشتہ شمارے کی محرومی کے بعد تازہ پرچہ موصول ہوا۔ اظہارِ تشکر کے لئے فی زمانہ تحریر کی بجائے تقریر کچھ عجیب سا لگتا ہے کہ آڈیو ویڈیو کا دور ہے، تاہم قلم کی اہمیت ہمیشہ مقدم رہے گی اور خود کتابی مشغلہ ہو جائے، صاحبِ قلم خلوص و محبت کی دستاویز تاابد رقم کرتا رہے گا۔

گوشے کے سوا بھی چہار سُو کے اوراق پر رقم شدہ تخلیقات کچھ کم اہمیت کی حامل نہیں ہوتیں۔ نثر اور نظم دونوں شعبوں میں بڑی اچھی کاوشیں دیکھنے کو ملتی ہیں۔ زیرِ نظر شمارے میں انور خواجہ صاحب کی تحریر "وقت کا پہیہ" خاصے کی چیز ہے۔ واقعہ اور واقعہ نگاری دو الگ چیزیں ہیں لیکن جب یہ دونوں اپنے فن کے اعتبار سے یکجا ہو جائیں تو حاصلِ مطالعہ بن جاتی ہیں۔ موصوف نے اپنی اس کہانی کو اس درجہ پر پہنچا دیا ہے کہ قاری ان کا ہم رکاب بن کر ساتھ ساتھ چلتا ہے اور تھکتا بھی نہیں بلکہ ہر قدم پر سفر کی تھکن لے ایک راحت آمیز احساس سے آشنا کرتی ہے۔ "خود سا ختہ خدا" کی کہانی بھی اپنی زبان، بیان اور موضوع کے اعتبار سے پڑھنے کی چیز ہے، کیونکہ اندر چھپے ہوئے درد اور کسک کو اہلِ دل محسوس کئے بغیر نہیں رہ سکتے۔ اگر میرا مخاطب اس وقت زیرِ نظر مجلّے کا مدیر نہ ہوتا تو مجھے یہ کہنے میں باک نہ تھا کہ کہانی کار گلزار جاوید کی دوررس نظر ہی موضوع کی

تلاش میں کہاں کہاں کا سفر طے کرتی ہیں چنانچہ "خود ساختہ خدا" کے خالق کے لئے بجا طور پر کہا جا سکتا ہے کہ اس کی فکر رسا اور نظر سماج شناس ہے۔ رہا قلم تو کہانی کا لفظ لفظ زبانِ حال سے پکار پکار کر کہہ رہا ہے کہ میں جہاں ہوں خوب ہوں کہ اس سے بہتر میری جگہ اور نہیں ہو سکتی تھی۔

نظم کے شعبے میں بھگوان داس اعجاز نے "آدمی آدمی کو کھانے لگا" کے عنوان سے جو المیہ پیش کیا ہے اسے ایک ایسی "نئی نظم" کہنا چاہئے جس میں سیاسی دہشت گردی اور مذہبی شدت گردی کے انسانیت سوز مناظر اپنے پورے ویژن کے ساتھ نظر آتے ہیں۔ اسلم راہی کی غزل کا یہ شعر۔

دوستی کا یہ سبق میں نے لیا پھولوں سے
ہاتھ کانٹوں پہ بھی رکھا تو ملائم رکھا

نازک خیالی اور احساس لطیف کی ایک خوبصورت مثال ہے۔ غالب صاحب عرفان کے اس شعر میں کربِ آگہی کے ساتھ ضربِ آگہی کی کسک احساس کی شدت لئے ہوئے ہے۔

میں مجرم ہوں خود اپنی آگہی کا
مری ہستی خلاؤں میں چھپی ہے

قیصر نجفی صاحب کا یہ شعر اپنے عقب میں ایک خصوصی سیاسی منظر رکھتا ہے۔

بڑھ گیا کچھ اور زنجیروں کا وزن
جب سے ہم آزاد کہلانے لگے

لیکن کیا ہی اچھا تھا کہ پہلے مصرعے میں وزن کی جگہ بوجھ باندھا ہوتا۔ ذکیہ غزل صاحبہ کا مقطع زبان زدِ خاص و عام ہونے کے لیے پر تولتا نظر آتا ہے۔

وہ دوستی میں غزل حد سے گر گئے لیکن
میں دشمنی میں نبھا کر بھی اپنی حد میں ہوں

خیال آفاقی

محترمی! آداب

چہار سو ملا۔ بے حد شکریہ۔ اس سے قبل شاید دو ایک شمارے دیکھ چکا ہوں لیکن یہ کافی دنوں سے شائع ہو رہا ہے یہ جان کر مسرت ہوئی۔

یہ شمارہ محترمہ حمیدہ معین رضوی سے متعلق ہے یہ بھی اچھی بات ہے محترمہ سے ہماری ملاقات لندن میں ہوئی تھی لیکن اس ملاقات کو بھی کافی عرصہ ہو گیا۔ ان کی تحریریں پڑھتا رہتا ہوں۔ ان کے بہانے سے کئی بزرگوں کی تحریریں بھی سامنے آ گئیں۔ دیارِ غیر میں کسی خاتون کا اس قدر پڑھنا لکھنا غیر معمولی بات ہے۔ میں بھی ان کو مبارکباد پیش کرتا ہوں۔

پروفیسر اے۔ اے۔ فاطمی (شعبہ اردو الہ آباد یونیورسٹی)

محترم گلزار جاوید صاحب! سلام مسنون۔

حمیدہ معین رضوی کو میں نہیں جانتا تھا۔ "چہار سو" کے تازہ شمارے سے ذہن بھر پور طور پر چھا جانا چاہتا ہے۔ آپ کے سوالنامہ کا جواب انہوں نے تفصیل سے دیا ہے۔ ان کا مضمون "قوموں اور نسلوں کا عروج و زوال" بہت سے مباحث کو سامنے لاتا ہے اور غور و فکر کی دعوت دیتا ہے۔ یہ انکشافی مضمون بہت دنوں تک ذہن سے چپکا رہے گا۔ آپ کا افسانہ "خود ساختہ خدا" الگ ذائقہ لئے ہوئے ہے۔ افسانہ پڑھنے کے بعد میں سوچ رہا ہوں کہ اس طرح کا افسانہ اردو میں اس سے قبل لکھا گیا ہے؟ میں اسے یہاں اپنی نگرانی میں کسی رسالے میں جلدی شائع کروں گا... اس بار غزلوں سے زیادہ نظموں کا حصہ معیاری ہے۔ اپنی تین نئی کتابوں پر تبصرہ کے لئے شکریہ۔ علیم سکندر علی نے کم الفاظ میں کتاب کی روح کو سمیٹا ہے۔ ممنون ہوں۔

مناظر عاشق ہرگانوی

برادرم گلزار جاوید صاحب! آداب و نیاز۔

"چہار سو" کی روشن کرنوں نے ہر لمحہ بڑی متانت، سنجیدگی کے ساتھ ذہنی دریچے پر دستک دی ہے۔ یہ دستک کی مدھر آواز جہاں بھی پہنچی وہاں اس آواز کو بجانے والے پہنچ گئے ہیں اور اکثر ان روشن کرنوں سے یقیناً محروم ہوتا گیا ہے۔ آج وہ چار حضرات سے برا بھلا کہہ کر "چہار سو" گھر لے آیا ہوں۔ اس کے تمام تر مضامین میں ست رنگ چھوٹ ہے۔ بالخصوص احمد ندیم قاسمی کی نارنگ صاحب سے ملاقات، اسلوبیات اقبال پر نارنگ صاحب کا وسیع مطالعہ، نارنگ صاحب اسلوبیاتی تنقید پر مفتی تبسم کی گہری نظر تحریریں، جوگندر پال، ستیہ پال آنند اور آپ کی کشش انگیز تحریروں سے گزر کر یقیناً ایک عجیب سی کیفیت ذہن و دل پر طاری ضرور ہوتی ہے.... جس کا اظہار اس مختصر سے خط میں ناممکن ہے۔

علیم صبا نویدی (چنئی بھارت)

بھائی گلزار جاوید صاحب! السلام علیکم۔

"چہار سو" کا شمارہ مئی جون ۲۰۰۲ء موصول ہوا جس کے لئے آپ کا شکر گزار ہوں اس شمارے میں قرطاس اعزاز حمیدہ معین رضوی کے نام ہے ظاہر ہے اس کی ترتیب و تدوین کے بارے میں آپ نے جس محنت اور خلوص کا مظاہرہ کیا ہے وہ اب ایک ایسی روایت کا حصہ بن چکا ہے جس پر کچھ لکھنا بھی وہ تاثر نہیں دے سکتا جو ایسے صفحات کو پڑھ کر حاصل ہو سکتا ہے پھر بھی "قوموں اور نسلوں کا عروج و زوال" جس دکھ اور احساس کے ساتھ حمیدہ صاحبہ نے تحریر کیا ہے وہ ایک تاریخی اہمیت کا حامل مقالہ بن گیا ہے۔ نظموں میں پروفیسر خیال آفاقی کی نظم "بھکاتا" پھر ایک بار خیال صاحب کی آفاقیت کا علم بلند کرتی ہوئی "چہار سو" کے صفحے پر چھائی ہوئی ہے۔ مجھے تعجب ہوا یہ دیکھ کر کہ یہ نظم آپ نے نظموں کے حصے میں آخری صفحوں میں شامل کیا جب کہ خیال آفاقی کی نظم کو ان سے تین نظموں کے آگے رکھا۔ "کون کہتا ہے" اپنے اندر کوئی خاص تخلیقی رویہ

نہیں رکھتی ضیاالحق صاحب ممکن ہے مزاحیہ شاعری میں کوئی خاص مقام رکھتے ہوں مگر سنجیدہ کلام کے لئے انہیں ابھی ایک لمبا سفر طے کرنا باقی ہے بہر حال یہ تو ایک جملہ معترضہ تھا جو درمیان میں آ گیا۔ تحسین زیدی نے محمد حسن عسکری کو چند صفحات میں ہی بڑی خوبی ذہانت اور عرق ریزی کے ساتھ سمیٹا ہے اور اُن کے کام کو حتی الامکان اہمیت کے ساتھ اجاگر کیا ہے جو بہت ہی خوب ہے "خود ساختہ خدا" پر میں کچھ نہیں لکھتا اگر آپ اسے افسانوں کے شعبے میں نہ رکھتے لیکن چونکہ ایسا ہو چکا ہے اس لئے انتہائی ادب و احترام کے ساتھ عرض ہے کہ بھائی افسانہ نگار یا شاعر کوئی سطحی نہیں ہوتا وہ تو اشاروں کنایوں میں بات کرتا ہے اور قاری اُس کی بات کو سمجھ کر ہی کبھی انفرادی طور پر اور کبھی اجتماعی طور پر مطلب ہو جاتا ہے یہ ملا کر اب دونوں ملکوں کے تعلقات میں جو بہتری دکھائی دے رہی ہے وہ پہلے کبھی نظر نہیں آئی مگر ایسا بھی کیا کہ پورا افسانہ ساحر لدھیانوی کی شاعری کی گونج (شاید ساحر لدھیانوی کے جشن کے تناظر میں جو لدھیانہ میں منعقد ہوا) لگے اور آخر میں پنجابی قومیت کا ابلاغ کرتا ہوا اختتام تک پہنچے آپ تو خوبصورت افسانے لکھا کرتے ہیں یہ کیا ہو گیا آپ کو!

غالب عرفان

ڈیئر گلزار جاوید صاحب آداب

تازہ چہار سُو کا سرورق اور مندرجات بہت خوب ہیں۔ حمیدہ معین رضوی کا گوشہ بہت اچھا لگا۔ حیرت ہے ناقدوں نے اُن کو اس قدر نظر انداز کیوں کیا حالانکہ اُن کی شاعری میں نہ صرف اُن کی ذکاوت بلکہ عصری آگاہی بھی عیاں ہے اُن کے افسانے عورتوں کی عظمت اور اُن کا کھویا ہوا مقام دلوانے کی جستجو کر رہے ہیں۔ عام طور پر تانیثی ادب مغرب کی پیروی کر کے فضولیات میں مشغول ہے جب کہ اُن کے افسانوں میں انسانی دُکھ درد کا بیان خاص کر جب وہ عورت کے کردار کو جاتی سنوارتی ہیں۔ بہتر ہوتا کہ خاص گوشہ میں صاحب "قرطاس" کے سوانحی خاکہ کے ساتھ موجودہ پتہ اور ای میل بھی درج کیا کریں۔ منظوم حمد گلستان سے کم نہیں ہے۔ تینوں افسانے بھی عمدہ ہیں۔ افسوس کہ جگن ناتھ آزاد اب ہمارے بیچ نہیں رہے۔ انہوں نے اقبال کی کھوج میں ساری زندگی صرف کر کے ایک روشن مثال قائم کی ہے۔

دیپک بُدکی (گیا بھارت)

جناب گلزار جاوید! خیریت موجود خیریت مطلوب

حمیدہ معین رضوی والا یہ گوشہ یقیناً میرے لئے بھی نہایت معلوماتی رہا۔ آپ کی کھوج کی داد دینا پڑتی ہے کہ اس سے ہمیں بہت سی چیزیں مل جاتی ہیں۔ رسالہ نہایت دیدہ زیب اور ہر لحاظ سے خوبصورت ہے یقیناً آپ پوری توجہ دے رہے ہیں۔ جو آج کل کے زمانے میں شاید ہی ہے آپ جیسے لوگوں کا دم غنیمت ہے اور کیا کہوں۔ کہ اس کے بعد تو یہ کہنے کے لئے بھی نہیں رہے گا۔

دل نواز دل

محترم و مکرم گلزار جاوید صاحب! آداب و خلوص۔

پروفیسر گوپی چند نارنگ صاحب نے آپ کا سلام و پیغام "چہار سُو" مجھ تک پہنچایا مجھے بے حد خوشی ہوئی میں دونوں کا ممنون ہوں۔

آپ بڑی محبت اور محنت سے "چہار سُو" نکال رہے ہیں۔ اس بار حمیدہ معین رضوی پر پرچہ نکال کر آپ نے حق ادا کیا ہے میں نے ان کا مضمون "قوموں اور نسلوں کا عروج و زوال" لفظاً لفظاً پڑھا ہے ان کی اس دلیل میں دم ہے کہ سرکار سے اردو کے نام پر ملنے والی رقم آج بھی مسلمانوں کی جیب گرما رہی ہیں۔ اس سے زبان کا بھلا ہونے والا نہیں ہے۔

حمد و نعت پڑھنے کے بعد غزلیات پر نظر گئی تو کئی دوستوں سے ملاقات ہوئی۔ بیکل اتساہی، ندا فاضلی، محسن بھوپالی، ڈاکٹر پنہاں، ڈاکٹر مناظر عاشق ہرگانوی، سوہن راہی اور پروفیسر جگن ناتھ آزاد (جنہیں اب مرحوم لکھنا پڑ رہا ہے) کے علاوہ اور بھی بہت کچھ پڑھنا باقی ہے اور حمیدہ معین رضوی پر لکھے گئے مضامین بھی پڑھوں گا تو ایک خط اور لکھوں گا۔

بھگوان داس اعجاز

محترم و مکرم گلزار جاوید صاحب! سلام و رحمت۔

حسب سابق "چہار سُو" کا یہ شمارہ بھی قارئین ادب کے لیے نہایت گراں قدر اور قابل مطالعہ نگارشات لے کر آیا ہے محترمہ حمیدہ معین رضوی صاحبہ کے فن کا نہایت جامع مطالعہ شمارے میں پیش کیا گیا ہے محسن احسان صاحب نے سید ضمیر جعفری کا نہایت پیارا خاکہ تحریر کیا ہے یہ ایک پیاری شخصیت کے بارے نہایت مفید اور معلوماتی تحریر ہے آپ نے "براہ راست" کے زیر عنوان حمیدہ معین رضوی کا نہایت معلومات افزا انٹرویو شمارے میں شامل فرمایا۔ سوالات نہایت موزوں اور جواب انگیز ہیں۔

چہار سُو کا سلسلہ "قرطاس اعزاز" اس کا خصوصی امتیاز بھی ہے اور افتخار بھی۔ آئندہ کے مورخین اور محققین کے لیے اس ادبی جریدے کے شمارے یقیناً بنیادی حوالے کا ذریعہ بنیں گے اور یہ کم اہمیت کی حامل بات نہیں ہے۔

پروفیسر ڈاکٹر غفور شاہ قاسم

بہت محترم گلزار جاوید صاحب السلام علیکم

اس دفعہ کا "چہار سُو" پڑھ کر یوں تو کئی نئے داخلی تجربے ہوئے لیکن ان سب سے قطع نظر "چہار سُو" کے سرورق نے خوب چونکایا کیونکہ سرورق پر چھپی تصویروں میں میرے لئے خوشی کے کئی اسباب موجود تھے جن میں سے کم از کم تین کا اندازہ شاید آپ کو بھی ہے۔ حمیدہ معین صاحبہ کا سیدھا اور کھرا انٹرویو پڑھ کر بہت اچھا لگا بلکہ انٹرویو پڑھتے وقت چاروں طرف ہوا میں چڑیاں اچھلتی

ہوئی سی محسوس ہوئیں۔ خیر لگے بندھے ترقی پسند خیالات پڑھ پڑھ کر اب اکتاہٹ ہونے لگی ہے اس لیے ترقی پسندی کی یہ شکل واقعی پسند آئی۔

کہنے کو دنیا میں اس وقت کوئی باقاعدہ تحریک نہیں چل رہی مگر شاید چل بھی رہی ہے یعنی انسان کی تلاش کی تحریک جو مختلف ناموں سے مختلف جگہوں پر زور پکڑتی جا رہی ہے۔ برصغیر میں یہ ایک مختلف عنوان سے زندہ ہے ' خود ساختہ خدا " بھی خیالات کو جھنجھوڑتا ہوا اسی تحریک کا ایک حصہ معلوم ہوا۔ اس پرچے میں پروفیسر خیال آفاقی صاحب کی " کوکا " اور قیصر تمکین صاحب کی " سالگرہ کے پھول " بار بار پڑھنے کو جی چاہتا ہے اس کے علاوہ احمد ظہور صاحب کے بعض اشعار تیر کی طرح جگر کے پار نکلے۔

قلم کے ہاتھ کو روکوں میں خدا کہتا ہوں

توڑ ڈالے گا اسے جو بھی تھا میرے بعد

فیصل عظیم (سان جوز امریکہ)

مخدوم و مکرم مگر ار بھائی صاحب! تسلیم و نیاز۔

پچھلے دنوں دنیائے شعر و ادب کی ایک معتبر و باوقار شخصیت (پروفیسر جگن ناتھ آزاد) ہمارا ساتھ چھوڑ گئی۔ وہ ایک ایسے انسان تھے کہ شعر و ادب کے طالب علم تو وہ تھے ہی مگر بہ حیثیت انسان بھی وہ اپنے اندر بڑی دلآویز خوبیاں رکھتے تھے۔ وہ مسلمانوں کے ساتھ ایک خصوصی رجحان رکھتے تھے اور ہندوستان میں وہ اردو زبان کے فی زمانہ سرپرستوں میں شمار ہوتے تھے۔ پاکستان ان کا دوسرا وطن تھا کہ ان کا خمیر اسی کی مٹی سے اٹھا تھا۔ وہ اپنے پیچھے اپنی شخصیت اور مزاج کے دیرپا نقوش چھوڑ گئے۔ حالیہ شمارے میں ان کی غزل کا مطلع کتنا پُر سوز اور حقیقت سے بھرپور ہے

یوں اک سبق ہر دوا چھوڑ گئے ہم

ہر دل میں اک نقش اپنا چھوڑ گئے ہم

پروفیسر صدیق شاہد

مدیر محترم! سلام مسنون۔

اس مرتبہ "چہار سُو" کے سرورق کے ساتھ جو اندرونی صفحات کو کھولا تو معلوم پڑا کہ محترمہ حمیدہ معین رضوی اس مرتبہ ' قرطاسِ اعزاز " سمیٹے ہوئے ہیں جو بہت اچھا اور خوشگوار لگا۔ اگرچہ ان سے تعارف سرسری سا ہے زیادہ تر ان کی تحریریں "چہار سُو" میں ہی پڑھی ہیں۔ ' کیلا ڈی ' سے لے کر مجموعی طور پر مختلف پہلو تک ان کی نثری و شعری تخلیقات کے ساتھ ان کے ادبی رجحانات ' رویے اور تخلیقی و فکری پہلوؤں سے شناسائی کا موقع ملا.... جس نے معلومات کو فزوں کر دیا۔

' سہما ہوا آدمی ' کے مرکزی کردار جس کی تشکیل نفسی معنوں اور فطری انداز سے کی گئی ہے جس کے لیے مکافاتِ عمل کے امکان کے خدشے سے خود کو آزاد کرنا دشوار ہو جاتا ہے جبکہ .... مقابلتاً رنجنا کا کردار کہانی کے توازن کو برقرار رکھنے نیز شدتِ احساس کو قدرے زیرِ لب دھارے پہ رکھنے میں کامیاب نظر آتا ہے۔ آخر میں ارجن کا نیند میں ڈوبا ہوا.... اتنے برسوں کے تھکے ماندے شعور سے لاشعور تک کی گہری طمانیت اور آسودگی کو فنکارانہ پیرائے میں ظاہر کرتا ہے۔

' خود ساختہ خدا ' کی کہانی جادوگر کے ہوش و حواس پہ چھا جانے والے استعاراتی انداز کے ساتھ .... زندگی کے نشیب و فراز سے گزرتی ہے اس کی پوری فضا مترنم اور گردو پیش گنگناتا ہوا محسوس ہوا جس سے مختلف اصنافِ نثر کے ظہور بھی ممکن ہے اس سے اختلاف برائے اختلاف کیا جائے مگر یہ تو جانی ہو اپنی ہوئی بات ہے کہ نثر پڑھتے پڑھتے بدل گئی خود شاعری اور نہایت مقبول گیت نہ صرف بچے و بچے بلکہ سونے پہ سہاگہ کا کام دے گئے یوں نثر کا حسن .... ہوا۔ اور قاری کا مطالعہ .... سر ہلا! بکھرے وجود کو لانے اور جمع کرنے .... ساحر واسعوں سے نجات کے لیے آپ نے بہت ہی موثر اسلوبِ بیان اپنایا جس میں آفاقی اقدار کی لہریں بھی اسطور موجزن رہیں۔ مختلف شماروں میں پڑھی ہوئی آپ کی اچھی اچھی کہانیاں اب اگلے افسانوی مجموعے کی جانب بڑھ رہی ہیں....!

' وقت کا پہیہ ' کے حوالے سے .... افغانستان کی دستاویزی قلم بامیان اور مقدس مجسموں کا مسمار کیا جانا .... پاکستان میں بدھ تعلیمات کی قدیم یونیورسٹی ٹیکسلا پر قلم بنانے کی خواہش .... چین کے تبت پہ قبضے کے بعد کا مختلف تناظر .... گندھارا اور گرد و نواح کی فلمبندی .... لداخ میں ہمسایہ ممالک کا تنازعہ .... بدھ مت کی ترویج و تشہیر .... اشوک کے منفرد بانک کے لیے طلسماتی روپ بہروپ .... کے منظر و پس منظر میں ہارون شاتی اور نمی کا تخلیقی زاویہ نظر کے اندر اتنی گہری جڑیں دکھاتا ہے کہ .... افسانویت پہ حقائق کا گماں ہونے لگتا ہے.... جو .... ان تمام تہذیبوں و ثقافتوں کا بہت گہرا مطالعہ و مشاہدہ ہے....

شگفتہ نازلی

محترم مگر ار جاوید صاحب! سلام و رحمت۔

حمیدہ معین رضوی کے نام قرطاسِ اعزاز کا اہتمام اچھا لگا ہے۔ بلاشبہ آپ نے ایک ادبی فریضہ نبھایا ہے۔ موصوفہ ایک مختلف الجہات قلمکار ہیں۔ متنوع تخلیقی راستوں پر سرگرم سفر ہیں۔ البتہ کہانی کاری ان کی اصل شناخت ہے۔ کسی بھی علم و فن میں جب سائنسی طرز کی سچائیاں نمایاں ہیں تو اس علم یا فن کی اہمیت و افادیت دوچند ہو جاتی ہے۔ سائنس میں Fantacy کی گنجائش نہیں ہے۔ اس علم کا اساسی سرمایہ وہ حقائق ہیں جو انسانی تجربات و مشاہدات کا ماحصل ہیں۔ ایسے تجربات و مشاہدات میں مزاج و طبیعت کے

میلانات و رجحانات کا دخل نہیں ہے.... حمیدہ معین رضوی کی کہانیاں Fiction Crafting کا ایک ایسا نمونہ بلکہ Phenomena ہیں جس کے بنیادی محرکات یا عناصر ترکیبی ان کے ذاتی تجربات و مشاہدات ہیں۔ گویا ان کی کہانیوں میں سماجی و معاشرتی تلخ و شیریں حقیقتیں سائنسی سچائیوں کی طرح سامنے آتی ہیں اور ان کے فنی وجود میں روحِ عصر کی نشاندہی کرتی ہیں۔ ہمارے خیال میں جس تخلیق کار کا فن عصری تقاضوں اور مطالبوں سے ہم آہنگ نہیں ہے وہ کسی معیار کا مجاز تصور نہیں ہوتا۔ اس بدیہی و ابدی حقیقت کی میزان میں جب ہم حمیدہ معین رضوی کی فنکارانہ صلاحیتوں کو رکھتے ہیں تو وہ عصری شعور کی بدولت ایک معیار و مقام کو نشان زد کرتی ہیں....

"نیا اور راست" حسبِ سابق دلچسپ اور متاثر کن ہے۔ حمیدہ معین رضوی کا مضمون "قوموں اور نسلوں کا عروج و زوال" پُرمغز اور معلومات افزا ہے اور مضمون نگار کے وسیع مطالعہ کی دلالت کرتا ہے۔ اردو کے ماضی، حال اور مستقبل کے حوالے سے ایسی نپی تلی اور کھری باتیں کم کم پڑھنے کو ملتی ہیں۔ سچ تو یہ ہے، حمیدہ معین رضوی کے فن اور شخصیت پر مخلصانہ انداز میں گفتگو کی ہے۔ اس مضمون میں انہوں نے اپنی شگفتہ نگاری کی بھی جھلک دکھائی ہے۔ محسن بھوپالی کا مضمون "دشتِ غربت کی مسافر" حمیدہ معین رضوی کی شاعرانہ خصوصیات کو نمایاں کرتا ہے۔ یہ ایک متوازن اور بے لاگ تبصرہ ہے۔ پروفیسر ڈاکٹر ممتاز احمد خان نے اپنے مضمون "عورت کی مظلومیت کا قصہ" میں حمیدہ معین رضوی کے دو افسانوں کا ایک تجزیاتی مطالعہ پیش کیا ہے۔ انہوں نے کہانی کاری میں ان کے فنی کوائف کا کھوج لگایا ہے اور کرداروں کی Psyche کا تجزیہ کرنے کی کاوش کی ہے۔ الطاف فاطمہ نے "ایک پاکستانی تارکِ وطن" کے عنوان سے حمیدہ معین رضوی کی بیک وقت کہانی کاری اور شاعری کو موضوع بنایا ہے۔ لطف کی بات یہ ہے کہ انہوں نے انہیں کہانی کار اور شاعرہ دونوں حیثیتوں میں تسلیم کیا ہے۔ نشاط ورنے اپنے مضمون "کیمبرج میں ادبی چاندنی" میں حمیدہ معین رضوی کی افسانہ نگاری پر اختصار سے تبصرہ رقم کیا ہے۔ انہوں نے بھی انہیں کامیاب افسانہ نگار و شاعرہ قرار دیا ہے۔ سید محمد عقیل، ڈاکٹر طاہر تونسوی اور امین مغل کے مضامین بھی قابلِ ذکر ہیں۔ البتہ امین مغل نے اپنے مضمون "فیمنزم کے مختلف پہلو" کو مجلا بنا دیا ہے۔ وہ خود ہی سوالات اٹھاتے ہیں اور پھر خود ہی ان کے جوابات دیتے ہیں۔ انہوں نے اپنے مخصوص فکری انداز میں حمیدہ معین رضوی کے بعض افسانوں پر خامہ فرسائی کی ہے۔ ان کے تبصروں میں اختلاف کی گنجائش موجود ہے۔

حمیدہ معین رضوی کا افسانہ "دہشت گرد اور دہشت گرد" مغربی سوسائٹی کے بعض ایسے معاشرتی پہلو سامنے لاتا ہے جن سے تارکینِ وطن (خصوصاً مسلمان) نہ ہم آہنگ ہو سکتے ہیں اور نہ ان سے صرفِ نظر کر سکتے ہیں۔

افسانہ نگار کے ذہن میں یہی گومگو کیفیت ایک سوال بن کر ابھرتی ہے اور بالآخر ان کے تخلیقی کرب کا روپ دھار لیتی ہے۔ ہر چند کہانی میں وحدتِ تاثر مفقود ہے تاہم انجام میں ایک نوع کی افسانویت ضرور پائی جاتی ہے۔ حمیدہ معین رضوی کا فکاہیہ "جتا" فکاہیہ سے زیادہ ایک انشائیہ محسوس ہوتا ہے۔ اس فکاہیے میں انہوں نے قدرتِ زبان کے ساتھ ساتھ علمی وسعت کا بھی مظاہرہ کیا ہے۔

اسلم راہی نے ایک دل آویز نعت کہی ہے۔ انجہانی جگن ناتھ آزاد کی غزل ان کی موت کی پیش گوئی ہے۔ کہتے ہیں اچھے فنکاروں کو وقت سے پہلے اپنی موت کا ادراک ہو جاتا ہے۔ آزاد نے مرنے کے بعد اپنے ہونے کا جواز کچھ اس طرح پیش کیا ہے۔

دنیا ترے قرطاس پہ کیا چھوڑ گئے ہم
اک حسنِ بیاں، حسنِ ادا چھوڑ گئے ہم

سید مشکور حسین یاد، ندا فاضلی، کرامت بخاری، سحر تاب رومانی اور شہاب صفدر کی غزلیں اچھی لگی ہیں۔ ڈاکٹر پنہاں نے لفظ "شمع" کو غلط باندھا ہے۔ شعر پر نظر ثانی کر لیں۔

فطرت کے بیمار کی
شمع بے پروانہ ہے

غالب عرفان نے اپنے مطلع میں "پاؤں" بروزن "فعلن" باندھا ہے، جو غلط ہے۔ درست لفظ "پاؤ" بروزن "فعل" ہے۔ مطلع بحر سے خارج ہے۔

وہ منزل جو پاؤں میں چھپی ہے
مہ و انجم کی چھاؤں میں چھپی ہے

غالب عرفان نے ایک اور شعر میں ایک ترکیب "خلاؤں در خلاؤں" استعمال کی ہے، جو قواعدِ زبان کی رو سے غلط ہے۔ بلکہ زبان کی ایک فاش غلطی کی نشاندہی کرتی ہے۔ درست ترکیب "خلا در خلا" ہے۔ خورشید انور رضوی کی ترکیب لفظی "تنگت و احباب" بھی درست نہیں ہے۔ "سنگت" سنسکرت زبان کا لفظ ہے جب کہ "احباب" عربی کا لفظ ہے۔ سنسکرت اور عربی کے الفاظ کے درمیان حرفِ عطف استعمال نہیں ہوتا۔ علی عرفان عابدی ان معروضات پر غور فرمائیں۔ "نا" بیک وقت ہندی اور فارسی میں استعمال ہوتا ہے۔ اس کے معنی "نہ" اور "نہیں" ہیں۔ یہ لفظ اثبات و نفی کی تاکید کے لئے بھی استعمال ہوتا ہے۔ جیسے کچھ بتا نا! یا! ہمارا اور ہی سے سلام ہے۔ "نا" کو حسنِ کلام میں اضافے کے لئے بھی استعمال کیا جاتا ہے جیسے چلو نا، آؤ نا.... شعر میں "نہیں" کے معنی میں "نا" کا بروزن "فا" یا "فع" استعمال درست نہیں ہے۔ اس کے بجائے یک حرفی لفظ "نہ" استعمال کرنا چاہئے۔ غالب کا یہ شعر ملاحظہ ہو۔

یہ نہ تھی ہماری قسمت کہ وصالِ یار ہوتا
اگر اور جیتے رہتے یہی انتظار ہوتا

عابدی کا مطلع درج بالا معروضات کی روشنی میں محل نظر ہے

مت جگا آنکھ میں سچ ..... آ ..... آیا
بعد تعبیر کے سپنا آیا

مطلع کے دونوں قوافی بھی نظر ثانی کے طالب ہیں۔ درج ذیل اشعار بحر سے خارج ہیں۔

ذہن و دل تھے مگر پھر بھی
بات کہنے کی نہ کہنا آیا

دل کو گھر تو سمجھ لیا اس نے
ساتھ عرفان نہیں رہنا آیا

چند دیگر احباب کے یہ اشعار یقیناً کمپوزنگ کے تیر کا نشانہ بنے ہیں۔

سوہن راہی

سفر تھا اور سفر میں راستے تھے
مری منزل کہاں تھی؟ کیا فاصلے تھے

ناشر نقوی

ہم سے پوچھ کس لئے خالی خزانے ہو گئے
شاہ زادوں نے فقیروں کی گدائی چھوڑ دی
ذہن میں ابھرے تھے یوں ہی بیوفاؤں کے نام
لکھتے لکھتے کیوں قلم نے روشنائی بھیج دی

نا دادی

یہ پیار بھرا لہجہ دلگیر نہ بن جائے
کہہ کہہ کے غزل مجھ پر وہ میر نہ بن جائے
لاتا ہے خیالوں کو احساس کے کاغذ پر
ڈرتی ہوں کہیں تصویر نہ بن جائے

اسلم راہی

بھولنے کی مجھے عادت نہیں اسلم راہی
یاد رکھا ہے جسے میں نے اسے دل میں رکھا

انور خوابیدہ کا افسانہ "وقت کا پہیہ" ایک طویل مختصر کہانی ہے جو صنف نازک کی پر اسرار جنسی نفسیات کی پرتیں کھولتا ہے۔ افسانہ نگار نے شاتی کے کردار میں جس مشرقی عورت سے متعارف کرایا ہے وہ مغرب کے ماحول کی پروردہ ہے مگر اس نے مذہبی لبادہ اوڑھ رکھا ہے۔ در اصل وہ جنس زدگی کی انتہاؤں پر ہے۔ چند مشرقی ہونے کے باوصف جس انداز سے جنسی اشتہا کا اظہار کرتی ہے وہ اس کی ذات سے زیادہ مغربی سوسائٹی کی اخلاق باختگی کی عکاسی کرتا ہے۔ اگر شاتی عورت کے حصار میں رہتے ہوئے اپنا جنسی سفر جاری رکھتی تو ہارون کے لئے قابل قبول بن جاتی..... انور خوابیدہ نے ایک ناز آفرین افسانہ لکھا ہے۔ تنویر کشور کا افسانہ "سہا ہوا آدمی" ایک غرورت سے زیادہ محتاط شخص کی تحلیل نفسی کرتا ہے۔ کہانی دلچسپ ہے مگر انجام میں چونکا دینے والی کیفیت نہیں پائی جاتی۔ گلزار جاوید کا افسانہ "خود ساختہ خدا" احساسات و جذبات کی ان اتھاہ گہرائیوں کا ترجمان ہے جنہیں کسی اسکیل یا پیمانے سے ناپا نہیں جا سکتا۔ انہوں نے جن شخصیات کی محبتوں کو خراج عقیدت پیش کیا ہے ان کے بے پایاں خلق، جاں فزا اخلاص اور بے لوث مروت کے ہم چشم دید گواہ ہیں۔ گلزار جاوید کا افسانہ ایک تفکر نامہ ہے جو فن افسانہ نگاری میں ایک اسلوب نو سے روشناس کرتا ہے۔ یہ افسانہ زبان و بیان خصوصاً خود کلامی کا ایک اعلٰی معیار پیش کرتا ہے۔ افتتاحی جملوں میں مصلحین کا سا طرز نگارش گلزار جاوید کی انسان دوستی کے شوق کے ساتھ ساتھ پاک و ہند تعلقات کو مضبوط سے مضبوط تر بنانے کی نیک خواہشات کا بھی مظہر ہے۔

نامی انصاری کی رباعیات خوب ہیں اور فنی معیار پر پوری اترتی ہیں۔ بلراج کومل کی نظم "مسیحا کی تلاش" سید عارف کی نظم "میں جس بستی میں رہتا ہوں" اور بھگوان داس اعجاز کی نظم "آدمی آدمی کو کھانے لگا" اپنے فکری کینوس کی وسعت کے حوالے سے قابل قدر ہیں۔ خیال آفاقی کی نظم "کھلونا" کی درج ذیل لائن بحر سے خارج ہے اس میں پتنگ کی "گ" گرتی ہے

اور پتنگ کٹ کے بہت دکھی ہو گی

محسن احسان کا مضمون "شہر مزاح کا شاہ خوباں" سید ضمیر جعفری مرحوم کے فن اور شخصیت پر لکھے جانے والے عمدہ مضامین میں سے ایک ہے۔ اس مضمون میں انہوں نے جعفری صاحب کی مزاحیہ شاعری کا بڑی بالغ نظری سے احاطہ کیا ہے اور تنقیدی شعور کا بھرپور مظاہرہ کیا ہے۔ تحسین زہرا کا مضمون "محمد حسن عسکری کی تنقید" عسکری صاحب کے تنقیدی رویوں سے متعارف کراتا ہے۔ مضمون نگار نے غیر جانبداری کا ثبوت دیتے ہوئے ان کے انتقادی رجحانات پر روشنی ڈالی ہے۔ ساغر خیامی نے "پاؤں بھیر" کے عنوان سے ایک خوبصورت مزاحیہ نظم لکھی ہے۔ ان کے بے تکلف زبان نے ہمیں متاثر کیا ہے۔

گزشتہ شمارے میں ہماری غزل کا مقطع غلط کمپوز ہوا ہے۔ درست مقطع یوں ہے۔

بہت کی ہے تری توہین قیصر
ترے پاؤں اب پکڑنا چاہتا ہوں

قیصر نجفی

☆